

# عقیدہ اور عقیدہ

تأليف

حضرت علامہ سید عتیق محمد آذرانی صاحب کرامت  
فیضیادہ دارالعلوم دیوبند صاحب کرامت  
رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ برہان الدین

۱۴- ایڈو پٹارہ لاہور

فون: ۳۳۸۹۷۷ - ۳۳۸۹۷۸

[www.noorehidayat.org](http://www.noorehidayat.org)

# عقیدہ اور عقیدہ

تألیف

حضرت مولانا سید مفتی محمد آریف الدین صاحب مکتبہ عربیہ اسلامیہ  
خلیفہ امجدیہ برکۃ العصر شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا محمد زکریا صاحب مکتبہ  
نور اللہ مرقدہ

[www.noorehidayat.org](http://www.noorehidayat.org)



مکتبہ اسلامیہ

۱۴- اردو بازار ○ لاہور

فون : ۲۲۸۹۴۴ - ۲۲۵۲۰

# فہرست مضامین

| صفحہ | مضمون                                       | صفحہ | مضمون                                        |
|------|---------------------------------------------|------|----------------------------------------------|
| ۲۵   | معجزہ اور جادو میں فرق                      | ۱    | باب اول، شرک کی حقیقت اور انواع              |
| "    | دائرہ اسباب کی اقسام                        | ۲    | مقدمہ                                        |
| ۳۷   | عوام الناس معجزہ و کرامت اور جادو وغیرہ     | ۴    | شرک کی حقیقت                                 |
| ۳۷   | میں فرق کیسے کریں گے                        | ۶    | انبیاء علیہم السلام کی تعلیم                 |
| ۴۰   | اصل حقیقت                                   | "    | شرک کی ابتداء                                |
| "    | مشرکین کے عقائد                             | ۸    | شرک کیا ہے                                   |
| ۴۲   | شرک فی العبادات پر تفصیلی بحث               | "    | اللہ تبارک و تعالیٰ کا علم                   |
| ۴۴   | غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے                    | ۱۰   | عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے                |
| ۴۵   | سجدہ تعظیمی والتیم کے بارے میں علماء کی آرا | "    | غیب کے اقسام                                 |
| ۴۷   | سجدہ تعظیم کی دوسری صورت                    | "    | اللہ تعالیٰ کی صفات کے اجراء میں کسی کو      |
| ۴۸   | دین اسلام کی شرک سے حفاظت                   | ۲۶   | خود مختار ماننا شرک ہے                       |
| ۵۱   | سجدہ بیت اللہ                               | ۲۷   | شرک جلی اور ایک مشبہ کا ازالہ                |
| "    | زیارت قبور                                  | "    | معجزات و کرامات صرف اللہ تعالیٰ کے           |
| ۵۲   | غیر اللہ کے لئے نذر                         | ۲۸   | اختیار میں ہیں                               |
| ۵۳   | غیر اللہ کے نام ذبیح                        | ۲۹   | معجزہ کی حقیقت                               |
| ۵۴   | ناجائز یا مشتبہ رسم                         | ۳۰   | معجزہ کا حکم                                 |
| "    | ایصال ثواب                                  | ۳۱   | یقینی معجزوں کو دائرہ اسباب سے جوڑنے کی مذمت |
| "    | نذر                                         | ۳۲   | معجزہ سے انکار کی وجہ                        |
| ۵۶   | باب دوم: دست بوسی                           | ۳۳   | معجزہ اور کرامت کی حیثیت                     |

# فہرست مضامین

| صفحہ | مضمون                                        | صفحہ | مضمون                                        |
|------|----------------------------------------------|------|----------------------------------------------|
| ۲۵   | معجزہ اور جادو میں فرق                       | ۱    | باب اول، شرک کی حقیقت اور انواع              |
| ۲۷   | دائرہ اسباب کی اقسام                         | ۲    | مقدمہ                                        |
| ۳۷   | عوام الناس معجزہ و کرامت اور جادو وغیرہ      | ۴    | شرک کی حقیقت                                 |
| ۳۷   | میں فرق کیسے کریں گے۔                        | ۷    | انبیاء علیہم السلام کی تعلیم                 |
| ۴۰   | اصل حقیقت                                    | ۸    | شرک کی ابتدا۔                                |
| ۴۰   | مشرکین کے عقائد                              | ۸    | شرک کیا ہے                                   |
| ۴۳   | شرک فی العبادات پر تفصیلی بحث                | ۹    | اللہ تبارک و تعالیٰ کا علم                   |
| ۴۴   | غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے                     | ۱۰   | عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے                |
| ۴۵   | سجدہ تعظیمی والتہیہ کے بارے میں علماء کی آرا | ۱۱   | غیب کے اقسام                                 |
| ۴۷   | سجدہ تعظیم کی دوسری صورت                     | ۱۱   | اللہ تعالیٰ کی صفات کے اجراء میں کسی کو      |
| ۴۸   | دین اسلام کی شرک سے حفاظت                    | ۲۶   | خود مختار ماننا شرک ہے۔                      |
| ۵۱   | سجدہ بیت اللہ                                | ۲۷   | شرک جلی اور ایک مشبہ کا ازالہ                |
| ۵۱   | زیارت قبور                                   | ۲۷   | معجزات و کرامات صرف اللہ تعالیٰ کے           |
| ۵۲   | غیر اللہ کے لئے نذر                          | ۲۸   | اختیار میں ہیں۔                              |
| ۵۳   | غیر اللہ کے نام ذبیح                         | ۲۹   | معجزہ کی حقیقت                               |
| ۵۴   | ناجائز یا مشتبہ رسم                          | ۳۰   | معجزہ کا حکم                                 |
| ۵۴   | ایصال ثواب                                   | ۳۱   | یقینی معجزوں کو دائرہ اسباب سے جوڑنے کی مذمت |
| ۵۴   | نذر                                          | ۳۲   | معجزہ سے انکار کی وجہ                        |
| ۵۶   | باب دوم: دست بوسی                            | ۳۳   | معجزہ اور کرامت کی حیثیت                     |

| صفحہ | مضمون                        | صفحہ | مضمون                                                    |
|------|------------------------------|------|----------------------------------------------------------|
| ۲۲۶  | دو شدید غلطیاں               | ۱۸۵  | شرک کی مذمت                                              |
| ۲۲۸  | گمراہ فرقوں کی ابتداء        | ۱۸۶  | مشرکین کی ایک عام صفت                                    |
| ۲۳۰  | اسلاف کی فضیلت               | ۱۸۸  | شرک کا انجام                                             |
| ۲۳۶  | باب ہشتم: توحید              | ۱۹۰  | حدیث شریف میں شرک کی مذمت                                |
| ۲۳۷  | توحید                        | ۱۹۱  | مشرک کا عقائد کے اثرات                                   |
| ۲۳۹  | فطرتی عقیدہ                  | ۱۹۲  | صحیح راستہ                                               |
| ۲۴۰  | مومن کا حال                  | ۱۹۴  | شرک خفی                                                  |
| ۲۴۱  | صحابہ کی توحید اور جذبہ جہاد | ۱۹۷  | شرک خفی اور ریاکی کی مذمت                                |
|      | توحید کے ثمرات               | ۲۰۳  | باب ہفتم: محبت مطلوبہ                                    |
|      | ÷                            | ۲۰۴  | محبت                                                     |
|      |                              | ۲۰۹  | محبت کے اسباب                                            |
|      |                              | ۲۱۱  | حضور سے اختیاری محبت                                     |
|      |                              | ۲۱۵  | حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہؓ کی محبت           |
|      |                              | ۲۱۵  | حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی اہمیت اور اس کے ثمرات |
|      |                              | ۲۲۲  | صحابہؓ سے محبت                                           |
|      |                              | ۲۲۳  | صحابہؓ کے بارے میں حضور کی تاکید                         |
|      |                              | ۲۲۳  | مقام صحابہ رضی اللہ عنہم                                 |
|      |                              | ۲۲۴  | اللہ، حضور، صحابہ اور اسلاف سے محبت                      |

باب اول

شکر کی حقیقت  
اور  
الواع

# مقدمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى خَاتَمِ الْأَنْبِيَاءِ  
وَعَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ أَصْطَفَى، آمَنَّا بِالْعَدَدِ:-

توحید و شرک اور محبت و تعظیم کے موضوع پر اردو زبان میں پہلے سے  
کتابیں موجود ہیں، جن میں بعض حضرات کی زبان اور قلم جب توحید کے بارے  
میں چلنا شروع ہوتے ہیں تو قرنِ اول سے لے کر آج تک بڑے سے بڑا  
عالمِ محدث، فقیہہ یا صوفی بھی انہیں شرک سے خالی نظر نہیں آتا اور عہدِ رسالت  
سے آج تک کا تقریباً ہر مسلمان مشرک معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح جب  
محبت کو تحریر و تقریر میں لایا جاتا ہے تو فروعی مسائل جیسے توسل وغیرہ کے انکار  
کرنے والوں کو بے ادب اور گستاخ باور کرایا جاتا ہے۔ اگر ہمارے اہل قلم خصوصاً  
علماء کرام جن پر امت کی اصلاح و تربیت کی ذمہ داری ہے اور اہل اسلام  
میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا اور مومنین میں بھائی چارہ کو فروغ دینا ان کا فرائض  
منجسی ہے، پیار و محبت سے اور نرم الفاظ استعمال کر کے وَجَادِ لِقَوْمٍ بِالْحَقِّ  
هَيَّيْ أَحْسَنَ، کو مد نظر رکھ کر ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھنے اور سمجھانے  
کی کوشش کرتے اور خالص علمی مسائل عوام اور کم استعداد لوگوں کے سامنے لانے  
اور ان کو ان باریک مسائل میں الجھانے سے گریز کرتے جیسا کہ ہمارے اسلاف کا  
شیوہ تھا تو بڑی حد تک اصلاح بین الناس میں کامیاب ہوتے۔ اس میں کوئی  
شک نہیں کہ حضراتِ علماء کرام کسی کو کافر بناتے نہیں بتاتے ہیں، تاہم اگر نرم الفاظ  
اور شیریں سخنی سے دوسرے کو اپنا نظریہ پیش کیا جاتے اور ٹھنڈے دل اور فراموشی  
سے اس کی بات پر کان دھرے جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی

کا نظارہ پیش نہ کریں۔ جن جذبات کو غلط طریقہ سے ابھار کر شیطان ہم میں نفرت و کدورت پیدا کرتا ہے انہی جذبات کو اگر صحیح نصب العین کے حاصل کرنے میں صرف کرایا جائے تو وہی سادہ لوح مسلمان رحما۔ بینیم کا منظر پیش کر سکتے ہیں۔

فروعی مسائل میں ائمہ اہل سنت کا اختلاف کوئی دھکی چھپی بات نہیں ہے مگر ان کا آپس میں نہایت بلند درجہ ادب و تعظیم سے پیش آنا بھی اظہر من الشمس ہے حضرت امام شافعیؒ کا حضرت امام اعظمؒ کی شان میں اَلْفَتْحَةُ مَوْعِيَالِ اِنِّیْ خَلِیْقَةُ بَیْسِ الْفَاظِ سے رطب اللسان ہونا کسی فقہ کے کسی ابتدائی طالب علم سے پوشیدہ نہیں اس قسم کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں غرضیکہ باوجود فروعی مسائل میں اختلاف کے ہمارے اسلاف کرام کا ایک دوسرے کا عزت و اکرام کرنا اسلامی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔

اس لئے ایک عرصہ سے یہ آرر و تضحیٰ کر توجید اور محبت کے مضامین کو یکجا کر کے قدرے تفصیل اور وضاحت سے افراط و تفریط سے پاک نقطہ نظر پیش کیا جاتے اور اختلافی مسائل جیسے دست بوسی، قیام اور توسل کے متعلق ایسے انداز سے لکھا جاتے کہ قائلین اور منکرین کے موٹے موٹے دلائل مختصر طور پر قارئین کے سامنے آجائیں تاکہ اوسط طبقہ اور مسئلہ کی نوعیت خود بخود واضح ہو جائے اور فروعی مسائل میں ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی جاتے تاکہ اختلاف برائے اختلاف کو چھوڑ کر کل مؤمن اخوة کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں میں اتحاد و یگانگت پیدا ہو جائے اور خواہ مخواہ کسی مسلمان کی توہین و تحقیر نہ ہو اور نہ ہی کسی مسلمان کو مبتدعین و مشرکین کی صف میں کھرا کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیر کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور مسلمانوں کے لئے اسے مفید فرمائے اور مَا اریدُ اِلَّا الْوَحْدَ مَا اسْتَطَعْتُ کا مصداق بنائے۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْمَکْرَ لَدَرْبِ الْاَمَلِیْنِ وَسَلَّى اللہُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهِ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَاصْحَابِهِ وَآثِبَائِهِمُ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ (آمین)

# شُرک کی حقیقت

انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اللہ تعالیٰ و تبارک کی ہستی ایک ایسی ظاہر و بدیہی حقیقت ہے جس میں کسی شک یا انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ کسی کی فطرت بالکل ہی مسخ نہ ہو گئی ہو تو اس کے لئے اللہ رب العزت کی ذاتِ عالی کا یقین فطرتی طور پر بالکل ایسا ہی واضح اور عیاں ہے جیسے کہ خود اپنی ہستی کا وجود۔ یہاں تک کہ اگر بظاہر انکار کرنے والوں کے اندرون کو بھی ٹٹولا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں خدا کی ہستی کا اقرار پوشیدہ طور پر موجود ہے۔ لیکن اللہ جل شانہ کی وحدانیت کا مسئلہ ایسا ہے جس کے بارے میں بے شمار قومیں گمراہ ہوتی ہیں۔ اسی لئے دنیا میں جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لاتے ہیں، ان سب کی دعوت کا آغاز عقیدہ توحید ہی سے ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک نے شرک کے مٹانے پر اپنی پوری قوت صرف کر دی۔

شرک کی ابتدا۔ کے بارے میں عبد الشکور سالمی اپنی کتاب شرک کی ابتدا المہیۃ میں جو کچھ فرماتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شرک کی ابتدا اور ظہور حضرت اخنوخ علیہ السلام جن کو حضرت ادریس علیہ السلام کے لقب سے تعبیر کیا جاتا ہے، کے وقت سے ہوئی۔ اس سے پہلے مخلوق نے کسی قسم کا شرک نہیں کیا تھا، البتہ بعض افراد انفرادی طور پر معصیت اور نافرمانی میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ جیسے آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہیں کیا تھا۔

حضرت ادریس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر تھے جن کو علوم و ہدایت کے ساتھ بطور معجزہ نجوم اور رمل کا علم بھی دیا گیا تھا۔ ان کے بعد ان کے چند شاگرد اور خاص تلامذہ جن میں وہ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر شامل تھے، ان کی قوم کی رہنمائی کرتے رہے۔ جب حضرت ادریس علیہ السلام کو آسمان پر اٹھایا گیا تو یہ پانچوں حضرات شب و روز عبادت اور لوگوں کی تعلیم و تربیت میں مشغول رہے۔ جب یہ ہستیاں بھی اس عالم سے تشریف لے گئیں تو قوم پریشان ہوئی کہ اب کس سے احکام دین سیکھیں اور رہنمائی حاصل کریں، پھر ان میں سے بعض نے مشورہ کیا کہ ان بزرگوں کے مجسمے بنالیتے جائیں تاکہ ان کو دیکھ کر ان حضرات کی یاد تازہ رہے اور ان کی تعلیمات و ہدایات اور طور طریقے بھولنے نہ پائیں۔ قوم نے ایسا ہی کیا۔ اور مجسمے تیار کر کے ان کے نام بھی وہی تجویز کئے جو ان حضرات کے تھے۔

ابتداء میں یہ لوگ عبادت تو خدا ہی کی کرتے تھے اور ان مجسموں کو صرف یاد تازہ کرنے کے لئے دیکھ لیتے تھے، لیکن ان کی اولاد کے لئے شیطان نے شرک و بت پرستی کے لئے میدان ہموار کر دیا کیونکہ انہوں نے اپنے آباء و اجداد کے عمل کو دیکھا تھا اور جب آباء و اجداد کی نسل گزر چکی تو شیطان ان کی اولاد کے پاس آیا اور ان مجسموں میں داخل ہو گیا، اور انہی بتوں کے ذریعہ سے اس نے یہ اعلان کیا کہ اے لوگو! میں تمہارا اور تمہارے آباء و اجداد کا رب ہوں، اور تمہارا آباء و اجداد میری ہی عبادت کیا کرتے تھے۔ چونکہ اولاد کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ ان کے آباء و اجداد تو ان بتوں کی عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ صرف تعظیم و تکریم کرتے تھے، اس لئے شیطان ان کو گمراہ کرنے میں باسانی کامیاب ہو گیا، غافل و نادان قوم نے ان بتوں کی تعظیم و تکریم کے ساتھ جب ابلیس کی مذاکرات تو یہ بات پوری طرح قلب و دماغ میں راسخ ہو گئی کہ دراصل یہی مورتیاں ان کے معبود ہیں اور ان مجسموں کو پتیل چاندی اور سونے سے تیار کرنے لگے اور شرک و بت پرستی میں

عن ابن عباس عن الصادق الاصفہانی قال کان فی قوم نوح فی العرب بعد اسار بال صالحین من قوم نوح فلما کوا اذ الشیطان الی قومهم ان الصبور الی یاسم الی کانوا یجلسون الصبور الی یاسم ففعلوا فلم یصدقوا اذ اکلوا من الثمرات.

بتلا ہو گئے۔

اور بدستور ان بتوں کی عبادت کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا کہ وہ ان مشرکوں کو خالق حقیقی کی عبادت اور توحید اصلی کی طرف دعوت دیں۔ انھوں نے اپنی قوم کو دین حق کی طرف بلایا لیکن انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ:-

لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا (سورۃ نوح)

(ترجمہ) ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو، اور نہ چھوڑو ود اور سواع کو اور نہ یغوث، یعوق اور نسر کو۔ اور باوجودیکہ نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال تک سمجھاتے رہے، وہ لوگ ان کی اطاعت سے انکار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سخت افسوس و یاس کے عالم میں فرمانے لگے۔

امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حافظ ابن عساکر نے حضرت شیث علیہ السلام کے حالات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی چالیس اولادیں تھیں ہیں لوط کے اور میں لڑکیاں۔ لوط کوں میں سے ایل، قابیل، صالح، عبد الرحمن اور ود زندہ رہے۔ سواع، یغوث، یعوق اور نسر انہی کے بیٹے تھے۔ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۶۶

علامہ سید محمود آلوسی لکھتے ہیں کہ ابن ابی حاتم نے عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہ انھوں آدم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ ان سب میں بڑا اور سب سے نیک "ود" تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی بندگی اور عبادت میں سب سے پہلے ود کو شریک کیا گیا اور ع الماسی ہجری ۱۲۹

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ ایک غیر مرفوع روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بت گردنہ بزرگوں کے مجسمے تھے جن کو اہل عرب نے بعد میں پوجنا شروع کر دیا تھا، ممکن ہے کہ ان میں بعض ایسے بھی ہوں لیکن زیادہ صحیح خیال یہ ہے کہ اصل میں یہ مختلف ستاروں کی خیالی صورتیں تھیں۔ نسر کے متعلق تو بہ تحقیق ثابت ہے کہ وہ ایک آسمانی شکل کا نام ہے اسی پر دوسرے بتوں کو بھی قیاس کرنا چاہیے

رَبِّ لَا تَذَرُ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا

”میرے رب ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ۔“

کیونکہ ان پر یہ بات صاف طور پر کھل چکی تھی کہ نہ صرف وہ لوگ سڑے ہوئے اعضاء کی طرح بالکل تباہ ہو چکے تھے بلکہ ایمان والوں کو بھی گمراہ کر دیں گے اور ان کی آئندہ نسل بھی بدکار اور کافر ہوگی، مسلمانوں کی اولاد کو گمراہ کریں گے،

پس اللہ تعالیٰ نے ان پر قسمت مشرکین کو غرق کر دیا اور کشتی نوح میں زندہ سلامت رہنے والوں میں نوح علیہ السلام کی اولاد سام، نوح اور یافث مع اپنے اہل عیال کے باقی رہے جن سے آدم علیہ السلام کی اولاد کا سلسلہ جاری رہا، اور اس کے علاوہ وہ پانچ بُت یعنی وُد، سواع، یغوث، یحوق اور نسر بھی مٹی میں دب گئے تھے بعد میں شیطان نے انہیں دوبارہ قبیلہ غطفان کے لوگوں کے لئے آشکارا کر دیا۔ انہوں نے بتوں کی تعداد میں اتنا اضافہ کیا کہ وہ تین سو ساٹھ تک پہنچ گئے اور اسی طرح مشرکین بھی مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ بعض کہتے تھے کہ فرشتے (العیاذ باللہ باللہ کی بیٹیاں ہیں اور بعض کا دعویٰ تھا کہ ان کے بت خدا کی بیٹیاں ہیں اور بعض انہیں خدا تعالیٰ کی خدائی میں شریک سمجھتے تھے۔ ان فرقوں میں سے ایک فرقہ ایسا تھا جو دُور فرشتوں اور بتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں مانتے تھے اور نہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہراتے تھے لیکن وہ کہتے تھے کہ یہ بت ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں شفاعت اور سفارش کرتے ہیں اس لئے جب یہ بت ہم سے خوش ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی ہم سے راضی ہو گا۔ اور یہ لوگ اس لئے انہی بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے (التمیذ لابن الشکور السالمی ص ۲۰۶ تا ۲۰۸)

غرض جب لوگوں نے تعظیم و عقیدت میں اعتدال کو چھوڑ کر غلو اور حد سے تجاوز کیا تو یہیں سے شرک و گمراہی کا آغاز ہو جاتا ہے جیسا کہ پہلی امتوں میں ایسا ہی ہوا کہ جن ہتھیروں کے ساتھ ان کی عقیدت تھی انہی کے بت اور مورتیاں انہوں نے ان خیال سے بنائی تھیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں ان کے وسیلے سے اللہ سبحا

و تعالیٰ کے ہاں رسائی ہوگی مگر بڑھتے بڑھتے انہوں نے خود انہی ہستیوں کو معبود بنالیا، انہی کو مدد کے لئے پکارنے لگے، اور انہی کے متعلق یہ سمجھ لیا کہ یہ صاحب تصرف اور خدائی اختیارات کے مالک ہیں۔ ہماری فریاد رسی و مشکل کشائی یہی کریں گے، اس گمراہی سے نکالنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات اپنے بندوں کے ذریعہ بھیج کر طرح طرح سے ان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

**شُرک کیا ہے** | شرک حصہ داری یا شراکت کو کہتے ہیں۔ اور اسلام میں شرک کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی صفات یا اپنے بندوں پر اللہ تعالیٰ کے جو خاص حقوق ہیں، ان میں کسی کو اس کا شریک مٹھایا جاتے اللہ کی ذات میں شرک یہ ہے کہ تخلیق کائنات اور اس کی تدبیر میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو مانا جائے یا کسی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں شریک کر کے اسے اللہ تعالیٰ کا جُز قرار دیا جائے۔ مثلاً محسوس دو خدا مانتے ہیں، ایک یزدان اور دوسرا اہرمین یا جیسے نصاریٰ کا عقیدہ تثلیث ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات میں شرک یہ ہے کہ اس کی مخصوص صفات جیسے خالق ہونا رازق ہونا، فاعل مختار ہونا، علیم، بخیر ہونا اور عالم الغیب ہونا وغیرہ، غرض اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں کسی کو شریک کرنا شرک ہے۔

**اللہ تبارک و تعالیٰ کا علم** | یاد رہے کہ دوسری صفات کمالیہ کی طرح علم بھی اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے جس میں کوئی اس کا سایم و شریک نہیں جس طرح تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے دوسرے صفات کمالیہ سے عاری اور کورے تھے، اسی طرح تمام مخلوق انس و جن اور فرشتے بھی اصل میں بالکل بے علم تھے۔ ان کو جو کچھ بھی علم حاصل ہوا، اللہ تعالیٰ کے دینے سے حاصل ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام کائنات میں ایک انسان سرف ایسا ہے جیسے پیدا ہونے والی قوت ارادی کے ساتھ علم کی استعداد و قوت بھی دوسری مخلوقات سے زیادہ اور پورے کمال کے ساتھ دی گئی ہے۔ چنانچہ وہ ظاہری حواس خمسہ (آنکھ، کان، ناک،

زبان اور چھونا، سے قابل احساس چیزوں کا ادراک کر کے عقل و فکر اور وجدان کے ذریعے مخفی امور معلوم کرتا ہے۔ وہ آنکھ سے صورتوں کا علم، کان سے آوازوں کا علم، زبان سے ذائقوں، ناک سے خوشبو یا بدبو اور ہاتھ پیر تمام بدن کے چھونے سے کسی چیز کی سختی نرمی، گرمی اور ٹھنڈک کا ادراک کر کے اپنے دماغ میں جمع کر لیتا ہے۔ اور عقل و فکر جو دماغ میں رچی ہوئی ہے وہ قلب (یعنی دل جو ان کا حکمران اور تمام علوم کا سرچشمہ ہے) جنبش اور اشارہ سے دماغ میں امور محلولہ کو خاص شعور کے ساتھ اخذ کر کے جمع کر لیتا ہے۔ پھر وہ نہ صرف ان محسوسات کی صورت و معنویت کو جوں کا توں سمجھ لیتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ان بھی ہوئی حقیقتوں میں تصرف کر کے ان کا تفصیلی تجزیہ کرتا ہے۔ اور اس ایک علم سے متعدد علوم کے دروازے اپنے اوپر کھول لیتا ہے۔ کبھی وہ ان جزوی صورتوں کے استقرار و نتیج سے کوئی کلیہ بنا لیتا ہے۔ اور اس سے نئے جزئیات پیدا کرتا ہے۔ اور کبھی وہ کسی جامع علت کی بنا پر ایک چیز پر دوسری چیز کو قیاس کر کے ایک حکم دوسرے جزئیات اور چیزوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح اور کئی جزئیات اور چیزیں پیدا ہو کر اس کے علم میں جدید اضافہ کا باعث بنتی ہیں، اسی طرح وہ کبھی ایک جزئی سے علمی نکات و لطائف پیدا کر کے ایک گہرے علم کو حاصل کرتا ہے۔

غرض انسان اپنے بیرونی و اندرونی حواس اور عقل کے ذریعے وہ علوم حاصل کرتا ہے، جسے دیکھ کر حضرات ملائکہ بھی اس کی علمی استعداد اور تجربہ علمی کے معترف ہو جاتے ہیں۔

لیکن جس طرح انسان میں اللہ تعالیٰ کی ان دی ہوئی قوتوں اور استعداد سے انکار نہیں، اسی طرح اس سے بھی انکار نہیں کہ علم اللہ تعالیٰ کی ایک خاص صفت ہے جس کا پرتو عارضی طور پر انسان پر پڑتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جس مرحلے پر ہر انسان ملے یہاں علم اور علم کی استعداد و قوت میں فرق کرنا مفصود ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو علمی استعداد و قوت تو دیتا ہے لیکن انسان علم سے پیدا انی طور پر گورا ہوتا ہے۔

کے لئے جو دروازے جس قدر کھولنا چاہے، وہ اس پر اس قدر کھول دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ**۔ ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں مگر ہم ہر چیز کو ایک مقرر مقدار سے نازل کرتے ہیں۔

**عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے** | اس لئے مسلمانوں کا یہی عقیدہ ہے کہ عالم الغیب (غیب کا علم جاننے والا) اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بعض وقت انسان کسی چھپی ہوئی چیز کو دریافت کر لیتا ہے لیکن یہ علم غیب نہیں بلکہ ایک مغالطہ ہے جو عام لوگوں کو ہوا کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام لفظ غیب سے مراد لغوی معنی لیتے ہیں یعنی ہر وہ چیز جو ان کے علم و نظر سے غائب ہو۔ خواہ دوسروں کے نزدیک اس کے علم حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہوں۔ وہ اس کو غیب کہنے لگتے ہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں طرح طرح کے شبہات سامنے آتے ہیں۔ اس لئے ضروری یہ ہے کہ اس "غیب" کو سمجھ لیا جائے جسے قرآن مجید کی اصطلاح میں غیب کہا جاتا ہے۔

**غیب کے اقسام** | غیب کے معنی مخفی اور پوشیدہ کے ہیں۔ اور کسی چیز کے مستور ہونے کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں۔

اس کی ایک قسم یہ ہے کہ وہ چیز اس مادی دنیا میں موجود ہو، چاہے زمین پر ہو یا اس کے اندر ہو یا چاند یا دوسرے سیاروں وغیرہ میں۔ تو یہ چیزیں ایسی ہیں جن میں بہت سی چیزیں فرداً فرداً بعض انسانوں کے علم میں ہیں۔ اور بعض کے علم میں نہیں ہیں۔ ایک چیز ہمارے سامنے ہے۔ لیکن دوسرا شخص جو اس سے کچھ فاصلہ پر ہے اس سے غائب۔ ایک چیز کسی جگہ موجود ہے۔ ایک ہی جگہ پر دو شخصوں میں سے ایک اس کو اپنی تیز نگاہوں سے دیکھتا ہے اور دوسرا شخص نظر کی کمزوری کی بنا پر اسے نہیں دیکھ پاتا، یا چند اشخاص ایک ہی جگہ ہیں۔ ان میں سے ایک شخص

اعلیٰ قسم کے دور بین کے ذریعے سینکڑوں میل دور کسی چیز کو دیکھ رہا ہے اور اس چیز کے بارے میں دوسروں کو خبر دے رہا ہے اور دوسرے اشخاص اس چیز کے عینی مشاہدہ سے محروم ہیں۔

اسی طرح ایک شخص خوردبین کے ذریعے ایک قطرہ پانی میں لاکھوں جراثیم اور وائرس کی نقل و حرکت اور ان میں مختلف قسم کے جراثیم کی پہچان اور امتیاز کرتا ہے اور دوسرے عام لوگ اس کی اس خبر کو افسانہ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔

یہی حال زمین کے اندر مخفی اشیاء اور خزانوں کا ہے، چاند اور دوسرے سیاروں میں موجود چیزوں کا ہے، کوئی اللہ تعالیٰ کی ودیعت کی ہوتی تیز حس (خواہ ظاہری حس ہو یا باطنی) کے واسطے سے یا کسی آلے اور تجربہ یا کسی ذریعے سے کچھ چیزیں معلوم یا محسوس کرتا ہے۔ اور کوئی اس سے گورا اور بے خبر ہوتا ہے، اس قسم کی ساری چیزیں ایسی ہیں جن کو غیب نہیں کہا جاتا۔ یہ چیزیں ساری کی ساری موجود ہیں جسے کوئی محسوس اور معلوم کرتا ہے، کوئی نہیں، یعنی بعض کے ادراک میں آتی ہیں اور بعض کے نہیں۔

دوسری قسم پوشیدہ چیزوں کی یہ ہے کہ جن کا ظہور تمام اب تک نہ ہوا ہو، البتہ اس چیز کا مادہ اور اس کے بعض اسباب کا ظہور ہوا ہو یا اس چیز کے دنیا میں آنے کے قرآن موجود ہوں، جن کو عام لوگ نہیں جان سکتے۔ البتہ اہل فن اس کو معلوم کر لیتے ہیں جیسے ماہر فلکیات سورج کی رفتار کا اندازہ لگا کر پہلے سے بتا دیتے ہیں کہ مثلاً فلاں دن پانچ بجے سورج طلوع ہوگا اور چھ بجے غروب، اور فلاں دن پانچ بجے دس منٹ پر طلوع آفتاب ہوگا اور پانچ بجے پینتالیس منٹ پر غروب ہوگا۔ یا کوئی حساب لگا کر کہتا ہے کہ فلاں ماہ فلاں تاریخ کو سورج گرہن یا چاند گرہن ہوگا جیسا کہ جہتزیوں اور اوقات کے نقشوں میں یہ معلومات ہمیں ملتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک محسوس اور معلوم چیز کی رفتار سے اندازہ لگانا ہوتا ہے جیسا کہ ایئر پورٹ والے بھی جہازوں کی آمد اور اسٹیشن والے ریلوں وغیرہ کی آمد کی اطلاع دیتے ہیں۔ ان جیسی تمام اشیاء کا تعلق حساب سے ہوا کرتا ہے، اسی

طرح ماہرین موسمیات بارش وغیرہ کے متعلق پیشین گوئی کرتے ہیں۔ ماہرین طب و  
نفسیات نبض دیکھ کر یا کسی آلے کے ذریعے معائنہ کر کے مرینس کی چھپی ہوئی حالت  
بلکہ اس پر آئندہ آنے والی کسی بیماری کی خبر دیتے ہیں۔ اور بسا اوقات یہ خبریں  
پیشین گوئی کے مطابق واقع بھی ہو جاتی ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین موسمیات  
یا ڈاکٹر وغیرہ کو ایسی خبریں دینے کا موقع اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان واقعات  
اور حالات کا مادہ اور ان کے بعض اسباب ظاہر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ماہرین موسمیات  
مومن سون کا رخ اور اس کی قوت اور رفتار کو دیکھتے ہیں۔ تو وہ ان سے اندازہ کر کے  
کہتے ہیں کہ فلاں فلاں جگہ باد و باراں یا گرج چمک کا امکان ہے اور فلاں فلاں جگہ  
موسم خشک رہے گا۔ اور یہی حال ڈاکٹر اور طبیوں کا ہے۔ وہ کسی شخص میں کسی بیماری  
کے جراثیم دیکھ لیتے ہیں۔ یا کسی بیماری سے دوسری بیماری لگ جانے کا تجربہ ان کو ہوتا  
ہے یا اسی طرح دوسرے ذرائع سے کسی آنے والے مرض کا مادہ معلوم کر کے خبر  
دیتے ہیں۔ مرض محکم موسمیات والے ہوں یا ڈاکٹر ہوں جتنے بھی ماہرین فن ہیں وہ  
کسی چیز کے بارے میں اطلاع تب دے سکتے ہیں جب کہ ان واقعات کا مادہ  
اور اسباب ظاہر ہوں۔ اگرچہ اس چیز کا وجود منظر عام پر نہ آ سکا ہو۔ اور عوام اس  
سے بے خبر رہتے ہوں۔ اور جب وہ مادہ قوی ہو جاتا ہے تو اس کا ظہور عام ہو جاتا  
ہے۔ تو ایسی چیزیں جن کے وجود میں آنے کا مادہ موجود ہو چکا ہو۔ یا کسی چیز کے  
اسباب و آثار اور نشانات اہل فن کے نزدیک ظاہر ہو چکے ہوں تو وہ چیزیں پردہ  
غیب میں نہ رہیں۔ بلکہ ایک گونہ ظہور ان کا ہو چکا ہوتا ہے لیکن ان کی لطافت  
یا کمزوری کی وجہ سے عام مشاہدہ میں ابھی نہیں آتیں۔ اس کے علاوہ ان سب چیزوں  
سے حاصل ہونے والی واقفیت سب کچھ ہونے کے بعد بھی تخمینہ اور اندازہ ہی کی  
حیثیت رکھتی ہے۔ علم جو یقین کا نام ہے۔ وہ ان میں کسی چیز کو حاصل نہیں۔ البتہ  
جو چیزیں حسابات سے متعلق ہیں، ان کا علم اگرچہ علم ہے مگر وہ غیب نہیں۔ کیونکہ  
اس فن سے کسی موجود اور محسوس چیز کا رخ رفتار اور اس کی قوت سے حساب لگا

کر اس کی آمد اور منظر عام پر آنے کا وقت متعین کیا جاتا ہے جیسا کہ چاند گرہن وغیرہ کے اوقات متعین کئے جاتے ہیں۔

مستور چیزوں کی تیسری قسم وہ ہے جن کا تعلق اس مادی عالم سے نہیں بلکہ ان چیزوں کا محل و مقام عالم مثال ہے۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جن کا ادراک ظاہری حواس اور آلات سے نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ چیزیں بھی اس لئے غیب میں داخل نہیں کہ جو چیزیں پردہ غیب سے عالم مثال میں آجاتی ہیں ایسی چیزیں اگرچہ ہماری نظروں سے غائب ہوتی ہیں لیکن وہ چیزیں عالم ملکوت میں ملائکہ کے سامنے ہوتی ہیں اور ہم بھی بعض اوقات کسی آنے والے واقعہ کو نورانی خواب کے ذریعہ عالم مثال میں دیکھ لیتے ہیں اور بعد میں وہ واقعہ جوں کا توں یا صحیح تعبیر کے موافق ظہور میں آجاتا ہے اسی طرح اہل کشف بیداری کی حالت میں روحانی تجلی میں بعض اشیاء کا ادراک کرتے ہیں اور یہ کسی ولی اللہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اشراقی اور اہل ریاضت بھی کبھی بعض

لہ عالم مثال ایک عالم ہے جو عالم ارواح اور عالم اجسام کے درمیان بتایا جاتا ہے بعض علماء اس عالم کو مانتے ہیں، اگر کوئی اس کو تسلیم نہ کرے تو تیسری قسم سے وہ مستور چیزیں مراد ہوں گی جن کا خروج پردہ غیب سے ہو چکا ہو لیکن اس عالم اجسام میں موجود نہ ہوں۔

لہ اشراقیت اور روحانیت عقل پرستی کے خلاف ایک طبعی رد عمل ہے جس کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ عقل اور بین کے دریافت کے لئے حواس عقل، علم قیاس وغیرہ قطعاً مفید نہیں ہیں بلکہ مضر ہیں، صداقت اور حقیقت کے یقینی حصول کے لئے مشاہدہ شرط ہے اور یہ مشاہدہ صرف نور باطن، صفاتی نفس اور ایک ایسے اندرونی ماس کو بیدار کر دینے سے ممکن ہے جو روحانیت اور ماوراء طبیعیات کا اس طرح ادراک کرتا ہے جس طرح یہ ظاہری حواس ظاہری چیزوں کا ادراک کرتا ہے، یہ حواس اس وقت بیدار ہو سکتا ہے جس وقت مادیت کو فنا اور ظاہری حواس کو مردہ کر دیا جائے حقائق کی تحصیل اس حکمت اشراقی اور نور باطن سے ممکن ہے جو ریاضتوں نفس کشی اور مراقبہ لشکر سے پیدا ہوتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ انسان کے پاس ایسی باطنی اور اندرونی ماس ہے جس کو اگر وہ بیدار کر لے اور ترقی دے تو اس اقلیم کے بہت سے عجائبات اور موجودات کا ادراک کر سکتا ہے جن کا ادراک کسی حاسر باقی حاشیہ انگلے صغیر پر

چیزوں سے واقف ہو جاتے ہیں لیکن خواب، مکاشفہ وغیرہ میں قوت و ہمیدہ کی آمیزش اس علم یقین کو ظن میں تبدیل کر دیتا ہے، اس لئے سوائے انبیاء علیہم السلام کے کشف کے جس قدر طریقے ہیں ان میں غلطی کا احتمال علیٰ مراتب باقی رہتا ہے۔ کسی میں اگر غلطی کا احتمال زیادہ ہے تو کسی کے کشف میں غلطی کا احتمال کم ہے لیکن وہ غلطی کے احتمال سے پاک نہیں۔ اس لئے اس جاننے کو علم بمعنی یقین نہیں کہہ سکتے، البتہ انبیاء علیہم السلام کو جو کشف ہوا کرتا ہے اس کے آگے پیچھے ملائکہ کا پہرہ ہوا کرتا ہے جس کی وجہ سے شیاطین قوت و ہمیدہ و خیالیہ اور عادات طباہ و غیرہ اس پر کچھ دست اندازی نہیں کر سکتے اور وہ ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہو کر انبیاء علیہم السلام کو دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے ان کے مکاشفات اور خوابیں بھی وحی کی اقسام میں سے ہوتے ہیں، جب کہ اولیاء کرام کے مکاشفات اور المامات میں محافظت نہیں ہوتی، اس لئے ان کو قرآن و سنت پر پرکھا جاتا ہے۔ ان کے مکاشفات و المامات ظنی اور غیر یقینی ہونے کی وجہ سے لوگوں پر حجت قاطعہ نہیں ہوتے اور نہ ان پر دوسرے مسلمانوں کو پابند کیا جاتا ہے۔

غیب کی چوتھی قسم آئندہ آنے والے ایسے واقعات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اب تک اس دنیا میں پیدا کیا ہے اور نہ ان اشیاء کے آثار و نشانات کو اس مادی عالم (بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ظاہری سے ممکن نہیں۔

یہ بالکل صحیح ہے بلکہ ممکن ہے کہ ایسے اور دوسرے حواس بھی ہیں لیکن بہر حال یہ بھی حواس ہی ہیں جو اس طرح کمزور اور محدود ہیں جس طرح دوسرے حواس ظاہرہ اور اسی طرح خطا پذیر اور متاثر ہو کر والے جس طرح انسان کی دوسری طاقتیں ورنہ اس کے نتائج میں تعارض اور تناقض نہ ہوتا، اس میں شک و احتمال نہ پیدا ہوتا، اور بڑے بڑے ہم مسائل میں خطا اور غلط دوی ممکن نہ ہوتی، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس ماسر کے محسوسات اور اس علم کی تحقیقات میں اس سے کہیں زیادہ تعارض و اختلاف ہے جتنا کہ حواس ظاہری کے محسوسات میں واقع ہوتا ہے اور اہل کشف و اشراق کے علوم و تحقیقات میں اتنا تناقض اور تعارض ہے جس کی نظیر شاید عقلیت میں مل سکے۔

میں بھیجا ہے اور نہ ان کا وجود عالم مثال میں ہوا ہے۔ یہ ایسے تکوینی واقعات اور ایسے غیبی تکوینیات ہیں جن پر غیب کے معنی صادق آتے ہیں اور تکوینیات میں سے یہ ایسے غیبی امور ہیں جن کا سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو علم نہیں البتہ ایسے آئندہ رونما ہونے والے واقعات کا جزوی علم ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندے نبی مرسل کو بذریعہ وحی بتا دیتے ہیں جیسا کہ قیامت کا آنا، حساب و کتاب کا ہونا، دوزخ و جنت کے حالات اور دنیا میں آنے والے واقعات کی پیشین گوئیاں، لیکن ایسی صورت میں جب کہ اللہ تعالیٰ ان آنے والی چیزوں کی اطلاع اپنے کسی خاص بندے کو کر دیتے ہیں تو وہ چیزیں غیب نہیں رہتیں بلکہ وہ غیب کی خبریں ہو جاتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو پہنچا دیتے ہیں۔

یہاں تک تو مستور چیزیں بیان ہوئیں جن کا تعلق تکوینیات سے تھا جس کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ ان امور میں سے صرف جزئیات اور بعض واقعات و حالات کا علم اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کسی ذریعے سے ضرورت کے مطابق بتا دیتے ہیں۔ لیکن ان امور غیبیہ کی کلیات اور ان کے تمام علم تک کسی مخلوق کی رسائی ناممکن ہے خواہ ملک ہو یا نبی مرسل۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مجلہ ہے۔ **وَعِنْدَ لَا مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنَ رِزْقِهِ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبِئَةٌ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ** (انعام آیت ۵۹) یعنی اس کے پاس غیب کی چابیاں ہیں (یعنی وہی غیب کے ذخیروں کا مالک ہے)، انہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا جو کچھ خشکی

لے تکوینی امور وہ تمام حالات اور واقعات ہیں جن کا تعلق قیامت سے یا کائنات میں آنے والے واقعات سے ہے مثلاً یہ کہ کون کب پیدا ہوگا، کہاں پیدا ہوگا، کیا کیا کام کرے گا، کتنی عمر ہوگی، عمر میں کیسے حالات سے گزرے گا وغیرہ۔

کہ جیسے امام مہدی کا آنا، دجال کا آنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ دنیا میں تشریف لانا، دجال کی ہلاکت ان کے مانتوں سے ہونا، سورج کا مغرب سے نکلنا وغیرہ۔

میں اور جو سمندروں میں ہے سب سے وہ واقف ہے، درختوں سے کوئی پتا نہیں گزرتا مگر وہ (اللہ تعالیٰ) اسے جانتا ہے، زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ نہیں اور کوئی خشک و تر چیز نہیں مگر یہ کہ (سب کچھ) ایک کھلی اور واضح کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ إِنَّا تَبِعُوا إِلَّا مَا يُلْحِظُنَا إِلَىٰ قُلْ هَلْ لَيْسَتْوَىٰ الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ (الانعام آیت ۵۰) یعنی (اے پیغمبر آپ ان لوگوں سے) کہہ دو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں نہ یہ کہتا ہوں کہ غیب کا علم رکھتا ہوں نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو فقط اسی بات پر چلتا ہوں جو مجھ پر (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) وحی کی جاتی ہے (اور اس کی طرف تمہیں بھی بلاتا ہوں) پھر ان سے پوچھو کیا اندھا جس کو حقیقت کا کوئی علم و یقین نہیں اور آنکھوں والا (جو حقیقت کی روشنی دیکھ رہا ہے) دونوں برابر جو کہتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے۔

غیب کی پانچویں قسم وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا اور اس کی پسند ناپسند کا علم حاصل ہوتا ہے۔ احکامات کا علم جس میں عقائد، اعمال، معاملات، معاشرت اور اخلاقی غرض پوری زندگی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، میں اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور غیر مرضیات سے واقفیت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ یہ وہ علم ہے جسے کوئی مخلوق انسان وغیرہ خواہ کتنا ہی ذہین و فہیم ہو اس کی ریاضت اور روحانیت کا پایہ کتنا بلند ہو، اس کا باطن کتنا روشن ہو اسے ٹھیکس جان سکتا نہ اپنے حواس سے ذوق شعور سے نہ فراست سے نہ قیاس سے نہ عقل سے نہ نور باطن سے نہ آلات سے البتہ خداوند عالم جو عالم الغیب ہے وہ خود اسے اپنے برگزیدہ بندوں انبیاء و رسل کو عطا فرماتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آتا ہے۔ قُلْ إِنْ أَدْرِيْ أَقْرَبُكُمْ مَّا لَوْعَدُوا مِنْ أَمْرٍ يُجْعَلُ لَهُ زَكَاةٌ أَمْ دَاغِلُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ لَيَسْلُكُ

مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا (الحج ۲۵، ۲۶، ۲۷) یعنی (اے پیغمبر آپ  
 ان سے) کہہ دیجئے کہ میں نہیں جانتا کہ جس (عذاب) کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ  
 نزدیک ہے یا میرا رب اس کے لئے لمبی مدت مقرر فرماتا ہے وہی عالم الغیب  
 ہے وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا مگر جس رسول کو اس کام کے لئے پسند  
 فرمائے، تو اس کے آگے اور پیچھے محافظ بھیج دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب  
 مشرکین مکہ اور کفار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت اور عذاب کے معین وقت  
 بتلانے پر اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ آپ ان  
 سے یہ کہہ دیں کہ قیامت کا آنا و ماں جزا و سزا کا ہونا تو یقینی ہے لیکن قیامت اور  
 عذاب کے وقوع کی متعین تاریخ اور مدت کون سی ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم  
 ہے، اس لئے میں نہیں جانتا کہ وہ روز قیامت اور عذاب قریب آچکا ہے یا میرا رب  
 اس کے لئے کوئی دور کی مدت مقرر کرے گا اور اس پر یہ دلیل پیش کی کہ قیامت اور  
 عذاب کے معین وقت سے میری بے خبری اس لئے ہے کہ میں عالم الغیب نہیں،  
 بلکہ عالم الغیب ہونا صرف اللہ رب العالمین کی خصوصی صفت ہے اور وہ علم غیب کلی  
 جس سے عالم کائنات کا کوئی ذرہ پوشیدہ نہ ہو جو کہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص  
 ہے، کسی کو ایسے غیب پر قبضہ اور قدرت نہیں، جس سے سارے کلیات جزئیات  
 اور غیبی امور اس کے معلوم ہو جائیں البتہ جس کو اللہ تعالیٰ منصب رسالت و نبوت  
 کے لئے پسند فرماتے ہیں تو اسے بقدر ضرورت امور غیبیہ کی معلومات فراہم کرتے  
 ہیں اور ان معلومات غیبی اور خبروں کو محفوظ ترین طریقے سے اپنے بندے کو پہنچا  
 دینے کے لئے ان کے نزول کے وقت فرشتوں کا پہرہ اور چوکیاں رکھی جاتی ہیں تاکہ  
 وحی الہی ہر طرح کی آمیزش سے محفوظ رہے اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کے علم  
 میں شک و شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی، یہاں استثناء (الامن الرقعی) میں غیب  
 کلی اور تمام امور غیبیہ مراد نہیں بلکہ وہ امور غیبیہ اور احکامات شرعیہ مراد ہیں جن  
 کا تعلق منصب رسالت اور نبوت سے ہے جیسا کہ اس سے پہلے آیت کریمہ سے یہ



الْاِبْعَاثُ (البقرہ آیت ۲۵۵) یعنی جو کچھ مخلوقات کے سامنے ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ اس کے پیچھے ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے۔ مخلوقات (میں سے کوئی بھی) اس کے علم سے کسی چیز پر بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر یہ کہ جس قدر علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے اس قدر اس کی علم ان کو ہو سکتا ہے۔

اسی طرح جب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا تو کفار و مشرکین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت پر طرح طرح کے اعتراضات کرنے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ کیا رسول ایسا ہوتا ہے جو انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے غرض وہ ہر اس چیز کو دیکھ کر اعتراض کرتے تھے جو لوازمات بشریت اور انسانی زندگی کے لئے از بس ضروری ہے، ان کفار و مشرکین کا خیال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا رسول وہی شخص ہو سکتا ہے جو لوازمات بشریت سے مستغنی اور مافوق البشری قوتوں کا مالک ہو، کائنات کا ایک ایک ذرہ اس پر روشن ہو، ماضی اور مستقبل کی کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہ ہو۔ اس لئے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طرح طرح کی فرمائشیں بھی کرتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ ہم تب مانیں گے اگر آپ ان خشک پہاڑوں کو ہموار اور سرسبز زمین میں تبدیل کر دیں اس میں ایسے چشمے اُبھنے لگیں جس میں سے ندیاں اُڑ نہریں جاری ہوں وغیرہ وغیرہ۔ نیز وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قسم قسم کے غبی امور بتلانے پر بھی اصرار کرتے تھے تو ان سارے بے ہودہ سوالات اور بے جا فرمائشوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ إِنَّا نَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيْنَا وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ (الاحقاف آیت ۹) یعنی آپ ان سے کہہ دیجئے میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں اور میں (اپنے عقل و فہم سے) نہیں جان سکتا کہ میرے ساتھ کیا ہونا ہے اور تمہارے ساتھ کیا ہوگا، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں صرف ایک صاف صاف ڈرانے و خبردار کرنے والا ہوں۔ اس آیت کرمیہ کا

مطلب یہ ہے کہ آپ ان کفار و مشرکین سے کہہ دیں کہ میری رسالت و نبوت دنیا کی تاریخ میں پہلا واقعہ نہیں کہ تمہیں خدا کے رسول پہچاننے میں پریشانی ہو بلکہ مجھ سے قبل بہت سے انبیاء و مرسل دنیا میں آچکے ہیں جن میں بعض کو تو تم بھی مانتے ہو اور تم کو ان سے عقیدت بھی ہے، آخر وہ بھی تو انسان و بشر تھے، کھاتے پیتے تھے، آخر ان میں سے کون سا رسول ایسا گزرا ہے جس نے اپنے اختیار سے کوئی معجزہ دکھایا ہو یا اُس نے باخود اپنے ذاتی علم سے سب کچھ جانا ہو۔ اگر ایسا نہیں اور نہ ہو سکتا ہے تو پھر میری رسالت و نبوت کو پرکھنے کے لئے ایسی نرالی اور لوکھی کسوٹی تم کہاں سے لاتے ہو۔ پھر اس کے بعد مَا أَذْرِنِي مَا يَفْعَلُ بِي وَلَا يَكُونُ۔ الایہ سے رسالت اور نبوت کی حیثیت بتلائی کہ میں اپنی عقل و شعور اور قیاس سے نہ یہ جانتا ہوں کہ آخرت میں میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا کیا جاتے گا اور نہ میں یہ جان سکتا ہوں کہ اس دنیا میں میرا اور مجھ پر ایمان لانے والوں کا اور میری اس دعوت کا انجام کیا ہوگا اور تمہارے ان مظالم اور زیادتیوں کی تمہیں کب اور کیسی سزا ملے گی، غرض دنیا و آخرت کے امور غیبیہ سے متعلق وحی الہی کے بغیر مجھے کوئی علم (جسے یقین کہا جاتا ہے) نہیں خواہ وہ میری ذات سے متعلق ہو یا دوسرے لوگوں (مومنین اور کفار و مشرکین) سے متعلق، خواہ وہ معاملہ دنیا کا ہو یا آخرت کا، تفصیلی ہو یا اجمالی اس کی مجھے کچھ خبر نہیں، اور یہ امور آخرت (برزخ جنت و دوزخ، حساب و کتاب، مشرکین و کفار کے لئے سزا اور مومنین کے لئے جزا) سے متعلق یا دنیا میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں جو کچھ بیان کرتا ہوں یہ میری عقل، فہم و ذہانت کا اثر نہیں بلکہ امور غیبیہ کے متعلق جو کچھ میں کہتا ہوں اس کا ذریعہ وحی الہی ہے جو میری طرف بھیجی جاتی ہے۔ اور میں اس کی ابتلا

---

لے یعنی میں نے یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ میں خود بخود سب کچھ جانتا ہوں اور ذیہ دعویٰ کیا ہے کہ خدائی اختیارات میرے ہاتھ میں ہیں، تو جب میں نے اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا ہے تو آپ کے سوالات اور فرمائشیں بے جا اور بے وزن ہیں کیونکہ عالم الغیب اور تمام اختیارات کا مالک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اس کی طرف سے جو کچھ مجھے وحی کی جاتی ہے میں اس کی پیروی اور تعمیل کرتا ہوں۔

اور پیروی کرتا ہوں۔

بلاشبک و شبہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بزرگوار و جلیل و بے تبار و بے  
جو پور نبی کائنات میں نہ کسی نبی، مہرسل کو عطا فرمایا ہے اور نہ کسی مقرب فرشتے کو، آپ  
صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ رسالت و نبوت کو ختم فرمایا اور آپ پر رسالت و نبوت کے  
کمال اور آپ کی شایان شان علوم کی انتہا کی۔

حضرت علامہ آلوسی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اسی آیت کریمہ کے تحت لکھتے ہیں کہ:-  
والذی اختارہ ان الہ معنی علی نفی الدر ایتہ من غیر جہۃ الوحی  
سواء کانت الدر ایتہ تفصیلیۃ و اجمالیۃ و سواد کان ذالک فی الامور  
الدنیویۃ و الاخریۃ و اعتقد انہ صلی اللہ علیہ وسلم لو یشقل من الدنیا  
حتی اوتی من العلم باللہ تعالیٰ وصفاتہ و مشقونہ و العلم باشیاء بعد العلم  
کما لا مال یؤتہ احد غیرہ من العالمین و لا اعتقد فوات کمال بعدہ  
العلم بحوادث دینیۃ جزئیۃ کعدم العلم بما یصنع زید مثلاً فی بیتہ  
و ما یجری علیہ فی یومہ او غدا، و لا اری حسناً قول القائل انہ علیہ الصلوۃ  
و السلام یعلم الغیب، و استحسن ان یقال بطلانہ، انہ صلی اللہ علیہ وسلم  
اطلع اللہ تعالیٰ علی الغیب و علمہ سبحانہ ایا لا و نحو ذالک، و فی الآیۃ رد  
علی من ینسب لبعض الاولیاء علم کل شیء من الکلیات و الجزئیات  
و قد سمعت خطیباً علی منبر المسجد الجامع المنسوب للشیخ عبدالقادر  
الکیلی فی قدس سرہ کا یوم الجمعة، قال باعلی صوت یا بازا! انت اعلم فی  
من نفسی، و قال لی بعض انی لا اعتقد ان الشیخ قدس سرہ یعلم کل شیء  
منی حتی منابت شعری، و مثل ذالک ہما لا ینبغی ان ینسب الی رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکیف ینسب الی من سواہ؟ فلیتق العبد مولاہ

روح المعانی ص ۲۶۸ - ۲۶۹ - ادارة الطباعة المنيرية

یعنی میرے نزدیک پسندیدہ قول یہ ہے کہ یہاں ایسی درایت اور جان لینے کی

نفی ہے جو بغیر کسی وحی کے خود بخود ہو، خواہ تفصیلی ہو یا اجمالی، خواہ وہ دنیا کے واقعات سے متعلق ہو یا اس کا تعلق آخرت کے حالات سے ہو اس کے بعد علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تک دنیا سے انتقال نہیں فرمایا جب تک اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے شئون کا علم نہ دے دیا گیا ہو اور ان اہم اشیاء یعنی دنیا و آخرت میں آئندہ پیش آنے والے اہم واقعات کا علم بھی، جن کا علم کمال سمجھا جاتا ہے، جو پوری کائنات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی دوسرے کو عطا نہیں کیا گیا اور نیز یہ اعتقاد نہیں کہ جزوی واقعات اور حادثات جیسے مثلاً زید اپنے گھر میں کیا کام کرتا ہے اور اس پر آج اور کل کیسے گزرے گی، علم نہ ہونے کی وجہ سے کمال نبوت میں فرق آتا ہے کیونکہ اسی طرح غیبیہ امور کا علم نہ کوئی کمال ہے اور نہ اس کے نہ ہونے سے کمال نبوت میں فرق آتا ہے، (وہ فرماتے ہیں کہ) میں کسی شخص کے اس قول کو اچھا نہیں سمجھتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے تھے اور تقاضائے ادب کی وجہ سے بلا ضرورت ایسا کہنا بھی مناسب نہیں کہ آپ غیب نہیں جانتے تھے، بلکہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی چیزوں پر مطلع کیا تھا یا اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیبی امور بتلاتے تھے یا اسی طرح کسی دوسرے الفاظ میں کہیں (جس میں بد تو بے ادبی کی شان پاتی جاتے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ اختیارات کا مالک ٹھہرا کر ان کے اس فرمانِ عالی کی مخالفت کی جائے کہ لا تظرونی کما ظرت النصارى عیسیٰ بن مریم اقولوا عبد اللہ ورسولہ) دُخبر دار مجھے حد سے نہ بڑھاؤ جس طرح عیسائیوں نے (حضرت عیسیٰ کو) بشریت سے خارج کر کے خدا کہہ کر، حد سے بڑھایا تھا (مُن لو) مجھے تم اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہنا پھر اس کے بعد علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ، اس آیت میں ان لوگوں کے نظریہ کی تردید ہے جو بعض اولیاء کی طرف تمام کلیات و جزئیات کے علم کو منسوب کرتے ہیں میں نے جامع مسجد جسے شیخ عبد القادر گیلانی قدس سرہ کی مسجد سے موسوم کیا

جاتا ہے۔ جمعہ کے دن اسی مسجد کے منبر پر بیٹھے ہوتے خطیب سے سنا، وہ بلند آواز سے پکار کر کہہ رہے تھے۔ اے ہزارِ آپ (شیخ عبدالقادر گیلانی) میری جان پر مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں اور بعض نے مجھ سے کہا کہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ شیخ (عبدالقادر گیلانی) قدس سرہ میرے جسم کی ہر ہر چیز پر علم رکھتے ہیں حتیٰ کہ میرے بال کی جڑوں سے بھی ان کو واقفیت ہے (تو علامہ اوسنی فرماتے ہیں کہ اس طرح کا علم تو ایسا ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی منسوب نہیں کرنا چاہیے چہ جائیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی دوسرے کو، تو ایسے کہنے والے ہندے کو دہاتے کہ اس طرح کہنے میں، اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔

حاصل یہ کہ تمام غیبی امور کا علم اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں دیا ہے اور وہی عالم الغیب ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض جاہل عوام جب یہ سنتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں تو وہ ان کے ساتھ یہ بھی سمجھنے لگتے ہیں کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی غیب کی چیز کی خبر بھی نہیں ہوگی یہ تو نبوت اور رسالت کی نفی و انکار ہے حالانکہ غیبی خبر اور غیب میں فرق واضح ہے، اگر کوئی آپ کے کان میں کوئی راز کی بات کہہ دے تو کیا اس سے آپ عالم الغیب بن گئے بلکہ یہ تو چھپی ہوئی خبر ہے جو آپ کو بتلائی گئی۔ اسی طرح کسی بھی نبی مرسل کو اللہ تعالیٰ کا لاکھوں غیب کی چیزوں کا بذریعہ وحی بتلادینا ان کو عالم الغیب نہیں بنا دیتا۔

مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ جن چیزوں کا علم لوگوں کو بعض اسباب اور ذرائع سے عادتاً حاصل ہو جاتا ہے غیب نہیں۔ اسی طرح کسی رسول و نبی کو بذریعہ وحی یا کسی ولی کو بذریعہ کشف و الہام جو غیب کی کچھ چیزوں کا علم دے دیا گیا وہ علم غیب کی حدود سے نکل جاتا ہے اسی طرح جو شخص اسباب و ذرائع، آلات و تجربات و مشاہدات اور دلائل سے کوئی علم حاصل کرتا ہے، اس شخص کو عالم الغیب نہیں کہتے جیسے ریاضی کے قواعد سے کوئی حساب و مقدار معلوم کر لے یا طب، حکمت، انبیات، منطق، فلسفہ، سائنسی ایجادات، ریڈیو، وائرلیس وغیرہ کے ذریعے کوئی چیز معلوم کرے

تو وہ غیب کا جاننے والا نہیں، اسی طرح کشف والہام یا وحی کے ذریعے کسی کو بعض چیزوں کا علم ہو جاتے تو اس علم کو قرآن مجید میں انباء الغیب (یعنی غیب کی خبریں) کہتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهَا إِلَيْكَ** یعنی یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جن کو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ عالم الغیب تو وہی ہوتا ہے جس کا علم ہر واسطہ، وسیلہ، سبب، آلات اور دلیل وغیرہ سے بے نیاز ہو اور وہ علم صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ پوری کائنات میں ہر مادہ کے رحم میں جو چل ہو ہر ایک کو بیک وقت جانتا ہے کر نیک ہو گا یا بد، خوب ہو گا یا بد، صورت، نیک، بخت ہو گا یا بد بخت، علم اس کی کتنی ہوگی، غرض مستقبل میں اس پر جو حالات اور عوارضات وارد ہونے والے ہوتے ہیں وہ تفصیل کے ساتھ ان سب کو جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جو ان تمام اشیاء کے احوال اور حقائق کا جاننے والا ہے جو کائنات میں کبھی یا اب ہیں یا مستقبل میں ہوں گے۔ غرض اللہ تعالیٰ کو تمام کائنات کا ازل سے ابد تک بلا واسطہ ہر چیز کا مکمل علم ہے، جملہ کائنات میں جتنے ذرات ہیں ان تمام کی کل تعداد اور وزن سے اس کو واقفیت ہے، ساری دنیا کے سمندروں، دریاؤں وغیرہ میں جتنے قطرے ہیں ان کا شمار اس کے علم میں ہے، ہر بارش کے قطروں اور تمام دنیا کے درختوں کے پتوں کی تعداد اور ان میں ہر ایک لکیروں میں سے کوئی لکیر اس سے کسی وقت مخفی نہیں رہ سکتی۔ ہر درخت کا ہر پتہ گرنے سے پہلے اور گرنے کے بعد اور ہر درخت پر لگا ہوا پتہ کتنی مرتبہ اُلٹ پلٹ ہو گا اکب اور کہاں گرے گا اسی طرح ہمیشہ ہمیشہ ہر چیز کو اس کے پیدا ہونے سے پہلے اس کے حین حیات میں اور اس کے مرنے کے بعد اپنے علم تفصیل سے جانتا ہے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کا علم اور دیکھنا ایسا نہیں کہ ایک آن میں ایک یا چند کا معائنہ کر لے یا دیکھ لے اور دوسرے وقت میں دوسری اشیاء پر نظر اور توجہ دے جس طرح انسانوں اور دوسری مخلوقات کا حال ہے بلکہ ازل سے ابد تک کی تمام چیزیں ساری کی ساری اس کے سامنے ایسی دائمی مستحضر ہیں کہ کسی وقت بھی کوئی ذرہ یا کسی مخلوق کا خیال وغیرہ اس سے چھپ نہیں سکتا۔

اس کا علم اور مشاہدہ ہر آن کائنات کے ایک ایک ذرے کو محیط ہے اور کوئی ذرہ اس سے کسی وقت بھی پوشیدہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ہر شے کی صفات و خواص، کیفیات و وزن، مقدار، تعداد، شمار بلا واسطہ جانتا ہے۔ وہ ان چیزوں کے جاننے میں کسی واسطے اور آلے کا محتاج نہیں، اور اس کا یہ علم اپنا ذاتی ہے۔ کسی نے اس کو سکھایا نہیں، نیز اللہ کا علم لامحدود اور بے نہایت ہے۔ تمام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے جو علم دیا ہے وہ مقدار اور محدود ہے، اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ عالم تھے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے وہ علوم عطا فرمائے جو کسی مقدس نبی، مقرب فرشتے بلکہ تمام مخلوقات میں سے کسی کو عطا نہیں کئے گئے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، اس کے حقوق اور قانون کا علم، ماضی، مستقبل کے لاکھوں واقعات، برزخ و قبر کے حالات، جنت، دوزخ اور آخرت کا علم غرض وہ تمام علوم جو آپ کی شایان شان تھے عطا کئے گئے لیکن پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم، تمام انبیاء علیہم السلام فرشتے، جن وانس اور تمام اولین، آخرین کو جتنا علم عطا کیا گیا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے علم محیط سے کوئی نسبت نہیں۔ صحیح بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک چڑیا کو دریا کے کنارے پانی پیتے ہوئے دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: ما علمی و علمک من علم اللہ الا مثل ما نقص لهذا العضو من هذا البخر (کتاب التفسیر بخاری باب الکفۃ ۲۶ ص ۶۸) اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں میرے اور آپ کے علم کی مثال اس قطرے کی ہے جو اس چڑیا نے اس دریا سے کم کیا ہے۔

یہ مثال محض سمجھانے کے لئے ہے ورنہ مخلوق کے محدود علم کو اللہ تعالیٰ کے لامحدود علم کے ساتھ کوئی نسبت ہو ہی نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی صفت علم پر اس کے دوسرے صفات کمالیہ کو بھی قیاس کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کمالیہ اس کی ذاتی اور لامحدود ہیں، مخلوق میں جو بھی کوئی خوبی و صفت نظر آتی ہے وہ محدود اور صرف اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اس کی صفات میں سے کسی صفت کا منظر ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کے اجراء میں جس طرح اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات میں کسی کو کسی درجہ میں شریک کرنا شرک ہے اسی طرح یہ بھی شرک ہے کہ اللہ

تعالیٰ کی صفات کے اجراء اور نفاذ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو صاحب اختیار مانا جائے یعنی اگرچہ یہ مانا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا ہے اور وہی قادر مطلق متصرف مطلق اور تمام صفات کمالیہ میں یگانہ ہے۔ لیکن اگر مخلوق جیسے ملائکہ یا ارواح یا کسی انسان یا جن کے بارے میں یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مستقل طور پر کچھ انتظامی امور سپرد کر دیئے ہیں جیسے بارش برسانا یا فوق الفطرت طریقہ سے نفع و ضرر پہنچانا یا دعائیں قبول کرنا وغیرہ۔ اور یہ ان چیزوں کے نفاذ میں اس طرح خود مختار ہیں جس طرح دنیا کے بادشاہ اپنے ماتحت حکام اور افسران کو کچھ انتظامی اختیارات دے دیتے ہیں اور اس کے بعد وہ حکام ان اختیارات کے اجراء اور استعمال میں خود مختار ہوتے ہیں اور پھر بادشاہ سے پوچھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور نہ اسے خبر ہوتی ہے اس لئے لوگ ماتحت حکام کو خوش کرنے کے لئے ان کو ہدایا دیتے ہیں اور ان کی چالپوسی کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے اختیارات اس کے بارے میں نافذ کریں۔ اس طرح کسی بھی مخلوق کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ اللہ کی صفت کے اجراء و نفاذ میں خود مختار ہیں تو یہ بھی شرک ہے۔

لے مسلمانوں کا یہ عقیدہ جو اصول شرعیہ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے انتظامات مثلاً بارش برسانا، مارنا وغیرہ ملائکہ کے سپرد کئے ہیں یہ شرک ہرگز نہیں کیونکہ مسلمان اللہ رب العزت کے سوا کسی اور کے لئے کسی باب میں بھی ذرہ برابر مستقل اختیار ثابت نہیں کرتے ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور حکم کے بغیر کوئی مخلوق کچھ نہیں کر سکتی حتیٰ کہ پتا بھی اگر کسی گمراہ کو اس کے علم سے اور اس کے حکم کے مطابق گمراہ ہے۔ اور یہاں ملائکہ وغیرہ کی حیثیت صرف غلامانہ ہے جیسے کوئی شخص اپنے مختلف غلاموں میں کام بانٹ دے کہ جب میں کسی کے لئے پانی دینے کا حکم کروں اس حکم کی تعمیل فلاں غلام کو کرنا ہوگی اور جب کھانے کے بارے میں آواز دوں تو فلاں غلام اس کام کو سرانجام دے۔

اور حقوق میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں پر جو خاص حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں سے کوئی حق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے لئے مانا جاتے۔ مثلاً کسی مخلوق کی محبت اور تعظیم کو اللہ تعالیٰ و تبارک کے برابر سمجھنا یا اس کی اطاعت میں کسی اور کو شریک کرنا جیسے کسی کے لئے ایسا مستقل اختیار ثابت کرنا کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دے سکتا ہے اس کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ صفحات میں آتے گی، اسی طرح کسی کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شریک کرنا جیسے سجدہ، رکوع، نذر و نیاز اور قربانی وغیرہ یا کسی مخلوق کو عالم اسباب کی چیزوں سے بالاتر اور اللہ تعالیٰ کا ہم پلہ سمجھ کر اس سے خشکلات اور مصائب میں مدد مانگنا (یہ سب شرک کی مختلف صورتیں ہیں)۔

**شرک جلی اور ایک شبہ کا ازالہ** | مذکورہ بالا بحث سے یہ الجھن بھی دور ہو جاتی ہے کہ ہم دنیا میں بہت سی چیزوں سے فائدے اٹھاتے ہیں، مثلاً پانی سے پیاس بجھاتے ہیں اور روٹی سے بھوک دفع ہوتے دیکھتے ہیں۔ آگ سے گرمی اور دواؤں سے صحت کا حاصل ہونا نظر آتا ہے۔ علاج کے لئے حکماء اور ڈاکٹروں سے اور کام کاج میں نوکروں یا کاریگروں سے مدد لیتے ہیں۔ اسی طرح غریب و محتاج لوگ امراء اور حکام سے مدد طلب کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کچھ شرک کیوں نہیں؟

(بہتر مثال یہ صفحہ گزشتہ، غرض تعمیل حکم کے لئے مختلف امور پر مختلف غلاموں کو لگا دیتے ہیں تاکہ اگر انسانی نہ ہو اور نظام باقاعدہ چلے۔ تو جب یہ شخص آواز دیتا ہے کہ فلاں کو اتنی مقدار پانی پہنچا دیا جائے تو پانی والا خادم اٹھ کر فوراً تعمیل کرتا ہے۔ اس طرح جب اللہ تعالیٰ کسی ملک کے بارے میں جتنی مقدار بارش کا حکم فرماتے ہیں تو بارش کا فرشتہ حکم بجالاتا ہے۔ اگر حکم کر دے کہ فلاں شخص کی موت فلاں وقت فلاں جگہ واقع ہو تو موت کا فرشتہ اس کا انتظام کرتا ہے۔ اسی طرح کائنات کے ذرہ ذرہ اور جملہ امور میں اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ ہوتا ہے۔ اس لئے مسلمان بارش برسانے، موت سے بچنے وغیرہ میں صرف اللہ تعالیٰ ہی سے درخواست کرتا ہے کہ بارش برسانے پر مامور فرشتہ وغیرہ کو پکارتا ہے۔

اس لئے کہ عالم اسباب کی ان اشیاء میں اللہ پاک نے خاصیتیں اور تاثیریں رکھ دی ہیں۔ پانی میں پیاس بجھانے کی تاثیر، آگ میں گرمی اور روشنی کی خاصیت اور دواؤں میں امراض دور کرنے کی قوت۔ ان خواص اور تاثیروں میں خود ان اشیاء کا کوئی اختیار نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہمارے لئے مستخر کر دیا ہے۔ ان چیزوں کی حیثیت ہمارے نوکروں کی سی ہے اور ان سے کام لینا ایسا ہی ہے جیسے ہم اپنے جانوروں یا اوزار و مصنوعات سے کام لیتے ہیں، ان سے کام لینے میں شرک کی کوئی وجہ نہیں۔

پھر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی قابلیت دے رکھی ہے جس کے ذریعے وہ دوسرے انسانوں کو کوئی فائدہ یا امداد پہنچا سکتے ہیں مثلاً حکیم یا ڈاکٹر، امیر یا حاکم یا کاریگر وغیرہ۔ ان کے بارے میں ہر سلیم العقل آدمی جانتا ہے کہ ان میں کوئی غیبی طاقت نہیں ہوتی، اور ان کے قبضہ میں کچھ نہیں ہوتا۔ اور یہ کہ وہ بھی ہماری ہی طرح اللہ کے محتاج بندے ہیں۔ بس بات اتنی سی ہے کہ اللہ نے اس عالم اسباب میں انہیں اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم ان سے کسی ضروری کام میں مدد لے سکتے ہیں۔ پس ان سے مدد حاصل کرنے یا کام لینے میں شرک کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ شرک تو تب ہوتا ہے جب کسی کو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ظاہری اسباب کے سلسلہ سے بالاتر یعنی غیبی طور پر اپنے ارادہ اور اختیار سے کار فرما اور متصرف سمجھا جائے، پھر اسی عقیدہ کی بنا پر اس سے اپنی حاجتوں میں مدد مانگی جائے اور اسے راضی کرنے کے لئے اس کی عبادت کی جائے اور ایسے شرک عظیم کو شرک جلی کہتے ہیں۔

**معجزات و کرامات صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں** | بلاشبہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے ایسے

کام عالم وجود میں آتے ہیں جو عام انسانوں کی قدرت سے باہر ہوتے ہیں جنہیں معجزات کہا جاتا ہے، اسی طرح اولیاء اللہ سے بھی بعض اوقات ایسے بہت سے کام صادر ہوتے ہیں جو خلاف عادت ہوتے ہیں، ان کو کرامات کہتے ہیں جس سے سرسری نظر

سے دیکھنے والوں کو یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کاموں کی قدرت و اختیار انہیں سپرد نہ کرتا تو ان کے ہاتھوں سے کیسے یہ کام وجود میں آتے جس سے وہ ان انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام کے لئے ایک درجے میں مختار ہونے کا عقیدہ بنا لیتے ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ معجزہ و کرامت کی حقیقت بیان کی جائے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ معجزات و کرامات بھی صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت و اختیار سے وجود میں آتے ہیں۔

**معجزہ کی حقیقت** | معجزہ لغت میں عاجز کر دینے والی چیز کو کہتے ہیں۔ اور اصطلاح میں معجزہ ایسے عمل کو کہتے ہیں جو کسی پیغمبر سے بغیر

کسی سبب طبعی کے عالم وجود میں آئے اور اگر ایسا کوئی کام ولی اللہ کے ذریعے وجود میں آئے تو اسے کرامت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو معجزے دے کر لوگوں کو اپنے احکامات کی طرف بلائے پر مامور فرماتے اور ان معجزات سے مقصود ان کی رسالت و نبوت کی تصدیق کرنا ہوتا ہے کہ جو کام عام آدمی نہ کر سکے وہ انبیاء علیہم السلام سے ظاہر ہوتا کہ عوام سمجھ لیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہے اس کو اللہ تعالیٰ کا رسول ماننا اور اس کے بتلاتے ہوئے عقیدے کے مطابق اور اس کی لائی ہوئی تعلیمات پر عمل کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے حکم کی تعمیل ہے اور جو منکر حق اسے نہ مانتے ہوں ان پر حجت تام ہو اور وہ مستحقین عتاب بن جائیں۔

پچھلے انبیاء علیہم السلام کو عموماً وہ معجزے دیئے گئے جو عملی اور مشاہدہ نظر آنے والے یعنی عملی اور مشاہدہ تو ایسے ہوتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ختم ہو جاتے ہیں اور یہ کلام علی معجزہ ایسا ہے جو قیامت تک ہر وقت میں ہر شخص پر حجت تام ہے مثلاً عصا اور یہ بیضا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت و نبوت کی دلیل تھے لیکن ان کے تشریف لے جانے کے بعد وہ موجود نہیں لیکن قرآن مجید ہر وقت پکار کر اعلان فرماتا ہے کہ مجھ جیسا کلام پیش کرو ورنہ مجھ پر ایمان لاؤ۔ اس کی مزید تفصیل کے لئے کتاب دہریت سے اسلام تک باب خفایت اسلام کو ملاحظہ کیجئے۔

والے مانتے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دکھتی ہوتی آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی غیر مضر ہو جانا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ید بیضا، وغیرہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مادر زاد نابینا اور کوڑھوں کو تندرست کر دینا، مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تمام انسانوں کے لئے ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں ایک طرف ہزاروں عملی اور مشاہد معجزات دیئے گئے جس کی وجہ سے عہد مبارکہ میں مسلمانوں کا ایمان و یقین پختہ اور غیر متزلزل ہو کر قدسیوں کی ایک ایسی عظیم جماعت تیار ہوتی جن کے ایمان میں شک کرنا بلکہ ان پر تنقید کرنا چاند پر تھوکنے کے مترادف ہے تو دوسری طرف رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لئے ایک ایسا کلام علمی معجزہ (قرآن مجید) عطا فرمایا جو لاکھوں عملی اور مشاہد معجزوں سے بڑھ کر ہے جو بیک وقت عقل اور دل دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی حقانیت پر دلائل پیش کرنے کی مثال سورج کے روشن ہونے پر دلائل قائم کرنا ہے اور یہ ایک ایسا کلام ہے جس کی نظیر پیش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے اور قیامت تک کے انسانوں کے لئے پورے قرآن مجید کی نظیر پیش کرنے کی بجائے صرف قرآن مجید کی چھوٹی سی سورت کی مثال پیش کرنے کا چیلنج ہے اور تمام انسانوں جن کو کھٹے ہو کر بھی اس کی مثال لانے سے قاصر و عاجز ہیں۔

**معجزہ کا حکم** | ہر خاص، عام کے لئے یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ انبیاء و رسل اسے جو معجزات یقینی طور پر ثابت ہیں جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کا ٹھنڈا اور غیر مضر ہونا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا اور ید بیضا، وغیرہ کے معجزے جن کا ثبوت اور دلالت دونوں قطعی اور یقینی ہیں وہ حق ہیں اور ایسے ثبوت کا یقینی ہونا یہ ہے کہ اس امر کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہو یا اس کا علم ہمیں متواتر حدیث شریفہ سے حاصل ہو چکا ہو اور اس کی دلالت کا یقینی ہونا یہ ہے کہ اس کے معنی میں کبھی کوئی ابہام نہ ہو اور نہ اس میں کسی دوسرے معنی کا احتمال ہو پس جو لوگ فی الجملہ معجزات کو مانتے ہیں مگر کسی ایسے واقعہ کا طور جس سے ان کا معجزہ ہونا یقینی طور پر ثابت نہیں بلکہ اس میں معجزہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

معجزات پر ایمان لانا ان کے وجود اور ان کی حقیقت کا اعتراف کرنا چاہتے کیونکہ ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی حقیقت میں اسلام اور قرآن سے انکار ہے۔

یقینی معجزوں کو دائرہ اسباب سے جوڑنے کی مذمت | بعض نام نہاد مسلمان جن کے دماغ پر مغربی دنیا

کی مادہ پرستی اور مادی ترقی اور سائنسی برتری کا بُت مسلط ہو چکا ہے، وہ قرآن مجید میں مذکور ایسے واقعات جن کا ظہور دنیا میں یقیناً بغیر کسی طبعی سبب کے ہوا ہے یعنی ایسے یقینی معجزات کو کسی نہ کسی طرح ایسے واقعات بنانے کی کوشش کرتے ہیں جن کا وقوع اسباب طبعیہ کے تحت ممکن ہو یہ حضرات ایسے واقعات کو عادی واقعات بنانے میں کسی بھی تحریف، تبدیلی سے نہیں چوکتے۔ خواہ ان کو صحیح احادیث کا رد کرنا پڑے یا قرآن کے سیاق و سباق کو چھوڑنا پڑے، خواہ قرآن مجید کی دوسری محکم آیات کریمہ کو نظر انداز کرنا پڑے کیونکہ ان حضرات کا رویہ یہ ہے کہ وہ اپنے نظریات کو قرآن، سنت کے مطابق بنانے کی بجائے قرآن، سنت کو اپنے نظریات کے تابع بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ یہ سب یا تو اس لئے کرتے ہیں کہ ان کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ کہیں کوئی روشن خیال انہیں قدامت پسندی کا طعنہ نہ دے دے یا ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مغربی نظریات سے قرآن، سنت کو ہم آہنگ کیا جائے تاکہ ان سے داد اور دنیاوی مفادات حاصل کریں یا اگر ہم ان سے حسن ظن رکھ کر ان کے بارے میں یہ گمان رکھیں کہ ان کا اس طرز عمل سے مراد یہ ہے کہ اس سے نام نہاد عقلیت پسند اور مستشرقین کے بے ہودہ اعتراضات کا جواب ہو جائے گا تو پھر یہ یقیناً قرآن اور اسلام کے ایسے نادان دوست اور ہمدرد ہیں کہ ان کی دوستی اور ہمدردی دشمنان اسلام کے تعصب، عداوت سے لاکھوں گنا بڑھ کر خطرناک ہے کیونکہ غیر مسلم کی کھلی مخالفت اور فریب دہی سے عوام کا بچنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اس ایک شخص سے بدعتیہ، شیعہ، گروہی اور غیر معجزہ دونوں کا قوی احتمال موجود ہے اس کو وہ دائرہ اسباب سے جوڑ دے تو ایسے شخص کو خواہ مخواہ منکر معجزات و کرامت کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔

جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلامی عقائد اور اعمال کو مسخ کر دیتا ہو۔

**مجززہ سے انکار کی وجہ** | جو لوگ معجزات کے سرے سے قائل نہیں، ان میں بعض تو وہ ہیں جو وجود باری تعالیٰ کے منکر ہیں اور

بعض لوگ اگرچہ خدا کو تو مانتے ہیں لیکن ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا فرما کر اس کے نظم کو ایک قانون پر چلا دیا۔ اس کے بعد کائنات کے نظم و تدبیر میں اس کا کوئی دخل نہ رہا۔ وہ الگ تھلگ بیٹھ کر ایک بے بس تماشائی کی طرح کائنات کو خاموشی سے دیکھ رہا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے ایسے لوگ جب کسی خرق عادت واقعہ جو دائرہ اسباب سے ماورا ہو، کے متعلق سنتے ہیں تو اس کو ایک افسانہ باور کر کے رد کر دیتے ہیں اور اگر کہیں وہ ایسے واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں تو اسے دائرہ اسباب سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، غرض یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے تعطل کے قائل ہو کر برائے نام ایسے بے اختیار اور بے قدرت خدا کو مانتے ہیں، جو کمزور ترین انسان سے بھی زیادہ لاچار و بے اختیار ہو، جو درحقیقت خدا کے نہ ماننے کے مترادف ہے۔

اس کے برعکس مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کی تخلیق کی، وہی قادر مطلق ہے، تمام اختیارات کا مالک صرف وہی ذات ہے وہ کائنات کی تدبیر و انتظام خود کرتا ہے، پوری کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اسی کی مشیت کے تحت ہوتا ہے حتیٰ کہ کسی درخت کا پتہ بھی اس کے اذن کے بغیر جنبش تک نہیں کر سکتا اور اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے تمام اشیاء کو پیدا فرمایا اور ان میں خاصیتیں رکھ دیں۔ تو جس طرح یہ اشیاء خود اپنے وجود اور بقا میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں اسی طرح ان کے خواص بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور اپنے نفع و ضرر پہنچانے میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں، اگرچہ ان خاصیتوں کے لئے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے عام قانون اور معمول یہی رکھا ہے کہ وہ اپنی خاصیتوں پر قائم رہیں مثلاً آگ میں جلادینے کی خاصیت ہے

یہ مزید تفصیل کتاب دہریت سے اسلام تک میں ملاحظہ فرمائیں۔

اور اس کا عام معمول یہ ہے کہ جو بھی آتش پذیر چیز اس میں پڑ جائے تو جل جاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہے اس کی اس خاصیت کو خاص حالت میں سلب کر لے اور اس کے عام معمول کو بدل دے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈال دیا گیا تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے آگ کو حکم فرمایا کہ یٰنَارُ کُونِی بَرْدًا وَ سَبَاطًا عَلٰی اِبْرٰہِیْمَ (سورۃ الانبیاء - آیت نمبر ۱۲۴) اے آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا ابراہیم پر۔ تو وہ ٹھنڈی اور غیر مضر بن گئی کیونکہ تمام اشیاء کی خاصیتیں اور معمول اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں وہ جس وقت جس چیز کی خاصیت اور معمول کو بدلنا چاہے بدل سکتا ہے جیسا کہ یہاں آگ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی جلانے کی خاصیت چھوڑ دی اور گلزار بن گئی۔ اس طرح وہ جب چاہے اشیاء کی شکلوں کو اور واقعات کی عادی رفتار میں جزوی یا کلی طور پر جیسا چاہے تغیر کر سکتا ہے کیونکہ صرف وہی تمام چیزوں کا خالق و مالک ہے۔

**معجزہ اور کرامت کی حیثیت** | جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ معجزہ اور کرامات بغیر کسی طبعی سبب کے اللہ تعالیٰ کے حکم سے خلاف عادت وجود میں آتے ہیں اس لئے معجزات و کرامات براہ راست حق تعالیٰ شانہ کا فعل مانا جاتا ہے۔ صرف اس کا ظہور پیغمبر یا ولی کے ماتحتوں پر ان کی قدرت اور عظمت ثابت کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ پیغمبر اور ولی کو اس کے وجود میں لانے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَقَسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ سَوْفَ لَا یُؤْتِیْہُمْ مِنْہُمْ مِّمَّا کَانُوا یَکْفُرُونَ** (الانعام آیت ۱۰۹) یعنی اور وہ (منکر) حق، اللہ کی سخت قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے سامنے کوئی نشانی (معجزہ) آجائے تو وہ اس پر ضرور ایمان لے آئیں گے (اے پیغمبر، آپ کہہ دیجئے نشانیاں (معجزے) تو اللہ کے اختیار میں ہیں اور اے مسلمانو! تمہیں (ان منکرین حق کا حال) معلوم نہیں کہ اگر ان کے سامنے نشانیاں (معجزے) آجائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔

اور ایک بکر سابقین انبیاء علیہم السلام کے ساتھ پیش آنے والے حالات کو بیان کر کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وَمَا كَانَ لِرَسُولِكَ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ فُقِضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُضِلُّونَ (المومن آیت ۷۸) یعنی اور کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہیں کہ وہ اللہ (تعالیٰ) کے اذن کے بغیر خود کوئی نشانی (معجزہ) لاسکے، پھر جس وقت اللہ کا حکم (نزول غدا ب) اچکا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا اور اس وقت اللہ کے پیغمبروں کے بھٹلانے والے خسارہ میں پڑ گئے۔

غزوہ بدر کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار و مشرکین کے لشکر کی طرف ایک مٹھی بھر خاک اور کنکری پھینک دی جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہر لشکر کی آنکھ میں جا لگی۔ اس واقعہ کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى (الانفال ۱۷) یعنی خاک یا کنکریوں کی مٹھی جو آپ نے پھینکی حقیقت میں آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے یہ مٹھی بھر خاک اور کنکری اگر چہ آپ کے ہاتھ سے پھینکی گئی۔ لیکن اس مٹھی بھر کا اثر کفار و مشرکین کے تمام لشکر کی آنکھوں میں پہنچا دینا اس میں آپ کے عمل کا کوئی دخل نہیں یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا فعل تھا کہ اس نے اپنی قدرت سے ان تمام کاوٹوں کو دور کر کے یک لحوت مٹھی بھر خاک اور کنکریوں کو دشمن کے سارے مجمع تک پہنچا دیا اور ان میں سے ہر ایک کی آنکھ میں اس کا اثر پہنچا دیا۔

اسی طرح بہت سی آیات کریمہ اس پر شاہد ہیں کہ کوئی پیغمبر خدا یا کوئی ولی اللہ جب چاہے، جو چاہے معجزہ یا کرامت دکھا دے یہ قطعاً کسی کے بس میں نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء علیہم السلام سے کفار و مشرکین نے بہت سے متعین معجزات کی فرمائش کی مگر جس معجزہ کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے چاہا اس کو ظاہر کر دیا اور جس کا ظہور نہ چاہا، نہیں ہوا۔

غرض معجزات و کرامات اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وجود میں آتے ہیں۔ ان

کے ظہور میں نہ کسی ولی اللہ کو اختیار ہوتا ہے اور نہ کوئی نبی و رسول اس کے پیش کرنے میں خود مختار ہوتا ہے۔

البتہ انبیاء علیہم السلام کی عظمت و احترام ہم پر لازم ہے کیونکہ معجزات و کرامات کا صدور انبیاء و اولیاء ہی سے ہوا کرتا ہے۔ یہ ان کی صداقت و عظمت ثابت کرنے کے لئے اور ان کی تائید کے لئے ہوتے ہیں۔ انہی کے واسطے سے ان کا ظہور ہوتا ہے اور ان کی وجہ سے ہم تک اللہ تعالیٰ کی رضا کے اعمال اور اللہ تعالیٰ کے احکامات پہنچتے ہیں۔

معجزہ اور جادو میں فرق | یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء اللہ کی کرامات سے ایسے

واقعات مشاہدے میں آتے ہیں جو عام عادت کے خلاف ہوا کرتے ہیں۔ بظاہر سحر و جادو سے بھی ایسے ہی آثار و اعمال ظاہر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بعض کم فہم لوگ دونوں میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے جادو گروں کی پیغمبروں جیسی تعظیم کرتے ہیں۔ حالانکہ سحر و جادو اور معجزات و کرامات میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ سحر و جادو، مسموم، ہپناٹزم، ٹوٹے ٹوٹے وغیرہ سے جو چیزیں ظہور پذیر ہوتی ہیں وہ سب اسباب طبعیہ کے اندر ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے اسباب مخفی ہوتے ہیں جو عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتے۔ اس لئے عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ کام بغیر کسی طبعی سبب کے ہو گیا۔ حالانکہ ان اشیاء سے ظاہر ہونے والے مشاہدوں کے اسباب اہل فن پر مخفی نہیں ہوتے۔

دائرہ اسباب کی اقسام | اس سے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ اسباب طبعیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ظاہری اسباب اور مخفی اسباب۔ ظاہری

اسباب سے جو چیزیں ظہور میں آتی ہیں، چونکہ ان کے اسباب ہر کسی پر عیاں ہوتے لہٰذا کسی انسانی مال یا ناخن وغیرہ یا اس کے استعمال شدہ کپڑے وغیرہ کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں ملا دیتے ہیں۔ اس کو ٹوٹو کہتے ہیں۔

ہیں اس لئے یہ چیزیں کسی کے لئے قابل حیرت نہیں ہوا کرتیں۔ مثلاً گندم کی کاشت سے گندم کا پودا نکل آنا اور اپنے وقت پر پکنا، کسی تیز رفتار سواری پر سوار ہو کر کسی جگہ جلد پہنچنا یا جہاز میں اڑنا جو شخص بھی گندم کاشت کرتا ہے وہ گندم حاصل کر سکتا ہے یا جو شخص جہاز میں سوار ہوتا ہے وہ طویل مسافت مختصر وقت میں طے کر سکتا ہے۔ لیکن اسباب مخفیہ سے جو چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں اس کے اسباب خاص لوگوں کے علاوہ دوسرے عام لوگوں پر مخفی ہوتے ہیں مثلاً سائنسی ایجادات، سحر جادو وغیرہ۔ ریڈیو پر آپ تقریر اور خبریں کیسے سنتے ہیں، وائٹریس پر بغیر کسی تار وغیرہ کے ہزاروں میل دور کی باتوں کو کیوں سنتے ہیں، یا مثلاً مسمریزم، ہپناٹزم سے کسی کے خیال میں کوئی چیز ڈالنا یا اس کے خیال سے کسی چیز کا آپک لینا تو اس کے اسباب اہل فن پر مخفی نہیں ہوتے اور اس سے دفاع کرنے کی تدابیر اور طریقے بھی وہ خوب جانتے ہیں۔ اسی طرح اگر شیاطین یا جن کے ذریعے کسی کے پاس دور کسی چیز کی خبر پہنچ جائے، تو یہ اس شخص کے لئے تو قابل تعجب بات ہوا کرتی ہے جس کو اس کے اسباب معلوم نہ ہوں۔ لیکن اس آدمی کے لئے یہ کوئی قابل تعجب بات نہیں جو شیاطین و جن کی حیثیت اور ان کی تیز رفتاری اور ان سے کام لینے کی چالیں سیکھ چکا ہو۔ یا کم از کم وہ اس سے باخبر ہو۔ اسی طرح اگر کوئی دوائی لگا کر اپنے کو فائر پروف کر کے آگ کے اندر پھلکا جائے یا اپنے ہاتھ وغیرہ کو آگ میں داخل کر کے پھیر چھج و سالم نکل آتے۔ یہ کام تو ایک عام شخص کو متاثر کر سکتا ہے لیکن خواص کو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آگ سے جلنے کی خاصیت نہیں ختم ہو جاتی ہے اور نہ اس آدمی کا نہ جلنا کوئی معجزہ یا کرامت ہے بلکہ دواؤں کے اثر سے وہ اپنے بدن کو آگ کی تپش سے محفوظ کر لیتا ہے اور جو بھی وہ دوائی استعمال کرے گا ایسی چال دکھلا سکتا ہے بخلاف معجزہ و کرامت کے کہ وہ بغیر کسی اسباب طبعی کے ہوتا ہے۔ جیسا کہ بغیر کسی سبب کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کی آگ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ٹھنڈی اور غیر مضر بنا دی اور آگ کو براہ راست کام فرمایا

کُوْنِیْ بِنَ دَاوَسَلَامًا۔ تو وہ جلنے کے باوجود گلستان میں بدل گئی۔ غرض جادو، ہینائزم، مسمریزم، ٹونے ٹونکے وغیرہ سے وجود میں آنے والی چیزیں دائرہ اسباب سے الگ کوئی چیز نہیں۔

بلکہ سائنسی مصنوعات کی طرح ان کے اسباب اہل فن کو معلوم ہوتے ہیں جیسے شیطاں جن کو خوش کر کے ان سے کام لینا ہوتا ہے یا قوت نفسیہ یا حروف و کلمات لکھ کر یا ان کا ورد کر کے اس کا ظہور ہوتا ہے۔ جو دوسرے لوگ بھی فن سیکھ کر دکھلا سکتے ہیں۔ چونکہ یہ چیزیں اصول و قوانین پر مبنی ہوتی ہیں اس لئے وہ ہر وقت ایسی شبیدہ بازیاں دکھلا سکتے ہیں بخلاف نبی و پیغمبر کے کہ ان کا معجزہ کسی اصول و قوانین اور اسباب کی بنیاد پر ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ اور نہ یہ ان کا پیشہ ہوتا ہے بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کا فعل اور اس کی خاص قدرت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

عوام الناس معجزہ و کرامت اور جادو وغیرہ میں فرق کیسے کریں گے

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معجزہ و کرامت اور جادو وغیرہ کے فرق کو خواص تو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن عوام جو ان محفّی اسباب سے بے خبر ہیں، وہ نبی اللہ، ولی اللہ اور جادو گروں میں فرق کیسے کریں گے، کیونکہ معجزہ و کرامت وغیرہ دونوں کی ظاہری صورت تو تقریباً ایک ہی ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح حقیقت کے اعتبار سے معجزہ اور جادو میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور جادو گروں میں ایسے واضح امتیازات رکھ دیئے ہیں جن کی وجہ سے لوگ ان کے دھوکہ دینے سے بچ جاتے ہیں۔ اول یہ کہ معجزہ و کرامت کا صدور ایسے حضرات سے ہوتا ہے جن کا تقویٰ، صداقت، امانت، طہارت و پاکیزگی، اخلاق و اعمال ایسے بلند ہوتے ہیں جن کا سب لوگ مشاہدہ کرتے ہیں بلکہ انبیاء علیہم السلام کی تو عوام زندگی اسی طرح آزمائش و امتحانوں کی کسوٹی پر پرکھی گئی تھیں کہ حروف و کلمات میں بھی بالخاصہ کچھ تاثرات ہوتی ہیں کسی خاص حرف یا کلمہ کو خاص تعداد میں پڑھنے یا لکھنے وغیرہ سے خاص تاثرات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

کہ ان کا کوئی شعبہ زندگی ناقص اور قابل اعتراض نہ تھا اور ان کی تمام زندگی میں اخلاق کی بلندی گناہوں سے معصومیت اور صداقت و کردار کا کمال لوگوں کے ہاں ایسا مسلم تھا کہ اگر وہ کوئی معجزہ نہ بھی دکھلاتے تب بھی ان کی پیغمبری زندگی جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت گزر رہی تھی اور ان کی تعلیمات عقلی و دلائل کی روشنی میں اسی قدر صداقت پر مبنی تھیں کہ وہ راہ حق سے بھٹکی ہوئی قوموں کی ہدایت کے لئے ایک نسخہ کیمیا اور دینی و دنیاوی فلاح کا سبب تھا۔ لیکن اس کے برعکس جادو کا اثر صرف ایسے لوگوں سے غمو میں آتا ہے جو عام لوگوں سے زیادہ گندے، ناپاک، اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل اور اس کی عبادت سے دور رہتے ہیں۔ اور جو جادوگر گندگی اور ناپاکی میں جتنا زیادہ بلند ہو اس کا جادو اتنا ہی زیادہ موثر ہوتا ہے تو آخر ایسی حالت میں وہ دوسروں کے لئے کیسے زندگی گزارنے کا نمونہ پیش کر سکتا ہے جس کی اپنی زندگی دوسرے انسانوں بلکہ حیوانات سے زیادہ پست اور گندی ہو۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ معجزہ کا توڑ لانا کسی بشر کی قدرت سے خارج ہوتا ہے بخلاف سائنسی مصنوعات اور جادو وغیرہ کے کہ اور لوگ بھی اسی طرح فن کو سیکھ کر اسے حاصل کر سکتے ہیں اور اس کا توڑ پیش کر سکتے ہیں۔ کوئی ایٹم بم کو بنانا ہے تو دوسرا یہ فن سیکھ کر وہ بھی اسی طرح یا اس سے اعلیٰ بم تیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی نے ریڈیو ایجاد کیا تو ہزاروں لوگوں نے مہارت حاصل کر کے اس سے اعلیٰ ریڈیو تیار کر لیا۔ یہی حال جادو، ہپناٹزم، ہمسریم وغیرہ کا بھی ہے کہ کوئی یہ فن سیکھ کر یا اعمال انسانی لہذا اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں انبیاء علیہم السلام کی نصرت کے لئے معجزات بھی دے دیتے ہیں کیونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سورج سے زیادہ روشن عقلی و عقلی دلائل کے باوجود عوام کی فطرت اکثر و بیشتر حق و صداقت کے قبول کرنے کے لئے دلائل سے زیادہ ایسے امور سے جلد متاثر ہوتی ہے جو عقل کو حیران اور دماغ کو مرعوب کر کے ان پر یہ ظاہر کر دے کہ وہ عوامی نبوت کے سامنے نبی کا یہ عمل بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہوئی ایسی طاقت رکھتا ہے جس کا مقابلہ انسانی طاقت سے باہر ہے اور ان کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ جہہ خدا کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے اس لئے یہ جو کچھ بھی کہتا ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کہتا ہے۔

کی مشق اور اس کے طریقے سیکھ کر دوسروں کی طرح یا ان سے اعلیٰ کام اور شعبہ بازیاں دکھلا سکتا ہے۔ کیونکہ ان تمام اشیاء کا ظہور اسباب طبعیہ کی وجہ سے ہوتا ہے اور ان کے اسباب سے اہل فن کو واقفیت ہوتی ہے، اور ہر ایک ماہر فن اپنے سے زیادہ بالکمال کو پہچانتا ہے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں فرعون نے جب اپنے ملک کے تمام اعلیٰ ساحروں کو جمع کر دیا تو انہوں نے اپنی لاثعیاں و رسیاں میدان میں پھینک دیں وہ بڑے بڑے سانپ نظر آنے لگے لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی عصا پھینک دی تو وہ اژدہا بن کر ان کے سارے سانپوں کو نسیگل گیا اور ان کے سحر کو توڑ دیا۔ یہ واقعہ دیکھ کر جادو گروں کو ماہرین فن ہونے کی وجہ سے فوراً یقین آ گیا کہ بلاشبہ یہ ان کے فن اور اسباب طبعیہ کے تحت ظہور پذیر ہونے والی چیز نہیں بلکہ یہ نالغ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مظاہرہ ہے تو وہ بے ساختہ سجدے میں گر گئے اور بجاتے اس طرح کہنے کے کہ ہم نے مان لیا کہ موسیٰ ہم سب سے زیادہ اعلیٰ اور بالکمال جادو گر ہے یوں پکارا اٹھے کہ ہم اس رب کو مان گئے جس نے پیغمبر کی حیثیت سے موسیٰ و ہارون علیہما وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا ہے۔

معجزہ اور جادو میں ہمارے علماء نے ایک فرق یہ بھی بتلایا ہے کہ نبوت کے دعوے کے ساتھ کسی کا جادو چلتا نہیں، لیکن اگر یہ آخری وجہ نہ بھی ہوتی پھر بھی مذکورہ بالا دو وجوہ ایسی ہیں کہ جو ایک انسان کے لئے نبی و جادو گر میں فرق کرنے کے لئے کافی و شافی ہیں، لیکن یہ بات ایک مسلمہ امر ہے کہ اب تک کسی جادو گر نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ

نہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ الیاذ باللہ! سائنس اور سحر وغیرہ جیسی چیزیں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی قدرت سے بے نیاز ہو کر از خود متواتر ہیں۔ یہ عقیدہ تو نالغ کفر ہے کیونکہ تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت کام کر رہی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو کوئی چیز بھی نہ قائم نہ ہونے لگتی ہے اور نہ نقصان بلکہ یہاں تو مقصود یہ ہے کہ سائنس اور سحر وغیرہ سے جو مشاہدے ظہور میں آتے ہیں ان کا صدور بھی اسباب طبعیہ کی وجہ سے ہوتا ہے لیکن فرق صرف یہ ہے کہ ان کے اسباب ایسے ہیں جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ اور اہل فن پر ظاہر ہوتے ہیں۔

نہیں کیا، اگر کبھی کسی نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر بھی دیا تو پھر اس کا جادو اور اس کی پیشین گوئی اس کے منہ پر ماری گئی۔

**اصل حقیقت** | حقیقت اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہ جو کچھ ہے وہ سب قادر مطلق حق تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ تمام چیزیں اور سارے منافع اور نقصانات جن کا ظہور ان اشیاء سے دکھائی دیتا ہے اللہ کی طرف سے ہیں۔ اسی حقیقت کو حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر ساری دنیا کے جن اور انسان مل کر تمہیں کوئی ایسا نفع پہنچانا چاہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر نہیں فرمایا تو ان کی کوئی مجال نہیں کہ پہنچا سکیں۔ اسی طرح اگر ساری دنیا کے جنات اور انسان مل کر تمہیں کوئی ایسا نقصان پہنچانا چاہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے نہیں چاہا تو ہرگز نہیں کر سکیں گے۔

**مشرکین کے عقائد** | مشرکین عرب میں سے اکثر یہ مانتے تھے کہ زمین و آسمان اور ساری کائنات کا خالق ایک ہی ہے۔ ایسا نہیں کہ کچھ چیزیں تو ایک نے پیدا کی ہوں اور کچھ کسی اور نے۔ قرآن مجید میں جا بجا اس کی شہادت موجود ہے وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمُوتَ وَالْأَرْضَ وَمَسْحَرَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ (سورۃ عنکبوت آیت ۶۱) اور اگر آپ (ان مشرک لوگوں سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کو کس نے بنایا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے کام پر لگایا ہے تو اقرار کریں گے کہ اللہ نے یہ سب کچھ کیا ہے)۔

اور اس کے علاوہ وہ لوگ اس بات کا اقرار بھی کرتے تھے کہ کائنات کا سارا کارخانہ اللہ تعالیٰ ہی چلاتا ہے، وہی روزی دیتا ہے، وہی مارتا ہے اور زندگی بھی دیتا ہے۔ جیسا کہ سورت یونس میں ارشاد ہے قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَوتِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَمِيتِ وَيُخْرِجُ الْمَمِيتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فِتْنَةً لَمْ تُغْلِبْ فَتَقُولُوا لَا أَمْرَ لَنَا فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ فَكُلٌّ أَفَلَاقٌ تَقْعُونَ (یونس آیت ۳۱) یعنی اے پیغمبر! آپ (ان مشرکین سے) پوچھتے

رکھتاؤ کون تم کو روزی دیتا ہے، زمین و آسمان سے، یا کون کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے، اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردے سے اور مردے کو زندہ سے، اور کون ہے جو اس تمام کارخانہ کائنات کی تدبیر و انتظام کرتا ہے (تو آپ جب ان سے پوچھیں گے، تو وہ صاف بول اٹھیں گے کہ یہ سب کچھ کرنے والا اللہ ہے سو آپ ان سے، کیسے پھر ڈرتے نہیں ہو؟

بلکہ مشرکین عرب کے متعلق قرآن شاہد ہے کہ جب وہ لوگ بحری سفر کرتے اور دریا میں طوفان کی صورت پیدا ہو جاتی تو وہ اپنے سب دیوتاؤں کو بھول جاتے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے اور اسی سے اپنی امیدیں لگا دیتے وَإِذَا امْسَكُوا الصَّوْتُ فِي الْبَحْرِ ضَلُّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا أَيَّاكُمْ (سورۃ الاسراء آیت ۶۶) یعنی جب تم پیر دریا میں آفت آتی ہے، جن کو تم پکارتے تھے (سب) بھول جاتے ہو سوائے اللہ کے۔

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَإِذَا غَشِيَ سَمُومٌ مَّوْجًا لَطَلَّ دَعْوَا اللّٰهِ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (سورۃ لقمان آیت ۲۴) یعنی جب ان (مشرکین) کے سر پر سمندر کے موج بادل جیسے آئے (تو پھر) خالص اللہ ہی کے لئے بندگی کو خالص کرتے ہیں۔

بہر حال مشرکین عرب اگرچہ غیر اللہ کی پرستش کرتے تھے مگر یہ بالکل واضح اور یقینی ہے کہ وہ اپنے جھوٹے معبودوں کو خدا یا مثل خدا نہیں سمجھتے تھے، اور اپنے معبودوں کو خدا کی مخلوق و مملوک مانتے تھے۔ حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے والد سے پوچھا اے حصین! تم کتنے معبودوں کی پرستش کرتے ہو؟ میرے والد نے جواب دیا سات کی سیٹھا فی الارض وواحدًا فی السماء چھ زمین پر ہیں اور ایک آسمان میں۔ قَالَ فَأَيُّكُم تَعْبُدُ لِرَبِّكَ وَرَهْبَتِكَ؟ قَالَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ اپنی

رغبت اور خوف کے لئے تم نے کس کو چن رکھا ہے، تو انھوں نے جواب دیا  
آسمان والے کو۔

حدیث شریف کی کتابوں میں مشرکین کا وہ تلبیہ نقل کیا گیا ہے جو زمانہ جاہلیت  
میں حج و عمرہ کے دوران پڑھا جاتا تھا۔ لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ۔ لَبَّيْكَ لَا  
شَرَّ يَدِكَ إِلَّا شَرُّ يَدَاكَ هُوَ لَكَ تَعْلَمُكَ وَمَا مَلَكَ۔ اللہ میں تیری بارگاہ  
میں حاضر ہوا، آپ کا کوئی شریک نہیں مگر وہ جو آپ کی ملکیت میں ہیں، آپ ہی ان  
کے مالک ہیں اور وہ خود کسی چیز کے مالک نہیں۔

الغرض مشرکین یہ مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کائنات اور اس کی ذات  
میں کوئی دوسرا شریک نہیں، محبت اور خوف کا تعلق بھی اسی خدا سے واحد (الہ  
آسمانی) سے رکھتے تھے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات اور اسباب سے  
بالا تر افعال و اشیاء میں دوسروں کو بھی شریک کرتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے  
کہ اللہ کے قریب ہونے کی وجہ سے بتوں کو بھی بعض اختیارات حاصل ہیں جب  
چاہیں بنا دیا بگاڑ کر سکتے ہیں اور اسی بنیاد پر ان کو خوش کرنے کے لئے ان کی  
پوجا کرتے تھے، عبادت والے اعمال یعنی سجدہ و طواف کرتے اور اپنے بتوں  
کے نام نذریں اور ملتیں مانتے تھے، ان سے اپنی حاجتیں اور مرادیں مانگتے تھے  
انہی غلط و باطل عقائد اور اعمال نے انہیں گمراہ کر کے جہنم کے راستہ پر ڈال دیا تھا،  
پھر ان میں بعض اتنے احمق تھے کہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھر  
کے بتوں اور مورتیوں سے اپنی حاجتیں طلب کرتے اور ان کو عبادت، محبت  
اور تعظیم میں اللہ کے برابر قرار دیتے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد  
باری تعالیٰ ہے۔ اَتَعْبُدُونَ مَا تَنْجُسُونَ (المائدہ آیت ۹۵) یعنی کیا تم مورتیوں  
کی پرستش کرتے ہو جن کو تم نے اپنے ہاتھوں سے تراشا اور بنایا ہے۔

بعض مشرک اتنے بے وقوف تو نہیں تھے کہ پتھر کی مورتیوں کی عبادت کرتے  
لیکن وہ کچھ حقیقی یا فرضی بزرگ روحوں اور روحانی ہستیوں کو نفع و ضرر کا مالک اور

اپنا حاجت روا تسلیم کرتے تھے۔ عبادت وہ لوگ درحقیقت ان بزرگ ہستیوں کی کرتے تھے لیکن تبوں کو ان کی جلوہ گاہ یا نشانیاں سمجھتے تھے۔ ایسے لوگوں کو آگاہ کیا گیا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَلُ الْكُوْهِرِ (آیت ۲۲)

بے شک وہ جن کو تم پوجتے ہو وہ تمہاری ہی طرح ہمارے بندے ہیں۔

دوسری جگہ فرمانِ ربانی ہے۔ اَوَلَيْكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْنَؤُتْ اِلٰى رَبِّهِمْ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَزْجُوْنَ رَحْمَةً ۙ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهُ (بنی اسرائیل آیت ۵۵) وہ لوگ جن کو یہ (مشرک) لوگ پکارتے ہیں وہ خود اپنے رب تک (قرب) کا وسیلہ تلاش کرتے ہیں کہ کون سا راستہ اللہ تعالیٰ تک رسائی کے لئے (زیادہ نزدیک ہے اور اس کی مہربانی کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

مخلوقِ خدا کی کثیر تعداد اسی طرح سے گمراہ ہو کر تباہ ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خاص و مقرب بندوں اور مقبول بزرگوں کی مورتیاں بنا کر ان کی عبادت میں لگ گئے۔ انسانیت کی پوری تاریخ پر اسی مملک مرض کے بد نما داغ موجود ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر آج تک اکثر اقوامِ عالم اسی طرح گمراہ ہو کر جہنم کا ایندھن بن گئیں۔ افسوس کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب و منتخب بندے جو شرک کی سیخ کنی اور توحید کی اشاعت کے لئے مبعوث ہوئے تھے، جنھوں نے دنیا کو توحید کا درس دیا۔ توحید کی تبلیغ کے لئے سخت سے سخت تکلیفیں برداشت کیں، آروں سے چیرے گئے، آگ میں ڈالے گئے لیکن اُن تک نہ کی، اور ہر حال میں اپنا فرض ادا کیا، مخلوقِ خدا کو شرک سے باز رکھنے کے لئے پوری پوری کوشش کرتے رہے۔ انہی بندگانِ خدا کو بعد میں آنے والے جابلوں نے خدا کا شریک ٹھہرایا۔ حضراتِ انبیاء علیہم السلام صدیقین، شہداء اور صالحین کے بت بنا کر ان کی عبادت کرنے لگے۔

شُرک فی العبادات پر تفصیلی بحث | عبادت کی حقیقت: اللہ تعالیٰ نے بعض تغلیمی کام اپنے لئے خاص کر کے

مقرر فرماتے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، نذر اور منت وغیرہ۔ ایسے اعمال کو عبادات اور قربات کہتے ہیں، عبادت شریعت کی اصطلاح میں کسی ہستی کو غیبی طور پر نفع و نقصان کا مالک اور حاجت روا سمجھ کر اسے راضی اور خوش کرنے اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے انتہائی محبت اور تعظیم کے ساتھ اس کے سامنے بے حدود شدید ترین اشد درجہ عاجزی اور انکسار کے اظہار کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کے سوا کوئی ایسی ہستی یا چیز نہیں جس کی عبادت شرعاً یا عقلاً درست ہو۔

شُرک فی العبادات، شرک کی وہ قسم ہے جس میں انسان زیادہ بتلا رہے ہیں عام طور پر رکوع و سجدہ، نذر و منت اور قربانی جیسی عبادات میں اللہ کے ساتھ اور ول کو بھی شریک ٹھہرایا گیا۔

**غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے** | سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ خالق کون و مکان کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ کرنا حرام ہے خواہ وہ عبادت کی نیت سے ہو یا محض تعظیم و تکریم کی نیت سے۔ دونوں صورتیں ابا جماع امت حرام اور ممنوع ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو عبادت کی نیت سے غیر اللہ کو سجدہ کرے گا وہ تو کافر ہو جائے گا اور جس نے محض تعظیم کے لئے سجدہ کیا، اکثر علماء کے نزدیک اسے کافر تو نہیں کہا جائے گا لیکن از کتاب حرام کا مجرم فاسق کفر اور شرک کے قریب ہوا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ لَا تَسْجُدْ لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدْ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ۔ سجدہ نہ کری سورج کو اور نہ چاند کو، اور سجدہ کرو اللہ کو جس نے ان کو بنایا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ مروی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کے ساتھ تھے کہ ایک اونٹ نے آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (اللہ کے حکم سے، بطور معجزہ) سجدہ کیا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کو درخت اور جانور سجدہ کرتے ہیں، ہم تو

زیادہ حقدار ہیں کہ آپ کو سجدہ کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور اپنے بھائی کی (فقط) تعظیم کرو۔ اگر میں کسی کو اجازت دیتا کہ وہ کسی کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے (مشکوٰۃ باب عشرۃ النساء) اسی طرح قیس بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حیرہ (اطراف کوفہ) کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے سر دار کو سجدہ کرتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حیرہ والے اپنے سر دار کو سجدہ کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو زیادہ لائق ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میری قبر پر تمہارا گزر ہو تو کیا تم میری قبر کو سجدہ کر دو گے؟ قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے کہا نہیں آپ نے فرمایا۔

لَا تَفْعَلُوا لَوْ كُنْتُمْ اُمَّمٌ اَحَدًا اِنَّ لَيْسَ سَجْدَةً لَّحَدٍ لَّا مَوْتُ الْمَرْءِ اَنْ يَسْجُدَ لِدَاوٰدَ وَاجِبٌ جَعَلَ اللّٰهُ لِهٰمْ عَلَيْهِمْ مِنْ حَقٍّ (ابوداؤد) کہ سجدہ نہ کرو۔ اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر مردوں کا حق مقرر کیا ہے۔ اسی روایت کو امام احمد نے بھی معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ ان احادیث شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اس کے سوا کسی اور کے آگے سر رکھنا ممنوع ہے۔ سجدہ عبادت تو اللہ کے سوا کسی اور کے لئے کسی بھی شریعت اور امت میں حلال نہیں رہا، البتہ تعظیمی سجدہ قدیم شریعتوں میں جائز تھا لیکن شریعت اسلامی میں غیر خدا کے لئے حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی بالاتفاق سجدہ تعظیمی ممنوع اور حرام ہے۔

سجدہ تعظیمی والتحیہ کے بارے میں علماء کی آراء۔ سجدہ تعظیمی اور سجدہ التحیہ پر اہل اہل المذہب میں ایک

مفصل بحث ہے جس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

امام ابو بکر جصاص حنفیؒ اپنی کتاب احکام القرآن میں فرماتے ہیں کہ سجدہ تعظیمی

حضرت آدم علیہ السلام کے لئے بحکم الہی جاری کیا گیا تھا اور سب سے پہلے اُن کے لئے مشروع ہوا، پھر اُن کی امت میں بھی مشروع رہا ہے اور غالباً یہ سجدہ تعظیمی کی مشروعیت برابر باقی رہی یہاں تک کہ یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ان کے بھائیوں نے ان کو سجدہ کیا۔ اور اس زمانہ میں سجدہ غایت تعظیم کیلئے کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ ہماری شریعت میں معانقہ تعظیماً مشروع ہے۔ اسی طرح دست بوسی بھی بعض علماء کے نزدیک بلا کراہت مشروع اور بعض مکروہ فرماتے ہیں مگر سجدہ کو شرع شریف نے کبھی کسی حالت میں کسی ذات کے سلتے جائز نہیں کیا۔ اور نہ ہو سکتا ہے۔ اور سجدہ تعظیمی کی مطلقاً مانعت احادیث صحیحہ اور صریحہ سے قطعی طور سے ثابت ہے۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں

”اگر یہ سجدہ تعظیم ان چیزوں کو کیا جاوے جن کو سجدہ کرنا خاص کفر کی علامت اور کفار کا شعار ہے جیسے بُت یا پیدل کا درخت یا گنگا جمنایا چاند سورج وغیرہ تو یہ سجدہ تعظیم بھی باجماع امت اور باتفاق علماء کفر و شرک ہے۔ اس کا کہنے والا کافر مرتد ہے۔ اگرچہ اس کا مرتکب نیت عبادت کی نہ رکھتا ہو۔ کیونکہ شریعت کے احکام ظاہر عمل سے متعلق ہیں نہ نیات سے۔ البتہ ممکن ہے وہ عند اللہ سب جائز ہو، مگر احکام دنیا کے لحاظ سے اس کا مرتکب کافر شمار ہوگا۔ اور اس کی دلیل یہ ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی اپنی کتاب الاعلام بقواطع الاسلام میں شرح المواقف سے نقل فرماتے ہیں: جو کوئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو تسلیم کرے اور اس پر ایمان لائے اور بایں ہمہ آفتاب کو سجدہ کرے تو وہ بالاجماع مومن نہیں ہے اس لئے کہ شمس کو سجدہ کرنے سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مومن نہیں اور نہ وہ ایسی حرکت جو بظاہر کفر ہے اختیار نہ کرتا، اور ہمارے ہاں حکم باعتبار ظاہر کے ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کے مومن نہ ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہاں اگر ہم کو یہ امر محقق ہو جائے کہ وہ سجدہ عبادت کے خیال سے نہیں کرتا اور اس کا اعتقاد یہ نہیں کہ آفتاب

اس کا رب ہے اور اس کا دل ایمان سے بھر پور ہے تو دیانتہ اس کو کافر نہیں کہا جائے گا، لیکن قضاء اس کو کافر کہیں گے۔ اور تمام معاملات اس کے ساتھ وہی کئے جائیں گے جو کفار کے ساتھ کئے جاتے ہیں نیز کتاب الزواج مصنفہ ابن حجر میں ہے کہ جو شخص کوئی ایسا کام کرے کہ جو سوائے کافر کے کسی دوسرے سے صادر نہیں ہو سکتا تو وہ شخص کافر کہلائے گا (یعنی قضاء نہ کہ دیانتہ) اگرچہ وہ اعلانِ اپنے اسلام کو ظاہر کر رہا ہو، جیسے یہودیوں کے کفن میں یہود کے ساتھ ان کے طریقے پر زنا وغیرہ سپن کر جانا۔

حاصل کلام یہ کہ خدا کے غیر کو سجدہ کرنا عبادت کی نیت و ارادہ سے یا ایسی نیت کیفیت سے کہ یہ معلوم ہو کہ عبادت کے طور پر سجدہ کر رہا ہے اگرچہ وہ نیت عبادت کا منکر ہو تب بھی اس کا مرتکب بالاجماع کافر ہے۔

**سجدہ تعظیم کی دوسری صورت** | دوسرا سجدۃ التحیہ وہ ہے جس میں قصہ غیر اللہ کی عبادت کا نہ ہو اور سجدہ بھی ان اشیاء کی طرف نہ ہو جن کو کفار سجدہ کیا کرتے ہیں، اور جن کی طرف سجدہ کرنا شعار کافروں کا سمجھا جاتا ہے، اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، بعض نے کہا ہے کہ وہ بھی کفر ہے اور بعض نے اس کا انکار کیا، لیکن اس پر اتفاق ہے کہ یہ حرام قطعی اور گناہ کبیرہ ہے اور اس کا مرتکب قریب بالکفر ہو جاتا ہے، چنانچہ رد المحتار میں امام زلیعی سے منقول ہے، اس سجدہ کی وجہ سے کافر نہ ہو گا، کیونکہ اس کی نیت عبادت کی نہیں بلکہ تعظیم و تحیہ مقصود ہے، اور امام شمس الامتہ الشیخی میں فرماتے ہیں کہ اس سجدہ کی وجہ سے بھی کافر ہو جاوے گا کیونکہ غیر اللہ کو سجدہ بہ نیت تعظیم کرنا کفر ہے اور فتاویٰ ظہیر یہ میں لکھا ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے خواہ کسی نیت و قصد سے ہو انسان کافر ہو جاتا ہے، اور فقہیہ ابو جعفر فرماتے ہیں کہ جو سلطان اور بادشاہ کو سجدہ عبادت کی نیت اور عبادت سمجھ کر کرے تو وہ کافر ہو جاتا ہے اسی طرح وہ شخص جس نے سجدہ کیا (خواہ) اس وقت کوئی نیت نہ کی ہو (یہ قول جوہر غلطی میں منقول ہے)

عالمگیر کی کتاب الکرارہتہ میں لکھا ہے کہ جو بادشاہ کو سجدہ بہ نیت تعظیم کرے اور زمین کو بادشاہ کے سامنے چمے کافر نہیں ہوتا مگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے اور یہی قول مفتی بہ ہے۔

جو لوگ کہ سجدہ بخیر اللہ کو مطلقاً کفر کہتے ہیں تو اس میں ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ جیسے سجدہ آفتاب اور بت وغیرہ کو کرنا کفر ہے اسی طرح اپنے آباء و مشائخ کو مخلوقات میں سے اور اولیاء اللہ کے مزارات کو سجدہ کرنا کفر ہے، اسی طرح رخواہ کسی نیت و ارادہ سے ہو، اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ آباء و مشائخ کے لئے سجدہ کرنا پہلی امتوں کے لئے جائز تھا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے سجدہ کیا (تو چونکہ یہ امر مسلم ہے کہ کفر اور اس کے افعال کی اجازت کبھی کسی مذہب سماوی میں نہیں ہوتی) تو آباء و مشائخ عظام کو سجدہ بطور تعظیم کے کرنا مماثل و مشابہ سجدہ آفتاب و بت کے نہیں، کیونکہ آفتاب و بت و درخت وغیرہ جن کو سجدہ کرنا کفار کا شعار ہے ان کی تعظیم کا امر اور ثبوت ام اسلامیہ اور ملحقہ اور ادیان سماویہ میں کہیں بھی نہیں۔

الغرض چونکہ سجدہ تعظیمی آباء و مشائخ عظام کے لئے ہم سے پہلی شریعتوں میں مشروع تھا، اگرچہ ہماری امت کے لئے حرام قطعی ہو گیا مگر جو ادیان سابق کی بنا پر اس کا فعل کفر ہونا مشتبہ ہو گیا، اور یہ اصول مسلم ہے کہ اگر کوئی شبہ کسی کے کافر ہونے میں واقع ہو جائے تو اس پر حکم کفر ہونا جاری نہیں کیا جائے گا، لہذا جو آباء یا مشائخ کو سجدہ تعظیمی کرے اس پر حکم کفر نہیں لگایا جائے گا، اگرچہ وہ شخص کافر ہونے کے قریب ہو جاتا ہے (کتاب الاعلام ص ۳۳ ج ۳)

دین اسلام کی شرک سے حفاظت | جمال الشریاک نے اس امت مرحومہ کو طرح طرح کی نعمتیں اور فضیلتیں عطا فرمائیں اور کتنی خیر امت پر فرما کر اس امت کی شان کو دو بالا کیا ہے، اسی طرح اس امت کے ساتھ نہایت رحمت کا معاملہ فرمایا ہے اور اس امت پر ایسے احکام نازل کئے

ہیں جس سے کرامت کی گمراہی سے مکمل حفاظت ہو۔ اور جب کسی چیز کو ممنوع کرنا منظور ہوا تو اس شے کے لوازمات اور وہ تمام چیزیں حرام کر دی گئیں جو کہ اس شے تک پہنچنے کا ذریعہ ہو سکتی تھیں۔ مثلاً زنا کو حرام کیا تو اس کے ساتھ ہی اس حرام فعل کی طرف دعوت دینے والی اشیاء کو بھی ناجائز قرار دیا۔ بڑی پرستی حرام کی گئی تو ساتھ ہی جاندار کی تصویر بنانا اور رکھنا یہاں تک کر دیکھنا بھی ناجائز قرار دیا گیا۔ اور چونکہ آفتاب پرست لوگ سورج کو صبح شام پوجتے تھے لہذا سورج کے نکلنے کے وقت فجر کی نماز اور سورج کے ڈوبنے کے وقت عصر کی نماز کو ممنوع قرار دیا۔ محض اس وجہ سے کہ آئندہ کہیں لوگ یہ خیال نہ کرنے لگیں کہ یہ نمازیں سورج کی تعظیم کے لئے ہیں اور شرک کی برائی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

بلکہ ہماری روشن شریعت میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ الفاظ میں بھی اہل شرک سے ادنیٰ سی مشابہت پیدا نہ ہوتا کہ کبھی عرصہ دراز کے بعد یہ شرک کا سبب نہ بن جائے۔ اور پہلی امتوں کی طرح یہ امت بھی ہلاک نہ ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا کہ غلام اپنے آقا کو یا رب کہہ کر نہ پکارے، اُدھر آقا کو بھی روک دیا گیا کہ وہ اپنے غلام کو یا عبدی کہہ کر آواز نہ دے۔

ان احکام ہی کی برکت سے یہ امت مرحومہ باوجود یکہ اپنی عمر کی چودھویں صدی ختم کر چکی ہے مگر دین میں زیادتی و نقصان اور شرک و کفر میں بفضلہ تعالیٰ ایسی مبتلا نہیں ہوئی جیسے پہلی امتیں، اور اللہ کے وعدے کے مطابق۔ یشہ حفاظت میں رہے گی۔ اِنَّا نَحْنُ مُزِلُّوْنَ اِلَیْہِمْ وَاِنَّا لَکَ خَفِیُّوْنَ۔

مکمل حفاظت کی یہ نعمت اس امانت والی امت ہی کے لئے مخصوص ہے پہلی امتوں میں یہ نعمت احکام کے اعتبار سے کمال کی حد تک نہیں تھی۔ حرام چیزوں کی طرف دعوت دینے والی اشیاء حرام نہ تھیں۔ چنانچہ ان کے لئے تاشیل اور تصاویر کا استعمال مباح تھا۔ انہوں نے اس میں زیادتی کی اور ہر نامور انسان کی تصویر کی تعظیم اور عبادت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ کفر و شرک میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے علاوہ

بھی ہزار ہا مثالیں اس کی موجود ہیں۔

الغرض اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ تحقیق اور حق سجدہ تعظیمی کے بارے میں یہ ہے کہ تعظیمی سجدہ فی نفسہ کفر و شرک نہیں ہے۔ اسی وجہ سے پہلی امتوں میں جائز تھا۔ البتہ کفر و شرک کا ذریعہ ضرور ہے اور صورت میں بھی کفر کا فعل ہے اور اسی وجہ سے یہ سجدہ تعظیمی پہلی امتوں میں اور پہلے زمانے میں شرک کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اور وہ لوگ اس کی وجہ سے کفر میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ دنیا میں عذاب الہی میں گرفتار ہوئے اور آخرت میں ہمیشہ کے عذاب کے مستحق ہوئے۔ پس خداوند قدوس کی بے پایاں رحمت اور لطف و کرم کا تقاضا ہوا کہ اس بہترین امت پر انعام کیا جائے اور ہدایت کو ہمیشہ باقی رکھنے اور گمراہی سے نجات کے لئے یہ مناسب ہے کہ کفر و شرک کے ذریعوں کو بھی ناجائز اور ممنوع قرار دیا جائے۔ اگرچہ کسی ذریعہ کا کفر و شرک کے ساتھ دور کا تعلق ہو۔ اسی وجہ سے تعظیمی سجدہ کا جواز منسوخ ہو گیا اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سجدہ تعظیم کو ہمیشہ کے لئے ممنوع قرار دیا گیا۔

الغرض میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہے۔ مَا يَنْبَغِي لِبَشَرٍ أَنْ يُسْجَدَ لِبَشَرٍ وَلَوْ صَلَحَ لِبَشَرٍ أَنْ يُسْجَدَ لِبَشَرٍ لَدَامَرْتُ الْمَرْءَ أَنْ تَسْجُدَ لِرِزْقِهِمَا مِنْ عَظْمٍ حَقَّهُ عَلَيْهِمَا۔

اور جو حدیث دس صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہو وہ موافق قول راجح و مختار منقول ہے۔ لہذا یہ حدیث بھی اعلیٰ درجہ کی متواتر حدیث ہو گئی۔ اگر کوئی اسے متواتر تسلیم نہ کرے تو مشہور ہونے کا منکر نہیں ہو سکتا۔ اور مشہور حدیث سے آیت کریمہ کا نسخ جائز ہے جیسا کہ کتب اصول میں وضاحت کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں اجماع امت یہی ہے کہ سجدہ تعظیمی حرام ہے اور کسی امام یا مجتہد یا فقیہہ کا زمانہ سلف اور خلف میں اس بارے میں اختلاف مذکور نہیں بلکہ اجماع تام

لے اس حدیث شریفین کے الفاظ اور ترجمہ پہلے گزر چکا ہے۔

اس کی حرمت پر ہے۔

**سجدة بیت اللہ** | پس اسی اصول کے مطابق بیت اللہ شریف کو بھی سجدہ کرنا کفر ہے۔ درمختار میں ہے **لَوْ سَجَدَ لِلْكَعْبَةِ لَفَسَّهَا كُفْرٌ** یعنی اگر کعبہ ہی کو سجدہ کیا تو کافر ہو جائے گا۔

علامہ ابن عابدین المعروف بابا شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔ یعنی اگر سجدہ اللہ کو ہو اور کعبہ کی طرف منہ ہو اس کا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور **كَانَ السُّجُودُ لِلنَّفْسِ الْكَعْبَةِ كُفْرٌ** یعنی اگر کعبہ ہی کو سجدہ کیا تو یہ کفر ہے۔  
(شامی جلد اول کتاب الصلوٰۃ)

اب جب کہ بیت اللہ شریف کے لئے سجدہ ناجائز ہے اور محبوب خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک قبر کے لئے سجدے کی اجازت نہیں تو کسی اور کی قبر کے لئے تو سجدہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا سجدہ یا رکوع تو بہت بڑی بات ہے ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے جھکنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔ **فِي الزَّاهِدِ أَوْ يُعْمَلُ فِي السَّلَامِ إِلَى قُرْبِ الرُّكُوعِ كَالسُّجُودِ** یعنی سلام کرتے وقت رکوع کے قریب جھک جانا سجدے کی طرح ہے۔

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ **أَلَا نَحْنُ لِلْإِسْلَامِ أَوْ لِغَيْرِهِ مَكْرُوكٌ وَلَا لَوْ أَنَّهُ لِيَشْبَهُ فِعْلَ الْفُجُورِ كَذَلِكَ فِي سُجُودِهِمْ أَوْ لَوْ كَانَ الْإِسْلَامُ عِنْدَ التَّحِيَّةِ وَبِهِ دَرَدَا لَتَهَيَّ كَذَلِكَ لَتَقَرَّرَ تَأْثُرُهُ** ۵۷۳۶۹، یعنی بادشاہ وغیرہ کے لئے بھی جھکنا مکروہ ہے کیونکہ یہ مجوسیوں کے فعل سے مشابہت رکھتا ہے جیسا کہ جواہر اخلاطی میں ہے کہ سلام کے وقت جھکنا مکروہ ہے اور اس پر منع وارد ہوئی ہے۔

**زیارت قبور** | بلاشبہ زیارت قبور جائز ہے بلکہ مستحب ہے کیونکہ انسان عبرت حاصل کرتا ہے اور آخرت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ دل نرم ہو جاتے ہیں۔ لیکن قبر والے ہی سے کوئی چیز طلب کرنا یا قبر کی طرف رُخ کر کے نماز

پڑھنا، قبر کو ہاتھ وغیرہ لگا کر اپنے بدن پر ملنا، قبر کو بوسہ دینا اور اس کا طواف کرنا وغیرہ افعال شریعت اسلامی میں ناجائز اور ممنوع ہیں۔ علماء حضرات کا فرض ہے کہ حسب توفیق عوام کو زیارت کرنے کا صحیح طریقہ بتلائیں، نہ یہ کہ جو کوئی بھی کہیں زیارت کے لئے جائے اس پر کفر و مشرک کے فتوے لگائیں۔ البتہ نا سمجھ اور بے علم لوگوں کو بے ہمار چھوڑ دینا بھی ظلم ہے کہ جو ان کے جی میں آئے کرنے لگیں اور محض قبروں کو اللہ کے سوا مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ کر سجدے کرنے لگیں اور مشرک میں مبتلا ہو جائیں، جیسا کہ مشرکین عرب کرتے تھے۔ وہ لوگ بعض ہستیوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اگرچہ یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں لیکن ان کا اللہ تعالیٰ سے ایسا تعلق ہے اور اس کے کارخانہ قدرت میں ایسا عمل و دخل ہے کہ وہ عوام کی تکلیفیں دور کر سکتے ہیں، دولت، عزت، صحت اور اولاد جیسی چیزیں دے سکتے ہیں پس ان کو خوش کرنے کے لئے ان کی عبادت اور پرستش کیا کرتے اور ان سے اپنی حاجتیں پوری کرنے کی درخواستیں کرتے، قرآن پاک نے ان کے اسی عقیدہ کو شرک قرار دیا۔ اللہ نہ کرے کہ ہمارے سادہ لوح عوام ایسے خرافات میں مبتلا ہو جائیں، پھر تو مشرکین عرب اور ان کے عقیدے میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا اور نتیجہ دنیا و آخرت کی تباہی اور نقصان کے سوا اور کیا ہوگا (اللهم تعوذ بک من ذلک)

**غیر اللہ کے لئے نذر** | نذر، ہمت اور قربانی عبادت میں سے ہیں۔ اور اسی لئے خاص اللہ ہی کا حق ہیں، اللہ کے سوا کسی کے نام پر نذر یا ہمت کا ماننا حرام اور ناجائز ہے۔ نہ ہی غیر اللہ کے نام پر ذبح یا قربانی کرنا جائز ہے۔ اس قسم کے سارے افعال مشرکانہ اور باطل ہیں، چنانچہ خلاصۃ الفتاویٰ صفحہ ۳۷۸ جلد ۴ میں ہے۔ النَّذْرُ لِغَيْرِ اللَّهِ حَرَامٌ وَذَنْبٌ مِنَ الْكُفْرِ لِأَنَّ هَذَا عِبَادَةٌ وَالْعِبَادَةُ لِغَيْرِ اللَّهِ كُفْرٌ غَيْرُ اللَّهِ کے لئے نذر حرام ہے، کیونکہ یہ کفر کی ایک قسم ہے، وہ اس طرح کہ نذر ایک عبادت ہے اور غیر اللہ کی عبادت کفر ہے۔

بحر الرائق اور رد المحتار میں ہے وَالتَّذَرُّ لِلْمَخْلُوقِ لَا يَجُوزُ لَهُ عِبَادَةٌ  
وَالْعِبَادَةُ لَا تَكُونُ لِلْمَخْلُوقِ رِشَائِي بَلَدَ كِتَابِ الصُّومِ، یعنی مخلوق کے نام پر نذر ماننا  
جائز نہیں، کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لئے نہیں ہو سکتی۔

غیر اللہ کے نام ذبیحہ | قرآن مجید میں چار مقامات پر غیر خدا کے نام ذبح کو حرام  
فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ  
الْمَيْتَةَ وَالَّذِمَّ وَلَحْخَهُ الْخَنْزِيرِ وَمَا اَهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ  
اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف حرام کیا ہے مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ جس پر  
غیر اللہ کا نام پکارا جائے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صحیفہ میں درج تھا لَعَنَ اللَّهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللَّهِ  
(رواہ مسلم) اللہ کی لعنت ہو اس پر جو غیر اللہ کی نیت سے جانور ذبح کرے۔

شریعت نے اس بارے میں اتنی احتیاط برتی ہے کہ جانور کو ضیافت اور  
مہمان نوازی کے علاوہ صرف کسی حاکم اعلیٰ کے سامنے اس کی تعظیم کے طور پر ذبح  
کرنے کو حرام قرار دیا ہے اور اس کے کھانے کو ناجائز بتایا ہے (دیکھئے جامع الرموز ص ۱۲۹)  
رد المحتار، مجمع الانهر، فتاویٰ بزالہ، زاہدی اور بحر الرائق وغیرہ میں یہ مسئلہ صاف اور  
تفصیل سے موجود ہے۔

مہمان کے لئے جانور ذبح کرنے میں کوئی اشکال (یا الجھن) نہیں، کیونکہ یہاں صرف  
مہمان کی عزت اور تکریم مراد ہوتی ہے، محض خون بہانا مقصود نہیں ہوتا۔ اسی طرح  
قصاب کا جانور ذبح کرنا گوشت حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے فقط خون بہانا  
مقصود نہیں ہوتا، جب کہ حاکم اعلیٰ وغیرہ کے لئے خون بہانا اصل مقصد ہوتا ہے  
اور گوشت کا درجہ دوسرا ہوتا ہے، اسی لئے اس کی تعظیم کی خاطر اس کے سامنے  
جانور کو ذبح کیا جاتا ہے۔

اب یہ قاعدہ واضح ہو گیا کہ جہاں خون بہانا اصل ہو اور گوشت کا حاصل کرنا  
دوسرے درجہ میں ہو تو وہاں غیر اللہ کے لئے ذبح کرنا حرام ہے۔ اور اگر گوشت کا

حصولِ اسل ہو جس کے لئے خون بہانا ضرورتاً ہو تو یہ جائز اور درست ہے۔  
**نا جائز یا مشتبہ رسم** | اس قاعدہ سے بھی معلوم ہوا کہ چارے ہاں جو رسم و رواج  
 کافی مدت سے چلے آ رہے ہیں کہ کسی سے معذرت اور  
 معافی مانگنے یا کسی سے امداد و نصرت طلب کرنے کی خاطر اس کے گھر کوئی جانور بکرا  
 وغیرہ لے جاتے ہیں اور اسے اپنے ہاتھوں اس کی چوکھٹ یا گھر میں فزع کرتے ہیں  
 تو ایسی مذکورہ کو اگر حرام بھی کہا جائے کم از کم مشتبہ تو ضرور ہے۔ لیکن اب سوال یہ ہے  
 کہ مجرم اپنے ساتھ بیسیوں شرفاء اور دوسرے لوگوں کو جبرگہ کے طور پر مظلوم اور مجرم  
 کے گھر لے جاتے ہیں تو ان سب کی مہمانی اور ان کے لئے تکلف کرنے کا بار مظلوم اور  
 مجرم کے سر کیوں تقویٰ دیا جائے۔

اس مشکل کا آسان حل یہ ہے کہ مظلوم اور مجرم کو کوئی جانور بکرا وغیرہ صدقہ  
 پیش کیا جائے اور مجرم اور جبرگہ والے اس کے فزع کرنے کے تکلف کی بجائے مظلوم  
 خریق کے صوابدید پر پھوڑ دیں، خواہ وہ اس کو اپنے پاس رکھے یا انہی مہمانوں کی تکرم  
 اور ان کو کھلانے کے لئے فزع کر ڈالے تو ایسی صورت میں ذبیحہ بلا اشتباہ حلال ہو جائیگا  
**ایصالِ ثواب** | اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے نام پر اور اللہ ہی کی رضا اور خوشنودی کے لئے  
 تلاوت کرے یا نوافل پڑھے، صدقہ و خیرات یا قربانی کرے اس  
 کا ثواب اپنے اقرباء، اساتذہ یا مشائخ کو بخش دے، یہ جائز ہے، ان کو یہ ثواب  
 پہنچ جاتا ہے۔

**نذر** | اسی طرح اگر کوئی اللہ کے نام پر نذر مانے مثلاً یوں کہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو  
 میں اللہ تعالیٰ کے نام پر نذر کو اتنی اتنی چیز دوں گا (البشرطیکہ زید مسکین ہو تو یہ  
 اسی طرح اگر کوئی یہ کہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں اللہ تعالیٰ کے نام پر اتنی رقم یا فلاں وغیرہ فلاں  
 شیخ یا بزرگ یا ناناقاہ یا مدرسہ وغیرہ کے فقراء پر تقسیم کروں گا اس کا ثواب فلاں شیخ یا بزرگ کو بخش دوں  
 گا تو بھی جائز ہے۔ البتہ اگر کام پورا ہو جانے کے بعد وہ اس متعین فقراء کے بجائے دوسرے  
 فقراء پر تقسیم کر دے تو اس کی نذر پوری ہو گئی اور اس کا ثواب اس شیخ یا بزرگ کو ملے گا۔

نذر بھی جانتے ہے، بلکہ اگر جس شے کی نذر مانی گئی ہے وہ اس مخصوص آدمی (زید) کو نہ بھی دیں، دوسرے فقراء کو دے دیں، تو بھی جانتے ہے، فقہاء کے اقوال میں تفصیل واضح طور پر موجود ہے۔

---

## باب دوم

# دست‌بوسی

## باب دوم

دست بوسی یعنی ہاتھ چومنا | کسی اللہ والے عالم یا زاہد کے ہاتھ پاؤں چومنے کے بارے میں فقہائے کرام کا کچھ اختلاف ہے بعض کے نزدیک جائز بلکہ مستحسن ہے جب کہ بعض کے نزدیک اگرچہ فی نفسہ جائز ہے لیکن بعض برائیوں کو روکنے کی خاطر منع فرماتے ہیں، وہ دو حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں، ایک تو وہ جسے ابن شیبہ وابن ماجہ وغیرہ نے نقل کیا ہے دوسری جامع ترمذی کی روایت ہے۔

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الرَّجُلُ يَتَأَيَّلُ أَخَاهُ أَوْ صَدِيقَهُ أَيْتَحَنِّي لَهُ؟ قَالَ لَا، قَالَ أَمِيلَتْنِي مُمًّا وَيَقِيلَتْنِي؟ قَالَ لَا، قَالَ فَيَأْخُذُ بِيَدِهِ وَيُصَافِحُهُ؟ قَالَ نَعَمْ، هَذَا أَحَدُ ثَلَاثٍ حَسَنٍ (الترمذی ج ۲ ابواب الادب) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی یا دوست سے ملے اور (تغلیط) جھکے؟ آپ نے فرمایا نہیں (دوبارہ سوال کر کے) کہا کہ اسے گلے لگاتے اور بوسہ دے؟ فرمایا نہیں۔ (انہوں نے تیسری بار) کہا اس کا ہاتھ پکڑے اور مصافحہ کرے؟ فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "ہاں"۔

احادیث و آثار سے جواز دست بوسی | لیکن بعض صحیح احادیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اجماع سے اس کا جواز بلکہ بعض اوقات مستحب ہونا بھی ثابت ہے، چند احادیث و آثار کو پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) ترمذی میں حضرت زبیر بن عارث رضی اللہ عنہ کے مدینہ منورہ میں آنے کی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے، حدیث کے آخر میں وہ فرماتی ہیں کہ نَاعَفَتُنَا

وَقَبْلَهُ: یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ) کو گلے لگایا اور چومایا۔  
(الترمذی البواب الادب)

(۲) سنن ابی داؤد میں عبد القیس کے وفد کے بارے میں حضرت زارع بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ہم مدینہ منورہ پہنچے تو ہم اپنی سواریوں سے جلدی جلدی اترے۔ فَتَقَبَّلَ يَدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجُلًا: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں مبارک کو بوسہ دیا۔

اسی قصہ کو سنن ابی داؤد میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بھی نقل کیا گیا ہے جس میں ہے کہ قَدْ كُنَّا مِنْ الْيَتَمَى صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَقَبَّلَنَا يَدَيْهِ: یعنی ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا۔  
(ابوداؤد کتاب الادب ج ۲)

اسی قصہ کو طبرانی نے معجم کبیر اور اوسط میں حضرت مزیدہ بن عبدی اور نافع عبدی رضی اللہ عنہما کی سند سے بھی نقل کیا ہے (کذا فی مجمع الزوائد ج ۹ ص ۳۹۰)  
(۳) طبرانی نے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب ان کی معافی کے بارے میں آیت نازل ہوتی تو آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے فَآخَذَ بِيَدَيْهِ فَقَبَّلَهَا: اور آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک پکڑا اور اسے چومایا (مجمع الزوائد ص ۴۲ ج ۸)

(۴) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ أَنَّهُ قَبَّلَ يَدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک چومے۔  
(مجمع الزوائد ص ۴۲ جلد ۸)

(۵) مجمع الفوائد جلد ۲ صفحہ ۱۴۲ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہاتھ مبارک چومے۔  
لَقَالَ التِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ غَرِيبٍ لَأَنصَرَفَ مِنْ حَدِيثِ التَّهْمَرِيِّ الْأَمْنِ هَذَا الْوَجْهَ۔  
عَنْ قَالَ التِّرْمِذِيُّ وَفِيهِ رِجَالٌ مِنْ عِبَادِ الْحَمِيدِ الْهَمَانِيِّ وَهُوَ ضَعِيفٌ۔  
عَنْ قَالَ التِّرْمِذِيُّ رَوَاهُ أَبُو بَلْعَلٍ وَغَيْرُهُ يَزِيدُ بْنُ أَبِي زَيْدٍ وَهَوَلِينَ الْحَدِيثَ وَبَقِيَّةُ رِجَالِهِ رِجَالُ الصَّحِيحِ۔

علیہ وسلم کو بوسہ دیا اور موصل کے رہنے والے سے بتایا کہ بڑی نرمی کے ساتھ بوسہ دیا (حیۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم ج ۲ ص ۵۸۳)

(۶) حضرت ابو لیلیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انس بن حنفیہ رضی اللہ عنہ بڑے خوش مزاج شخص تھے آپ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے بات کر رہے تھے اور انہیں ہنسارہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پہلو کو ایک لکڑی سے چھیڑا اس پر انس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بدلہ لے لو انہوں نے عرض کیا کہ آپ تو کڑوتے پینے ہوئے ہیں اور میرے جسم پر کڑوتے نہیں تھا راوی کہتے ہیں فَرَقَمَ عَنْ قَمِيصِهِ فَاحْتَضَنَهُ وَجَعَلَ يُقَبِّلُ كَشْحَةً تَوَّأَبَ صَلى اللہ علیہ وسلم نے قمیص مبارک اٹھا دی اور انس رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لپٹ گئے اور آپ کے پہلو کو بوسہ دینا شروع کر دیا اور کہا یا رسول اللہ امیرے ماں باپ آپ پر قربان ہو باتیں میں نے تو بدلہ سے اسی کام کا ارادہ کیا تھا مدت رک ج ۲ ص ۲۸۸ اس حدیث کو ابوداؤد نے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (دیکھئے ابوداؤد ج ۲ کتاب الادب باب فی قبلۃ الجسد)

(۷) ترمذی و نسائی وغیرہ میں صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو یہودی آئے اور انہوں نے آیات بتینا کے بارے میں سوال کیا۔ اسی حدیث میں یہ بھی ہے فَقَبَّلُوْا يَدَيْهِ وَرَجُلَيْهِ وَقَالُوْا اَلشَّهَادَةُ اِنَّكَ بِحَقِّكَ کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیا اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے بھی ہیں۔ ہذا حدیث حسن صحیح اس حدیث کو امام ترمذی نقل کر کے فرماتے ہیں کہ اس (یعنی بوسہ دینے) کے باب میں یزید بن اسود ابن عمر اور کعب بن مالک لہ قال الحاكم ہذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه ووافقه الذہبی فقال صحیح واخرجہ الطبرانی فی الکبیر عن انس بن حنفیہ وشدکانی کنز العمال ص ۲۰۸ ج ۲۔

رضی اللہ عنہم سے بھی روایتیں موجود ہیں (الترمذی الباب الادب)

(۸) سنن ابی داؤد وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث انک کی روایت ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے میری برأت اور صفائی قرآن مجید میں بھیج دی تو مجھے میرے والدین نے فرمایا کہ قَوْمِي فَقَبِلِي رَأْسِي الْبَيْتِي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٹھ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک کو بوسہ دے۔

(ابوداؤد کتاب الادب جلد ۲)

(۹) حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عمر اور ابن جابر رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً ابوداؤد وغیرہ نے شعبی سے مرسل روایت کیا ہے کہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جب حبشہ سے لوٹے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ قَالَ تَزَمَّاءَ وَقَبِلَ مَا بَيْنَ حَيْثُيْهِ تَوْحُضُورِ صَلي اللہ علیہ وسلم نے انہیں گلے لگایا اور ان کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا (ابوداؤد جلد ۲ کتاب الادب)

(۱۰) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا يُقْبِلُ عُثْمَانُ بْنُ مَذْحُجٍ وَهُوَ مَيِّتٌ حَتَّى رَأَيْتُ الدَّمْعَ تَسِيلُ كَرُثْمَانِ بْنِ مَطْعُونٍ كَوْبُوسَهُ دے رہے تھے جب کہ وہ وفات پا چکے تھے میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو بہ رہے تھے (ابوداؤد کتاب الجنائز ج ۱) اسی قسم کی روایت معاذ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی گئی ہے۔

اور اس حدیث کو امام ترمذی عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کر کے فرماتے ہیں۔  
وَفِي الْبَابِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ وَجَابِرٍ وَعَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالُوا إِنَّ  
أَبَا بَكْرٍ قَبِلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَضَّتْ. یعنی ابن عباس، جابر اور عائشہ

لے قال ابو عیسیٰ الترمذی فی الباب عن یزید بن الاسود و ابن عمر و کعب بن مالک و فی سنن ابن ماجہ عن صفوان بن عسال ان قوما من الیهود قبلوا بید النبی صلی اللہ علیہ وسلم ورجلیہ ابن ماجہ کتاب الادب  
صفحہ فی مجمع الزوائد عن معاذ بن ربیعہ قال رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل عثمان بن مظعون  
رواہ البزار و اسنادہ حسن (مجمع الزوائد باب قبل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج ۳ ص ۲۷۳)

رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیا جب کہ وہ رحلت فرما چکے تھے اور آخر میں فرماتے ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث حسن صحیح ہے۔

علامۃ البیہقی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد میں ایک طویل حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رحلت فرمانے کا واقعہ یزید بن ابی بنوس رضی اللہ عنہ کی روایت میں مسند امام ضیل رحمہ اللہ وغیرہ سے نقل کیا ہے جس میں بیان ہے۔

ثُمَّ جَاءَ أَبُو بَكْرٍ فَرَفَعَ الْحِجَابَ فَنَظَرَ إِلَيْهِ فَقَالَ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ مَاتَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ أَتَى مِنْ قِبَلِ رَأْسِهِ وَحَدَرَ فَأُفٍّ قَبْلَ جِبْهَتِهِ ثُمَّ قَالَ وَابْتَدَأَ ثَقْرَةً رَفَعَ وَحَدَرَ فَأُفٍّ وَقَبْلَ جِبْهَتِهِ وَقَالَ وَاصْصِفِيَا لِي ثَقْرَةَ رَأْسِهِ وَحَدَرَ فَأُفٍّ وَقَبْلَ جِبْهَتِهِ وَقَالَ وَاخْلِيَا لَهُ..... قَالَ الْهَيْثُمِيُّ رَحِمَهُ اللَّهُ فَرَجُلٌ أَتَمَدَّتْ ثَقَاتُ رِمَحِ الزَّوَادِ ص ۳۲۱ تا ۱۹۷ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور پردہ اٹھایا آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھا اور فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما گئے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر ہانے آکر اپنا منہ جھکایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک کو چومنا پھر کہا اے میرے نبی! پھر اپنا سر اٹھایا اور پھر منہ جھکا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک کو بوسہ دے کر کہا اے میرے خالص دوست! پھر (تیسری مرتبہ) سر اٹھایا اور پھر منہ جھکا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک کو بوسہ دیا اور فرمایا اے میرے خلیل!۔

یہاں تک تو صرف وہ روایات اور واقعات بیان کر دیئے گئے ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو بوسہ دیا یا کسی اور نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چوما۔ اب بعض ایسے واقعات اور آثار پیش کئے جاتے ہیں جن میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور دوسرے سلف صالحین نے ایک دوسرے کی دست بوسی کی ہے اور ان کو کسی نے منع نہیں کیا ہے۔

(۱۱) حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ الادب المفرد میں حضرت صہیبؓ سے روایت

کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پیر چومتے تھے (باب تقبیل الرجل)

(۱۲) تمیم بن سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لائے، ان کا استقبال حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مصافحہ کیا اور ان کا ہاتھ چوما، اس حدیث کے آخر میں ہے کہ حضرت تمیم رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ ہاتھ کا چومنا سنت ہے۔

(۱۳) طبرانی نے یحییٰ بن الحارث الزماری سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ میں وائل بن اسقع رضی اللہ عنہ سے ملا، ان سے کہا کہ آپ نے اس ہاتھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں میں نے عرض کیا تو آپ اپنا ہاتھ مجھے دیکھتے تاکہ میں اسے بوسہ دوں تو انہوں نے میری درخواست کو منظور کر لیا اور میں نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا (رواہ الطبرانی)

(۱۴) اور طبرانی نے محمد اوسط میں جتید سند سے سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، **بَالَيْتُ الْبَيْتَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِي هَذِهِ فَقَبَّلْنَا هَا فَلَمْ يَنْكُرْ ذَلِكَ** یعنی میں نے اسی ہاتھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تو ہم (سننے والوں نے) ان کا یہ ہاتھ چوما اور انہوں نے (یعنی سلمہ بن اکوع) نے اس (چومنے) کو بڑا نہ مانا۔

(رواہ الطبرانی فی الاوسط)

(۱۵) حضرت عمار بن ابی عمار رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت زبیر بن ثابت رضی اللہ عنہ ایک روز سوار ہونے لگے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے (تکبر یا) ان کے گھوڑے کی رکاب تھام لی، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے! آپ ہٹ جائیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ

لے اخرج عبد الرزاق والخرازمی فی معارج الاطلاق والبیہقی وابن عساکر کذا فی کنز العمال ج ۹ ص ۲۲۰ لے رواہ الطبرانی وغیرہ الملک القاری لم اعرفه وبقیۃ رجال ثقات کذا فی مجمع الزوائد ج ۸ ص ۴۲ لے قال الترمذی وفی الصغیر من

البیہقۃ رواہ الطبرانی فی الاوسط ورجالہ ثقات (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۱۳۲)

نے فرمایا ہیں اپنے علما اور بڑے لوگوں کے ساتھ اسی طرح کرنے کا حکم دیا گیا ہے  
یہ سن کر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ذرا مجھے اپنا ہاتھ تو دکھائیے، حضرت ابن  
عباس (رضی اللہ عنہ) نے اپنا ہاتھ نکالا تو حضرت زبیر نے اس کو چوم لیا اور کہا کہ میں  
اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے ساتھ اسی طرح کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۱۶) بیہقی وغیرہ نے غزوہ روم کا طویل واقعہ حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت  
کیا ہے اس میں ہے کہ عبد اللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں سمیت لوٹ کر حضرت  
عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے اور جب پوری سرگزشت سنائی تو حضرت عمر  
رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور ان کے سر کو بوسہ دیا۔

(۱۷) حضرت سفیان ثوری (رحمہ اللہ تعالیٰ) اسے روایت ہے کہ انہوں نے ایک  
مجلس میں بیان کیا کہ عالم اور سلطان عادل کی دست بوسی سنت ہے، اسی مجلس میں  
عبد اللہ بن مبارک موجود تھے وہ کھڑے ہوئے اور ان کے سر کو بوسہ دیا۔

مذکورہ بالا روایات سے یہ بات ابھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ متقی عالم یا  
شیخ کے ہاتھ کو بوسہ دینا فی نفسہ جائز بلکہ بعض اوقات مستحسن ہے اور حضرت  
انسؓ کی روایت جس سے ممانعت معلوم ہوتی ہے، اول تو وہ مذکورہ بالا روایات کو  
منسوخ نہیں کر سکتی کیونکہ اس حدیث کو ناخ ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل یا قرینے  
کی ضرورت ہے، یہاں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ اور خلفائے راشدین  
(رضی اللہ عنہم اجمعین)، اوترا بعین تک سے جواز بلا بحیر ثابت ہے، دوسرے یہ کہ  
خود اسی حدیث میں ممانعت کا ایک قرینہ موجود ہے وہ یہ کہ سوال ایک عام دوست  
یا مسلمان کے بارے میں پوچھا گیا ہے کسی متقی عالم یا سلطان عادل کے بارے میں  
نہیں، پس یہ ممانعت خاص صورت میں ہے اور یہ بات بعید از تاویل اور

لے اخرج ابن عساکر کنز العمال ص ۳۹۶، ۱۳۶، اخرج البيهقي وابن عساکر کنز العمال ج ۴، ص ۳۱۱  
و حياة الصحابة ۲۱۹، مله في قباين التقاتق للملازم عثمان بن علي الزليحي، وقال سفیان الثوري تقبيل يد العالم  
يد السلطان العادل سنة فقام عبد الله بن مبارك فقبل راسه (تبيين التقاتق ص ۵۵ ج ۶ کتاب الکرامۃ)

محض قیاس آراتی نہیں۔

**چومنے کے اسباب و محرکات** | کیونکہ بوسہ دینے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔

(۱) نفسانی شہوت سے چہرہ وغیرہ چومنا جو کہ اپنی بیوی یا مملوکہ کنیز کے علاوہ کسی اور کے سارے فقہائے امت کے نزدیک ممنوع اور ناجائز ہے۔

(۲) بزرگانہ شفقت کی وجہ سے مثلاً والدین اپنے بچوں کو چومتے ہیں یا کوئی اپنے چھوٹے بھائی وغیرہ کو پیشانی پر بوسہ دیتا ہے جسور صلی اللہ علیہ وسلم سے حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے بدن کو بوسہ دینا اور اسی طرح زید بن حارثہؓ اور جعفر بن ابی طالب کی پیشانی کو بوسہ دینا ثابت ہے۔ یہ بھی بلا اختلاف جائز ہے۔

(۳) تعظیم و تحکیم کے لئے علماء و مشائخ کے ہاتھ یا پیشانی کو چومنا بہ سبب ان کے دینی شرف کے اس کا جواز تو مذکورہ بالا روایات سے ثابت ہی ہے۔

(۴) حصول دنیا کے لئے مثلاً کسی مالدار آدمی یا صاحب اقتدار کے ہاتھوں کو چومنا

یا محض رسماً ایک دوسرے کے ہاتھ اور پیشانی کو بوسہ دینا۔ یہ ناجائز اور ممنوع ہے۔

(۵) حکم شریعت کی وجہ سے مثلاً حجر اسود کو بوسہ دینا جو بالاتفاق جائز اور مستنون ہے

یہ اسباب سمجھ لینے کے بعد یہ بات بآسانی واضح ہو جاتی ہے کہ منع والی حدیث

کو صرف پہلی اور چوتھی قسم پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ خود منع والی حدیث کے راوی

حضرت انسؓ کے بارے میں امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں نقل کیا ہے کہ حضرت

ابن جبر عان رضی اللہ عنہ نے انسؓ سے پوچھا کیا تم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے

ہاتھ سے چھوا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں، تو آپؐ نے انس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو

بوسہ دیا (الادب المفرد باب تقبیل الید ص ۲) اب تو کوئی شک نہیں رہتا کہ مخالفت

فقط مذکورہ دو صورتوں کے ساتھ خاص ہے۔ ورنہ انس رضی اللہ عنہ حضرت ثابت

رضی اللہ عنہ کو کبھی دست بوسی کی اجازت نہ دیتے۔ پس منع اور جواز دونوں اقسام کی

احادیث میں موافقت اور تطبیق ہو سکتی ہے اور کوئی تضاد یا تعارض باقی نہیں رہتا۔

## فقہاء کا مسلک

اسی تاویل کی بناء پر فقہاء اور علماء کرام نے مشائخ و علماء کی دست بوسی کو جائز اور مستحسن قرار دیا ہے چنانچہ علامہ ابو بکر بن المسعود الکامانی (المتوفی ۵۸۷ھ) بدائع الصنائع صفحہ ۱۲۴ جلد ۵ کتاب الاستحسان اس مسئلے کے بارے میں (مختصراً) یوں لکھتے ہیں۔

چومنے اور گلے لگانے میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ نے فرمایا کہ کسی مرد کے لئے دوسرے مرد کے منہ ہاتھ یا کسی اور عضو کو چومنا یا اس سے مخالفت کرنا مکروہ ہے۔ جب کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک کوئی مخالفت نہیں اور دلیل میں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ والی روایت پیش کرتے ہیں کہ جب وہ حبشہ سے واپس ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں گلے لگایا اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل کم از کم حلال و مباح ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ روایت کیا گیا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سفر سے واپس آتے تو ایک دوسرے کو بوسہ دیتے اور گلے لگاتے تھے۔ اس کے برعکس ابو حنیفہؒ اور محمدؒ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا آپس میں ایک دوسرے کو چومنا کہیں؟ فرمایا نہیں۔ پوچھا گیا کہ ایک دوسرے سے مخالفت کیا کریں کہا نہیں۔ پھر سوال کیا گیا کہ کیا آپس میں مصافحہ کیا کریں، تو فرمایا ہاں۔

شیخ ابو منصور (ماتریدی) نے فرمایا کہ مخالفت اس صورت میں مکروہ ہے جبکہ ایسے طرز پر ہو جو شہوت کے ساتھ عریانی کی حالت میں کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اس سے (محض) اکرام اور احسان مقصود ہو تو مکروہ نہیں۔ اور یہی حکم بوسہ دینے کا ہے جو بوسہ شہوت کے بوسہ کی مانند ہو وہ تو ممنوع ہے ورنہ مباح (جائز) ہے اور ابو یوسفؒ نے جن حدیث سے جواز کا قول اختیار کیا وہ اسی صورت پر محمول ہے کہ اس میں شہوت کا خطرہ یا مشابہت نہ ہو۔

(۲) بحر الرائق میں بحوالہ نوادر لکھا ہے کہ عالم اور سلطان عادل کی دست بوسی میں مخالفت نہیں۔ جیسے کہ سفیان ثوری رحمہ اللہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ عالم

اور سلطان عادل کے ہاتھ کو بوسہ دینا سنت ہے (بحوالہ رائق ج ۱ ص ۱۹۴)

(۳) قناوی عالمگیری میں ہے کہ ایک مرد کو دوسرے مرد کے منہ پر بوسہ دینا یا اس کے ہاتھ یا بدن کے کسی حصہ کو چومنا ابو حنیفہؒ اور محمدؐ کے قول کے مطابق مکروہ ہے۔ اور ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ بوسہ دینے اور معانقہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور جب قمیص اور جبہ کے اوپر سے (معانقہ) ہو اور بطور احسان و اکرام کے بوسہ ہو، جو شہوت نہ ہو تو سب کے نزدیک جائز ہے۔

(۴) اور در مختار میں ہے وَفِي الْحَقَائِقِ لَوِ الْقُبْلَةُ عَلَى وَجْهِ الْمُبْتَدِ تَجَازُ بِإِلَهِ جَمَاعَةٍ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ص ۵۶۲۴۴) یعنی حقائق میں ہے اگر بوسہ دینا بطور احسان و اکرام کے ہو تو بالاجماع جائز ہے۔

(۵) علامہ شامیؒ فرماتے ہیں۔ قَدْ مَرَّ مِنَ الْخَائِنَةِ وَالْحَقَائِقِ أَنَّ التَّقْبِيلَ عَلَى سَبِيلِ الْيَدِ بِإِلَهِ جَمَاعَةٍ جَائِزٌ بِإِلَهِ جَمَاعَةٍ۔ یعنی مانیدہ اور حقائق کی روایت سے پہلے گزر چکا ہے کہ بوسہ دینا بطور احسان بغیر شہوت کے بالاجماع جائز ہے۔

(۶) حضرت شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانی (رحمہ اللہ) فتح الباری میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ دست بوسی میں فقہائے کرام مختلف ہو گئے ہیں۔ امام مالک نے اس کے جواز سے انکار کیا ہے اور ان روایات سے بھی جو اس میں آتی ہیں جب کہ دوسرے فقہاء حضرات نے اس کی اجازت دی ہے۔ اور انہوں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے استدلال کیا ہے جس وقت وہ لوگ جہاد سے واپس ہوتے، انہوں نے کہا یا رسول اللہ! ہم فرار ہونے والے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (الیسا نہیں) بلکہ تم حملہ پر حملہ کرنے والے ہو۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں مسلمانوں کی جماعت

لِهُ وَفِي الدَّرِّ الْخَاتِرِ لَا بَأْسَ بِتَقْبِيلِ يَدِ الرَّمْلِ الْعَالِمِ وَالتَّوَرُّعِ عَلَى سَبِيلِ التَّبَرُّكِ وَنَقَلَ الْمُصَنِّفُ عَنِ الْجَامِعِ اَذَلَّابِ  
بِتَقْبِيلِ يَدِ الْحَاكِمِ الْمُتَدِينِ وَالْسلطانِ الْعَادِلِ وَقِيلَ سَنَةِ مَجْتَبَى وَتَقْبِيلِ رَأْسِهِ اَيُّ الْعَالَمِ اَجُودُ كَمَا فِي الْبَزْازِيَةِ وَلَا  
رِخْصَةً فِيهِ اَيُّ فِي تَقْبِيلِ الْيَدِ لِغَيْرِهَا اَيُّ لَغَيْرِ عَالَمٍ وَعَادِلٍ، هُوَ الْخَاتِرُ مَجْتَبَى وَفِي الْمَحِيطِ اَنْ لَتَقْبِيلِ اَسْلَامِهِ وَ  
اَكْرَامِهِ جَازٍ وَانْ لِّلْيَدِ الدُّنْيَا كَرَاهٍ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ص ۵۶۲۴۵)

ہوں (عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کو بوسہ دیا۔

دست بوسی کے جواز پر چند احادیث نقل کر کے آگے فرماتے ہیں کہ الابہری فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ نے جو بوسہ کو مکروہ قرار دیا ہے یہ اس وقت ہے جب کہ تبرک اور بڑائی کی وجہ سے ہو۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے تقرب کے لئے ہو یا اس شخص کے علم یا شرافت کی وجہ سے ہو تو یہ جائز ہے۔ آخر میں امام محی الدین نووی رحمہ اللہ کے قول پر ختم کر کے لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ کسی کی دست بوسی اس کے زہد، صلاح یا علم یا شرافت یا صیانت (یعنی خود کو گناہوں سے بچانا، متقی ہونا) یا اسی طرح اور کسی دینی بات کی وجہ سے ہو تو مکروہ نہیں بلکہ مستحب ہے اور اگر دست بوسی اس کی مالداری اور اہل دنیا کے مال اس کی شان و شوکت اور مرتبہ مقام کی وجہ سے ہو تو یہ شدید ترین مکروہ ہے اور ابوسعید متوکی فرماتے ہیں کہ جائز نہیں۔

اور درمختار میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر دست بوسی تعظیم اور شرف اسلام اور اگر کی وجہ سے ہو تو جائز اور اگر دنیا کے حصول کے لئے ہو تو مکروہ ہے (دیکھتے الدلائل) علی ہامش رد المحتار صفحہ ۲۴۵ جلد ۵،

(۴) علامہ عینی (رحمہ اللہ تعالیٰ) نے تقبیل کے مسئلہ پر بہت مختصر اور جامع بیان کر کے آخر میں فرمایا ہے: "لیکن یہ سب کچھ جواز اس وقت ہے جب کہ (دست بوسی وغیرہ) بطور احسان اور اکرام کے ہو۔ اور جب یہ (دست بوسی وغیرہ) شہوت کی وجہ سے ہو تو میاں بیوی کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں۔"

ان عبارات سے صاف ظاہر ہے بوسہ دینے اور معانقہ میں البوسیفہ اور محمد (رحمہما اللہ) کا جو اختلاف منقول ہے وہ اسی صورت میں ہے جب کہ یہ افعال ایسے طریقے پر ہوں جن میں شہوت کا خطرہ اور اشتباہ پایا جاتے۔ اور جہاں یہ صورت نہ ہو اور نہ ہی حصول دنیا یا محض رسم مقصود ہو، تو سب کے نزدیک بلا کر بہت جائز ہے۔

**بوسہ کی دو صورتیں** | ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی از خود کسی کے ہاتھ وغیرہ کو چوم لے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص زید سے مطالبہ کرے کہ آپ ہاتھ یا پاؤں مجھے چومنے کے لئے دیں، کیا زید کے لئے جائز ہے کہ وہ ہاتھ یا پاؤں پھیلا کر لوگوں کو اس کا موقع دے؟ ایسی حالت میں بعض فقہائے کرام منع فرماتے ہیں کہ زید ہاتھ یا پاؤں پھیلائے کیونکہ یہ صورت ایک متکبرانہ فعل ہے جس سے تعجب پیدا ہو جانے کا احتمال غالب ہے، اگرچہ حقیقتہً اس میں تعجب اور عجب نہ بھی ہو، پس بعض نے تو زید کے لئے ہاتھ یا پاؤں پھیلانے کو مکروہ قرار دیا ہے اور بعض نے اصل فعل کے جواز پر نظر کر کے اس کو جائز فرمایا ہے البتہ از خود زید کے ہاتھ یا پاؤں چومنا بلا اختلاف جائز ہے۔

**ایک شبہ** | یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ دست بوسی وغیرہ اگر جائز بھی ہو جائے تو اگر اس کے لئے جھکنے کی صورت پیش آئے تو وہ انحناء یعنی جھکنے کی وجہ سے بھی مکروہ ہو جائے گا، لیکن یہ درست نہیں کیونکہ یہاں جھکنا چومنے کے لئے ہوگا، جھکنا خود مقصود نہیں، جیسے کسی کے ہاتھ سے کوئی چیز گر جائے اور کوئی جھک کر اُسے اٹھا لے، اس جھکنے میں کسی کو بھی کلام نہیں، حالانکہ یہ جھکنا شروع سے بھی زیادہ ہو جانا ہے، اس لئے کہ اس میں جھکنا مقصود نہیں بلکہ چیز اٹھانا مقصود ہے۔

**زمین بوسی** | فقہ کی کتابوں میں ایسے دو مسئلے اور بھی ہیں جن کی وضاحت مناسب ہے تاکہ مختلف مسائل آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں۔

لَعَنَ فِي السَّنَةِ: طَلَبُ مَنْ عَالَمٍ أَوْ زَاهِدٍ أَنْ يَدْفَعَ إِلَيْهِ قَدَمَهُ لِيَقْبَلَ لَإِيْخَصَ فِيهِ وَلَا بِجَبِيْبٍ إِلَى ذَٰلِكَ عِنْدَ الْبَعْضِ وَذَكَرَ بَعْضُهُمْ بِجَبِيْبٍ إِلَى ذَٰلِكَ. وَفِي رَدِّ الْمَحْتَارِ نَحْوُ قَوْلِهِ جَابِلًا أَوْ فَرَجًا لِمَا كَانُوا مِنْ رَجُلَاتِي النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَرَأَيْتَ إِنْ شِئْنَا أَنْ نَزِدَ دَابَّةً لِيَقْبِلَنَا فَقَالَ أَذْهَبَ إِلَى مَلِكِ الشَّجَرَةِ فَأَدْعَاهَا فَمَدَّ يَدَهُ إِلَيْهَا فَقَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْعُوكَ فَنُتِ حَتَّى سَلَّمَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهَا جَعَلِي فَرَجَتِ ثُمَّ أَذِنَ لِرَفِيقِهِ رَأْسَهُ وَرَجُلَيْهِ وَقَالَ كُنْتُ أَمْرًا إِذَا نَاسِجًا لِأَصْحَابِ الْأَمْرِ ثُمَّ أَمْرًا إِذَا نَاسِجًا لِرُجُلِهِمَا وَقَالَ صَاحِبُ الْأَسْنَادِ مِنْ رِسَالَةِ الشَّرْهْ نَوَالِي رَدِّ الْمَحْتَارِ ص ۲۳۵ ۱۵۶

(۱) ایک بیک کوئی شخص دوسرے آدمی سے مسافر کرنے کے بعد خود اپنے ہی ہاتھ کو چوم لے۔ اس فعل کو فقہائے کرام نے مکروہ اور ناجائز قرار دیا ہے۔

(۲) کسی عالم یا بزرگ کے سامنے زمین کو بوسہ دینا۔ فقہائے کرام اس کو حرام اور ممنوعہ فرماتے ہیں۔ ایسے کام کرنے والا اور اس پر راضی ہونے والا دونوں سخت مجرم اور گنہگار ہیں۔ کیونکہ یہ کام بتوں کے پوجنے اور عبادت کرنے سے مشابہت رکھتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر ہاتھ وغیرہ کو بوسہ دینا شہوت وغیرہ کے ساتھ ہو یا کسی جانب میں شہوت پیدا ہو جانے کا خطرہ یا اشتباہ ہو تو بالاتفاق اپنی بیوی یا زرخیز کنیز کے سوا کسی کے ساتھ جائز نہیں۔

(۳) چھوٹوں پر شفقت و رحم یا منتفی علماء اور بزرگوں کے اکرام اور تعظیم کے لئے بوسہ بالاتفاق جائز اور ثابت ہے بشرطیکہ جس کی دست بوسی کی جاتے اس کو اس عمل سے تکلیف نہ ہو۔ اور نہ ہی اس کے نفس میں تکبر و عجب پیدا ہوتا ہو۔ ایسی حالت میں دوسری جانب کے لئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں کو دست بوسی کا موقع دے۔

(۴) دنیاوی اقتدار اور حصول عزت کے لئے کسی کے ہاتھ پاؤں وغیرہ چومنا ناجائز و ممنوعہ (۵) محض رسم اور عادت کے طور پر بھی درست نہیں اور ناس میں حد سے تجاوز کرنا پابندی ہے کہ ہر وقت گلے ملنے لگیں یا بوسے دینے لگیں بلکہ کسی کے سفر سے واپسی یا رخصت کے موقع پر یا عرصہ دراز کے بعد ملاقات وغیرہ پر اللہ تعالیٰ و تبارک کی محبت کے غلبہ کی وجہ سے اور سادگی اور بغیر پابندی و بغیر تکلف کے علماء اور بزرگوں کے ہاتھ یا پیشانی کو بوسہ دینا جائز بلکہ مستحسن ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۴

لے وما یفعلوا الجہال من تعبیل بد نفسہ اذا التقی الغیر فهو مکروہ فلا رخصۃ فیہ وما یفعلون من تعبیل الارض  
بین یدی العلماء فحرام والفاعل والراضی بہ اثنان لانہ یشبہ عبادة الاوثان (تبیین المحتائق ص ۵۷) کتاب  
اکرامہ کہ فی الجہد والرائق والفتاویٰ السنیۃ واللہ اعلم بالصواب (غیر ما) ص ۲۴

## باب سوم

# قیام تکرمی و تعظیمی

# قیام

**قیام کی قسمیں** | کسی آدمی کے لئے کھڑا ہونا کی چند قسمیں ہیں۔  
 (۱) اول: کوئی سفر سے آنے والے کے استقبال کے لئے کھڑا ہو۔  
 یا آنے والے کو کسی چیز کی بشارت یا خوشخبری دینے کے لئے کھڑا ہو۔  
 یا پھر کسی مصیبت زدہ کے ساتھ ہمدردی اور تعزیت کی غرض سے۔  
 یا جگہ کے تنگ ہونے کی وجہ سے مجبوراً کھڑا ہونا۔  
 محبت کی وجہ سے (ایسے شخص کے لئے جس کے ساتھ محبت جائز ہو مثلاً  
 مسلمان بھائی۔

اور کسی کی مدد، اعانت یا خدمت کی نیت سے کھڑا ہونا مثلاً امرئیں کو سواری  
 سے اتارنا چڑھانا یا اتھامنا وغیرہ

قیام کی یہ سب صورتیں بالاجماع جائز ہیں، اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔  
 (۲) قیام کی دوسری قسم: کسی کے آگے ایسے طریقے سے کھڑا ہونا جیسے عجیبول  
 کا دستور تھا کہ کوئی بڑا آدمی بیٹھا ہوتا اور اس کے سامنے یا ارد گرد باقی لوگ کھڑے رہتے  
 قیام کی یہ صورت بالاتفاق ناجائز اور ممنوع ہے۔

(۳) تیسری قسم: کوئی شخص دل میں یہ چاہت اور خواہش رکھے کہ لوگ اس کے  
 لئے کھڑے ہو جائیں اس کے بارے میں شدید وعید آتی ہے اور بالاتفاق امت  
 یہ خواہش اور آرزو ناجائز اور ممنوع ہے۔

(۴) چوتھی قسم: کسی آدمی کے لئے صرف تعظیم و تکریم کے طور پر کھڑا ہونا، اس  
 صورت میں علماء کا اختلاف ہے لیکن یہ کوئی کفر و شرک جیسا شدید اختلاف نہیں بلاشبہ

نماز میں کھڑا ہونا عبادت ہے لیکن ہر قسم کا قیام عبادت نہیں ہو سکتا اور نہ ہی قُوَّةُ اللّٰہِ قَانِتِینَ کھڑے رہنا اللہ کے سامنے کے تحت لایا جاسکتا ہے اس لئے کہ نماز کی تمام حرکات و سکنات عبادت ہیں۔ اگر یہ ساری حرکات نماز سے باہر بھی مطلقاً عبادت یا عبادت کے مشابہ سمجھی جائیں تو اس طرح کسی کے سامنے دوزانو ہو کر التیحات کی صورت میں بیٹھنا بھی ناجائز ہو گا حالانکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ جبرائیل علیہ السلام آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دوزانو ہو کر بادب بیٹھے۔

علماء اور مشائخ وغیرہ کے سامنے دوزانو بادب بیٹھنا کسی کے ہاں بھی ناجائز نہیں، بالاجماع امت جائز بلکہ مستحب ہے۔

اسی طرح کسی کے سامنے مطلقاً قیام بھی ممنوع نہیں بلکہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے بہت سی صورتوں میں کسی کے لئے کھڑا ہونا بالاتفاق جائز بلکہ بعض اوقات مستحب ہے۔ مسلمان بھائی اور مہمان کے اکرام کا ہمیں حکم دیا گیا ہے اسی طرح اپنے بڑوں، علماء اور مشائخ کی توقیر اور تعظیم کا حکم بھی ہے۔

**احترام کا طریقہ** | اب ہم کسی کا احترام اور تعظیم کیسے کریں؟ احترام کے حدود کیا ہیں؟ شریعت اسلام نے ہمیں ان کے واضح جوابات دیئے۔ بعض جگہ روایات کے ظاہری تعارض اور دلائل کی بنا پر علماء میں کچھ اختلاف بھی پایا جاتا ہے اس قسم کے اختلافات کے لئے بھی فقہاء کے ہاں حدود متعین ہوتے ہیں بعض کے

لئے فاسد رکبتیہ الی رکبتیہ و وضع کفیر علی فخذیہ.... الی آخر الحدیث (رواہ البخاری و مسلم وغیرہما) لہ و عن ابن مسعود قال اذا کرم الرجل اخاه فانما یکرمہ ربه و مجمع الزوائد ص ۱۶ ج ۱) عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه قال من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیتقی اللہ و لیکرم جاره و فی روایہ من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ ثلاث مرات (رواہ احمد و مجمع الزوائد) لہ عن عبادہ بن الصامت ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لیس من امتی من لم یجعل کبیرہ الحدیث و عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لیس من امن لم یوقر الکبیر الحدیث (رواہ احمد و مجمع الزوائد ص ۱۴ ج ۱)

ہاں کوئی چیز سنت یا مستحب ہوتی ہے جب کہ دوسروں کے نزدیک وہ واجب یا اس کے برعکس مکروہ وغیرہ ہوتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ فقہائے کرام کے متعینہ حدود سے تجاوز نہ کریں اور ان کے اختلافات کو اپنے حدود کے اندر رہنے دیں۔  
الغرض قیام کی چوتھی قسم کے بارے میں علماء کا اختلاف صرف باتزاور مکروہ کی حد تک ہے۔ اور جو لوگ اسے مکروہ فرماتے ہیں وہ مندرجہ ذیل احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔

(۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لَوْ يَكُنْ شَخْصٌ أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانُوا إِذَا رَأَوْهُ لَوْ يَقُومُوا لِمَا يَعْلَمُونَ مِنْ كَوَاهِلِهِ لَذَلِكَ - هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ عَوَّيْتُ - ترمذی الباب الادب - یعنی صحابہ کرام کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی بھی محبوب نہ تھا اس کے باوجود جب صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کو دیکھتے تو آپ کے لئے کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پسند نہیں۔

(۲) ابو مجلز رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کھلے تو حضرت عبداللہ بن زبیر اور ابن صفوان رضی اللہ عنہم ان کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ فَقَالَ اجْلِسَا سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَتَشَلَّ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (روى الباب من ابْنِ أُمَامَةَ وَهَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ) (الترمذی الباب الادب) پس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ لوگ اس کے سامنے (تعظیماً) کھڑے ہوں پس وہ اپنا گھر جہنم میں بنالے۔

حضرت امام ترمذی اور دیگر حضرات فقہاء نے ان احادیث سے قیام کی ممانعت پر استدلال کیا ہے۔

اب جو حضرات جواز کے قائل ہیں وہ پہلی حدیث کے جواب میں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کا کھڑا ہونا بے تکلفی، شدید محبت و تعلق اور تواضع

کی بناء پر ناپسند تھا۔ اس کے جواب میں قیام سے منع کرنے والے حضرات فرماتے ہیں کہ بے تکلفی کا مطلب یہ نہیں کہ اکرام بھی نہ کیا جائے (اب صحابہ رضی اللہ عنہم کو بظاہر اکرام کرنے سے کون سی چیز مانع تھی؟) اور قیام کو جائز سمجھنے والے جواب یوں دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کراہیت طبعی کراہیت تھی نہ کہ شرعی کراہیت جس طرح کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پسند نہ تھا کہ سب سے آگے چلیں، حالانکہ آگے چلنا کسی کے نزدیک ناجائز نہیں ہے، تو یہاں بھی کراہت طبعی مراد ہے نہ یہ کہ شرعاً مکروہ ہے۔ دوسری حدیث کے جواب میں قیام کے موافقین فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں تو قیام کی خواہش کرنا ممنوع ہے، یعنی اگر کوئی یہ خواہش کرے کہ لوگ اس کے لئے کھڑے ہوں اور اس خواہش کی وجہ عجب و عجیب ہے، پس یہ خواہش تو بالاتفاق ناجائز اور حرام ہے جیسا کہ تیسری قسم کے بیان میں گورچکا

لیکن اس پر یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ ایک فقیہ صحابی ہیں انہوں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مبارک سے مانعت ہی مراد لی ہے اسی لئے تو انہوں نے منع فرمایا۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ اُن کے توضیح اور تقوٰی کی وجہ سے تھا۔ انہیں خوف تھا کہ کہیں وہ اس حدیث کی وعید میں نہ آجائیں، کیونکہ وعید اسی کے لئے ہے جس کے لئے قیام کیا جاتا ہے، کھڑے ہونے والوں کے لئے تو نہیں ہے۔ لیکن اس پر یہ شبہ کیا گیا کہ لوگوں کا کھڑا ہونا سبب بن جاتا ہے خواہش قیام کا، تو جس طرح خواہش قیام ممنوع ہے اسی طرح اس کا سبب بھی ممنوع ہے لیکن یہ شبہ درست نہیں، کیونکہ یہاں قیام کی خواہش ممنوع ہے چاہے لوگ از خود کھڑے ہوں یا نہ ہوں۔ اب اگر لوگ کسی آدمی کے لئے کھڑے نہ ہوں لیکن اس کی خواہش ہو کہ لوگ کھڑے ہوں تو یہ شخص اس وعید کے تحت آئے گا۔

بہر حال وعید صرف خواہش قیام پر وارد ہوتی ہے جس کی غرض لوگوں میں اپنے مرتبہ کو دیکھنا ہے جو کہ تفخر اور تکبر ہے۔

(۱۳) أَخْرَجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلًا عَلَى عَصَا فَمَثَلَهُ فَقَالَ

لَا تَقُومُوا كَمَا يَقُومُ الَّذِينَ هُمْ أَغْصَانٌ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ يَذْكُرُوا كِتَابَ اللَّهِ حَضَرُوا الْقُرْآنَ ۚ وَأُولَٰئِكَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ ۖ فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَاتٍ مِّنْهُ ۖ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ جَاهِلُونَ

رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصا پر ٹیک لگاتے ہوئے ہر تشریف لاتے تو ہم ان کے لئے کھڑے ہو گئے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس طرح ہمت کھڑے ہو جس طرح کہ بچی لوگ بعض کچھ (دوسروں کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(۴) حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لاتے تو حضرت ابو بکرؓ (اللہ ان پر رحم کرے) نے فرمایا کھڑے ہو جاؤ تاکہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس منافق کے بارے میں استغاثہ دائر کریں۔ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقَامُوا إِنَّمَا يَقَامُ لِلَّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَىٰ ۚ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی اور کے لئے نہیں کھڑا ہونا چاہیے صرف اللہ کے لئے کھڑا ہونا چاہیے۔

بلاشبہ یہ دونوں حدیثیں کھڑا ہونے کو واضح طور پر منع کرتی ہیں لیکن حدیث نمبر ۳ سے قیام کو ناجائز سمجھنے والے صرف وہ قیام مراد لیتے ہیں جو عجیبوں کا دستور تھا مثلاً ترکوں وغیرہ اقوام عجم کی یہ عادت تاربخ سے معلوم ہے کہ ایک (بڑا آدمی بیٹھا رہتا اور اس کے سامنے دوسرے کھڑے رہتے۔ اسی طرح طبرانی نے اوسط میں انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک ضعیف حدیث بھی نقل کی ہے۔ اِنَّمَا هَلَاكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِأَنَّهُمْ عَزَمُوا مَلُوكَهُمْ بِأَن قَامُوا وَهُمْ قُحُودٌ ۚ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

لہ روایہ احمد وغیرہ راویہ لم یسم وابن لہیعہ وثلقہ احمد وغیرہ وضعفہ یحیی القطان وغیرہ، وہ حسن الحدیث علی مافی شذرات الذہب لابن العمامہ وقد ترجمہ فی نحو صفحہ (مجمع الزوائد ص ۴۰، ۸۶) تہ چنانچہ علامہ ابن قیم فرماتے ہیں۔ والثالث ان یكون المقتدی بالس والناس قاتلین فذا طریق الاعاجم۔ یعنی تیسرا یہ ہے کہ مقتدی آدمی بیٹھا ہو اور لوگ اس کے سامنے یا ارد گرد کھڑے ہوں یہی دستور عجیبوں کا ہے (عرف الشذی علی سنن الترمذی کتاب البواب الادب) تہ روایہ الطبرانی فی الاوسط وفیہ الحسن بن قتیبہ وہومترک۔

نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اس طرح تباہ ہو گئیں کہ وہ اپنے بادشاہوں کی تعظیم کرتے تھے اس طرح کہ وہ تو کھڑے رہتے اور بادشاہ بیٹھے رہتے، اسی مسلم کی ایک صحیح حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حالت بیماری میں بوجہ عذر بیٹھے ہوتے نماز پڑھ رہے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز میں مشغول رہتے تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوتے تو فرمایا اِنَّ كَذَّبْنَا الْقَائِلُ الْمَلُوكُنْ فَعَلْ فَارِسَ وَالرُّومَ يَقُومُونَ عَلَىٰ مُلُوكِهِمْ وَهُمْ قَعُودٌ الْحَدِيثُ مُسْلِمٌ كِتَابُ الصَّلَاةِ ج ۱ ص ۱۷۱) کہ تم عنقریب فارس و روم کے لوگوں کا فعل کرو گے، کھڑے ہوتے ہیں (ارد گرد) اپنے بادشاہوں کے اور وہ (بادشاہ) بیٹھے ہوتے ہوں۔

ان سب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ممنوع وہ قیام ہے جو عجمیوں کا دستور ہے کہ کوئی شریف تو بیٹھا رہے اور عام لوگ اس کے ارد گرد تعظیم کے لئے کھڑے ہوں۔

قیام کے مخالفین کہتے ہیں کہ صحابہؓ کا کھڑا ہونا عجمیوں کی طرح تو نہیں تھا بلکہ وہ محض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و تکریم کے لئے کھڑے ہوتے تھے (اور پھر یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود ان کے اخلاص کے، انہیں گویا منع فرمادیا۔

اس کے جواب میں قیام کو جائز کہنے والے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو عجمیوں کی طرح کھڑے ہونے کی خبر دے رہے تھے اور (صرف) اسی طریقہ سے منع فرما رہے تھے (یعنی ان کی نقل سے منع کر رہے تھے) پس ادب و عزت سے کھڑا ہونا جائز ہے کیونکہ اس کی وجہ صرف خلوص و محبت ہے۔

باقی رہ گئی حدیث نمبر ۴۸، اس کے بارے میں قیام کو جائز سمجھنے والے جواب دیتے ہیں کہ یہ حدیث بہت کمزور ہے، اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے پھر بھی یہ عجمیوں کے قیام پر محمول ہے کیونکہ قیام کی وہ صورتیں جو قسم نمبر ۱ کے ذیل میں بیان

ہو چکی ہیں بالاتفاق جائز ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قیام ممانعت صرف اسی قیام کی ہے جو عجمیوں کی رسم ہے جس کی طرف متحدہ احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے اور وہ قیام بالاتفاق ناجائز اور ممنوع ہے۔

اب جو علماء حضرات قیام کے جواز کے قائل ہیں وہ مندرجہ ذیل احادیث کو بطور استدلال پیش کرتے ہیں۔

حدیث نمبر ۵: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے لوگوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گفتگو اور نشست و برخاست میں اتنا زیادہ مشابہت رکھتا ہو جتنا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رکھتی تھی، اِذَا دَخَلَتْ عَلَيْهِ قَامَ إِلَيْهَا فَأَخَذَ بِيَدِهَا فَقَبَّلَهَا وَأَجْلَسَهَا فِي مَجْلِسِهِ وَكَانَ إِذَا دَخَلَ عَلَيْهَا قَامَتْ إِلَيْهِ فَأَخَذَتْ بِيَدِهِ وَأَجْلَسَتْهُ فِي مَجْلِسِهَا (ابوداؤد کتاب الادب ۱۲۶)

یعنی جس وقت فاطمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لئے کھڑے ہو جاتے، اس کا ہاتھ پکڑتے اور بوسہ دیتے اور اپنے بیٹھے کی جگہ پر اسے بٹھا دیتے، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس جاتے تو وہ آپ کی طرف کھڑی ہو جاتی، آپ کا ہاتھ مبارک پکڑتی اس کو بوسہ دیتی اور آپ کو اپنی جگہ پر بٹھا دیتی۔

قیام کے مخالفین فرماتے ہیں کہ یہ قیام دونوں جانب سے قیام محبت اور قیام استقبال ہے جو بالاتفاق جائز ہے، لیکن قیام کو جائز سمجھنے والے اس جواب کو رد کر کے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام تو قیام محبت ہو سکتا ہے لیکن فاطمہ رضی اللہ عنہا کا قیام تو تعظیم و تکریم ہی کے لئے ہو سکتا ہے، لیکن اس بات پر شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا کا قیام بھی قیام محبت و استقبال مان لیا جائے تو یہ بعید از قیاس بات نہیں، اگرچہ اس میں تعظیم و تکریم کا قوی احتمال موجود ہے۔

قیام کے قائل حضرات زید بن حارثہ، عکرمہ بن ابی جہل، عدی بن حاتم، اسامہ بن شریک اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ کی روایات و واقعات سے بھی استدلال کرتے ہیں

جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

- (۶) حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جب مدینہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر معالقبہ کیا اور پیشانی پر بوسہ دیا (رواہ الترمذی ج ۲ ابواب الادب)
- (۷) اور جب عکرمہ رضی اللہ عنہ یمن سے واپس ہو کر مدینہ منورہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے کھڑے ہوئے، گلے لگایا (رواہ الطبرانی)
- (۸) حدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوتے یا حرکت فرماتے۔
- (۹) اور حضرت اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھڑے ہوتے اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک کو بوسہ دیا۔

(۱۰) اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اٹھے اور ان کے دست مبارک کو چومے۔

(۱۱) اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ جب قبول ہوئی، اسی قصہ میں آیا ہے کہ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اٹھ کر دوڑے اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے ساتھ مصافحہ کیا اور انہیں مبارک باد دی۔

اسی طرح کے اور بھی بہت سے واقعات اور روایتیں احادیث کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ لیکن قیام کے مخالفین فرماتے ہیں کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام، سفر سے آنے کی خوشی کی وجہ سے تھا اور حدی وعکرمہ رضی اللہ عنہم

۱۔ مجمع الزوائد ص ۳۸۵ ج ۹ ۲۔ مشکل الآثار ص ۲۷ ج ۲۔

۳۔ فتح الباری ص ۴۵ ج ۱۱ ۴۔ وقال سندہ قوی۔

۵۔ فتح الباری ج ۱۱ ص ۴۵۔

۶۔ مشکل الآثار ص ۲۷ ج ۲۔

اپنے اپنے علاقہ کے رئیس تھے، اور آپ نے تالیف قلب کے لئے قیام فرمایا اور ان کی مدارات کی تاک وہ مسلمان ہو جائیں یا پھر اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آثار سے ان کو اس کا متوقع پایا، اس لئے کھڑے ہوتے، اسی طرح کے اور احتمالات بھی ہو سکتے ہیں۔ الغرض اسی طرح کی تمام احادیث اور روایات کو قیام استقبال، قیام محبت، خوشی اور بشارت کے لئے کھڑا ہونا یا تعزیت کے لئے قیام قرار دے کر استدلال کرتے ہیں۔ اور یہ احتمالات اتنے بعید بھی نہیں ہیں، اگرچہ بعض روایات میں اکرام کا پہلو زیادہ واضح ہے۔

(۱۲) جیسا کہ حضرت ہلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب باہر تشریف لاتے تو ہم آپ کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے حتیٰ یَذْخُلَ بَيْتَهُ حَتَّى يَكُنَّ كَأَنَّكُمْ تَشْرِيفُ زِلْ جاتے۔

قیام کے مخالفین اس کے کئی جوابات دیتے ہیں، یہ قیام بوجہ ضرورت تھا، ہر شخص اپنے اپنے کام کے لئے جانا چاہتا تھا، یا چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا دروازہ مسجد میں تھا اور مسجد فراخ نہ تھی اس لئے صحابہ رضی اللہ عنہم کھڑے ہو جانا کرتے تھے کہ آپ باسانی گھر تشریف لے جا سکیں، یا ہو سکتا ہے کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت پیش آتے تو صحابہ خدمت کے لئے تیار ہوں، یعنی یہ قیام، قیام خدمت تھا۔ (۱۳) قیام کو جائز قرار دینے والے حضرات سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث

لے بلکہ حضرت حکمر بن عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو سفر سے آتے تھے تو ان کے لئے یہ قیام فرمانا استقبال کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور عدی رضی اللہ عنہ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ضعیف ہے اور حضرت حدیثی سے مشہور الفاظ جو روایت ہیں ان کا مفہوم یہ ہے کہ جب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حرکت کر کے میرے لئے جگہ کی، وسعت فرماتے۔ لہذا رواہ البزار وکذا وجہ فیما جمعتہ ولعلہ عن محمد بن ہلال عن ابیہ عن ابی ہریرۃ وہو النظار فان ہلالا تابعی ثقہ۔ روح بن محمد بن ابی ہلال عن ابیہ عن جہد وہو بعید ورجال البزار ثقات۔ مجمع الزوائد ص ۴۰ ج ۸۔ وفی مشکل الآثار لمام جعفر الطحاوی ج ۱۰ تعالیٰ عن محمد بن ہلال عن ابیہ عن ابی ہریرۃ نحوه (مشکل الآثار ص ۳۸ ج ۲)

جس کو بخاری و مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے سے استدلال کرتے ہیں، اسی حدیث سے امام بخاری، مسلم اور ابوداؤد نے بھی استدلال کیا ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہود بنو قریظہ اس وعدہ پر اترے کہ جو فیصلہ بھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کریں گے، وہ انہیں قابل قبول ہوگا (تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی طرف پیغام بھیجا۔ وہ آپ کے قریب ہی تھے، پس گدھے پر سوار ہو کر آئے۔ فَلَمَّا دَنَا مِنْ آلِ سَجْدٍ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنَا نَصَارَ قَوْمُوا إِلَى سَيِّدِكُمْ الْبَخَارِيُّ كِتَابُ الْإِسْتِذَانِ، وَمُسْلِمُ كِتَابُ الْإِمَارَةِ، يَعْنِي جِسْرَ قُوتِ حَضْرَتِ سَعْدِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنِ الْمَسْجِدِ كَقَرِيبٍ مِنْهُ تَوْرَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنَا نَصَارَ فَرَمَا يَا كَرِيبَ سَرْدَارِ كَلْتِ كُطْرَ هُوَ جَاو۔

اس کے جواب میں قیام کے مخالفین فرماتے ہیں کہ یہ حکم قیام تعظیمی کے لئے نہ تھا بلکہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور ان کی مرہم ٹی کی گئی تھی، اُن کو گدھے سے اتارنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کھڑے ہونے کا حکم دیا، یہ قیام مدد اور معاونت کے لئے تھا۔ اگر یہ قیام تعظیمی ہوتا تو یوں فرماتے قَوْمُوا إِلَى سَيِّدِكُمْ یعنی اپنے سردار کی خاطر کھڑے ہو جاؤ۔ بلکہ بعض روایات میں زیادہ وضاحت بھی آتی ہے کہ قَوْمُوا إِلَى سَيِّدِكُمْ فَإِنْ لَوْ كَأُفْنِ سَرْدَارِ كِي طَرَفِ اْمُتْهُو اور ان کو سواری سے اتار لو۔

مخالفین قیام کے اس استدلال کا جواب موافقین حضرات یوں دیتے ہیں کہ مقصود یہ ہے کہ ان کے پاس جا کر ان کی تعظیم و تکریم کے لئے سواری سے اتار لو۔ اور اس بات پر قربینہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا ہے کہ اپنے سردار کی طرف اٹھو کھڑے ہو، تو لفظ سید سے اُن کی تکریم و تعظیم کی طرف اشارہ ہے۔

فقہاء کرام کے اقوال | مذکورہ بالا روایات میں قیام کی ممانعت اور جواز یعنی دونوں جانب بحث و کلام کی کافی گنجائش موجود ہے اور علماء کرام نے ان پر بہت طویل بحثیں کی ہیں حضرت نوویؒ نے قیام کے جواز پر پوری کتاب

لکھی ہے اور طبرانی وغیرہ نے اس کے جواز میں روایات و واقعات نقل کر کے ان روایات کو محمول ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جن سے قیام کی مانعت معلوم ہوتی ہے اور ان کی عمدہ تاویلیں بھی فرماتی ہیں۔

(۲) ابن الحاج وغیرہ نے اختلافی قیام کے ناپسندیدہ ہونے کو ثابت کرنے کے لئے پوری تفصیل سے مدلل بحث کی ہے اور انہوں نے حضرت امام نوویؒ کے پورے رسالہ کو اپنی کتاب 'مدخل' میں نقل کر کے اس سے عمدہ جوابات دیئے ہیں۔ جن کو فتح الباری نے بہت جامع اور مختصر انداز سے نقل کیا ہے۔

جمہور علماء نے اہل فضل حضرات کے آنے پر ان کے اکرام کے لئے کھڑے ہو جانے کو جائز بلکہ مستحب فرمایا ہے۔

(۳) چنانچہ مجمع البحار میں ہے وَاسْتَجَبَ بِهِ الْجَمَاهِيرُ كِرَامِ أَهْلِ الْفَضْلِ بِالْقِيَامِ إِذَا أَقْبَلُوا رَمَحَ الْبَحَارِ ص ۱۸۲ ج ۳ یعنی جمہور علمائے کرام نے اس سے استدلال کیا ہے کہ اہل فضل کے اکرام کے لئے کھڑا ہونا جائز ہے جب وہ آئیں۔

(۴) اور درمختار میں ہے آنے والے کی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا جائز بلکہ مستحب ہے (۵) اور حضرت امام حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَرَحَّبَ الْمَنْذَرِيُّ مَا لَقِئْتُمْ مِنْ الْجَمْعِ عَنْ قَتَيْبَةَ وَابْنِ خَارِزْمٍ إِنَّ الْقِيَامَ الْمَنْهُيَّ عَنْهُ أَنْ يَقَامَ عَلَيْهِ وَهُوَ جَالِسٌ (فتح الباری ص ۲۹ ج ۱۱) یعنی منذری رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت قتیبہؒ اور بخاریؒ سے (منع اور جواز کی روایات و واقعات میں) جو تطبیق کی گئی ہے جو پہلے ذکر ہو چکی (اس کو) پسند فرمایا ہے اور ترجیح دی ہے (یعنی کسی مسلمان بھائی کے اکرام کے لئے قیام جائز ہے) اور ممنوع وہ قیام ہے کہ کسی شخص کے ارد گرد یا سامنے، لوگ کھڑے ہوں اور وہ بیٹھا ہو۔

(۶) طحاویؒ شرح درمختار میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علماء تعظیم کے لئے کھڑا ہونے میں مختلف ہو گئے ہیں بعض نے منع کیا ہے بوجہ ابوداؤد کی حدیث کے جو انہوں نے ابوامامہ سے روایت کی ہے پھر اس کو پورا نقل کرنے کے

بعد فرمایا ہے کہ بعض نے اس کو (قیام کو) جائز کہا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لئے قیام کرتے تھے اور بعضوں نے اس میں تفصیل کی ہے جیسے قاضی خان فرماتے ہیں۔ قَوْمٌ يَقْرَءُونَ الْقُرْآنَ مِنَ الْمَحْجَمِ أَوْ يَفْرَأُ رَجُلٌ وَاحِدٌ قَدْ خَلَّ عَلَيْهِمْ نَوَاحِدٌ مِّنَ الْأَجَلَةِ وَالْأَشْرَافِ فَقَامَ الْقَارِئُ لِجَلِيلٍ قَالُوا إِنَّ دَخَلَ عَلَيْهِ عَالِمٌ أَوْ أَبَوَةٌ أَوْ أَسْتَاذُهُ الَّذِي عِلْمُهُ جَازِلُهُ إِنَّ يَقْرَأَ مِنْ جَلِيلٍ وَفِيمَا سِوَى ذَلِكَ لَا يَجُوزُ لَهُ وَفِي مَجْمَعِ الْفَتَاوَى لِلدُّنْيَا كِي قِيَامِ الْقَارِئِ جَائِزٌ إِذَا جَاءَ أَعْلَمُ مِنْهُ أَوْ أَسْتَاذُهُ الَّذِي عِلْمُهُ الْقُرْآنُ أَوْ أَعْلَمُ أَوْ أَبَوَةٌ أَوْ أُمَةٌ لَا يَجُوزُ لِغَيْرِهِمْ وَأِنْ كَانَ الْجَائِزُ مِنَ الْأَجَلَةِ وَالْأَشْرَافِ وَنَقَلَ الشَّرْئِبِلِيُّ عَنْ ابْنِ وَهْبَانَ مَا لَمْ يَصِدْ أَقُولُ فِي عَصْرِ تَابِيغِي أَنَّ لَيْسَ يَجِبُ ذَلِكَ أَيْ الْقِيَامُ إِلَّا فِي الْمَطْحَاوَى عَلَى الدَّرَجَاتِ (۴۷/۱۹۲) یعنی کوئی قوم یا فرد تلاوت قرآن میں مشغول ہو اور اس پر کوئی اہل فضل و شرف میں سے داخل ہو جائے تو علما، فرماتے ہیں کہ اگر وہ عالم ہو یا اس کا والد یا اس کا استاذ تو اس (قرآن پڑھنے والے) کے لئے جائز ہے کہ ان کے لئے کھڑا ہو جائے۔ اور ان کے سوا کسی دوسرے کے لئے کھڑا ہونا درست نہیں۔ اور مجمع الفتاویٰ الطحاکی میں ہے کہ جب اس سے زیادہ عالم یا اس کا ایسا استاذ جس نے اس کو قرآن مجید یا علم سکھایا ہو یا اس کا باپ یا ماں آجائے تو ان کے لئے کھڑا ہونا جائز اور ان کے علاوہ اور کسی کے لئے جائز نہیں، اگرچہ آنے والا اہل فضل و شرافت والا ہو اور شربلانیؒ نے ابن وہبان سے نقل کیا ہے جس پر انہوں نے تصریح کی ہے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ ہمارے زمانے میں یہ کھڑا ہونا مستحب ہونا چاہیے۔

(۱۷) اور رد المحتار میں اس پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ قَالَ فِي الْقِيَامَةِ قِيَامُ الْفَتَاوَى قَاضِي خَانَ ص ۳۷۴ و قَالَ الْمَلَا عَلِي قَارِي رَحِمَهُ اللَّهُ كَذَا احتج بالحدیث بما ہمیر العلماء و قَالَ الْقَاضِي عِيَاضُ الْقِيَامِ الْمُنْتَهَى قِيَامًا طَوِيلًا جُلُوسًا و قَالَ السُّوَيْدِيُّ هَذَا الْقِيَامُ لِلْعَادِمِ مِنَ أَهْلِ الْفَضْلِ مُسْتَحَبٌّ وَقَدْ جَاءَتْ الْأَعَادِيثُ وَلَمْ يَصِحَّ فِي النَّبِيِّ عَزَّ وَشَرَّفَ

الْبَالِسِ فِي الْمَسْجِدِ لِمَنْ دَخَلَ عَلَيْهِ تَعْظِيمًا وَقِيَامًا قَارِئِ الْقُرْآنِ لِمَنْ يَحْجُو  
تَعْظِيمًا لَا يَكْرَهُ إِذَا كَانَ مِنْ تَسْتَحِقِّ التَّعْظِيمِ وَفِي مُشْكِ الْأَثَارِ الْقِيَامُ لِغَيْرِهِ  
لَيْسَ بِمَكْرُوهٍ لَعَيْنٍ إِنَّمَا الْمَكْرُوهُ مُحَبَّةُ الْقِيَامِ لِمَنْ يَقَامُ لَهُ فَإِنْ قَامَ لِمَنْ يَقَامُ  
لَهُ لَا يَكْرَهُ. یعنی فقیہ میں ہے کہ مسجد میں بیٹھے ہوئے شخص کا ایسے آدمی کے لئے  
کھڑا ہونا جو اس پر داخل ہو اور تلاوت قرآن کرنے والے کا ایسے آدمی کے لئے  
جو اس کے پاس آئے، تعظیماً کھڑا ہونا مکروہ نہیں، جب کہ وہ تعظیم کا مستحق ہو اور  
حضرت امام طحاوی کی کتاب مشکل الآثار میں ہے کہ غیر کے لئے کھڑا ہونا بذاتِ خود  
مکروہ نہیں بلکہ مکروہ قیام کی محبت و خواہش ہے ایسے شخص کے لئے جس کے لئے  
(لوگ) کھڑے ہو جایا کرتے ہیں اور اگر کوئی کھڑا ہو گیا ایسے آدمی کے لئے جس کے لئے  
(لوگ) کھڑے نہیں ہوا کرتے تو مکروہ نہیں۔

آگے جا کر فرماتے ہیں کہ مَا وَرَدَ مِنَ التَّوَعُّدِ عَلَيْهِ فِي مَنْ يَحِبُّ الْقِيَامَ  
بَيْنَ يَدَيْهِ كَمَا يَفْعَلُهُ التُّرْكُ وَالْأَعْيَانُ. اور جو وعید (حدیث شریف میں) اس  
پر (قیام پر) آئی ہے تو وہ ایسے شخص کے بارے میں ہے جو اپنے سامنے لوگوں کے  
کھڑا ہونے کو پسند کرتا ہو، جیسا کہ ترک اور عجمی لوگ کرتے ہیں۔

(۸) ہمارے علماء کے درمیان اس مسئلہ میں بھی کچھ اختلاف ہے کہ مسجد میں بیٹھے  
ہوئے یا تلاوت کرنے والے شخص کے لئے کسی آنے والے کی تعظیم کے لئے کھڑا  
ہونا جائز ہے یا ناجائز۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ قاضی خان اور وغیرہ مسجد میں بھی  
کھڑا ہونے کی اجازت دیتے ہیں، لیکن کثر العباد وغیرہ میں تعظیم و تکریم کے لئے مسجد  
میں کھڑا ہونے کو منع فرمایا ہے اور اس حدیث سے استدلال فرمایا ہے۔ لَا تَوَلَّوْنِي  
فِي بُيُوتِي بِمَنْ يَرَى رَبَّكَ كَثِيرًا مِمَّنْ يُعْظِمُكَ كَمَا كَرِهَ. اس پر کلام کرتے  
ہوئے علامہ ابو مسعود رحمہ اللہ نقل فرماتے ہیں قَالَ وَلِهَذَا أَوْضَى الشَّافِعِيُّ نَهًا مَذْمُومًا

أَنْ لَا يَقُومُوا لَهُمْ فِي الْمَسْجِدِ إِذَا دَلَسُوا وَقَالَ فِيهِ إِشَارَةٌ إِلَى جَوَازِ مَا تُعْرِفُ  
 فِي زَمَانِنَا الْقِيَامُ فِي غَيْرِ الْمَسْجِدِ عِنْدَ اِتِّمَامِ الدَّلِيلِ الْإِفْتِاحِ الْعَيْنِ لِلْعَلَامَةِ الْمَسْعُودِ  
 ص ۳۲۳) فرماتے ہیں کہ اس لئے ہمارے سلف اپنے شاگردوں کو وصیت فرماتے  
 کہ ان کے لئے مسجد میں کھڑے نہ ہوں جس وقت وہ درس دیتے ہوں اور فرمایا کہ  
 اس میں ہمارے زمانے کے متعارف قیام جو درس کے اختتام پر مسجد سے خارج ہوتا  
 ہے کے جائز ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

ان تمام عبارات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جس قیام کے بارے میں علمائے کرام  
 کا اختلاف ہے کسی آنے والے کے لئے تعظیماً کھڑا ہوا جائے یا نہ۔ اکثر اس کے جواز  
 بلکہ استحباب کے قائل ہیں بشرطیکہ آنے والا شخص اہل فضیلت میں سے ہو اور تعظیم و تکریم  
 کا مستحق ہو، بلکہ بعض علماء کے اقوال سے متنازع فیہ قیام میں بھی کچھ تفصیل معلوم ہوتی ہے  
 جیسے ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قَالَ الْإِمَامُ حُجَّةُ الْإِسْلَامِ الْأَوْنَامُ مَكْرُوهٌ  
 عَلَى سَبِيلِ الْإِعْظَامِ لَا عَلَى سَبِيلِ الْإِكْرَامِ (المَرْقَاةُ بابُ الْقِيَامِ ص ۵۸۲) یعنی امام حجة الاسلام  
 فرماتے ہیں کہ کسی کے لئے بطور تعظیم کھڑا ہونا مکروہ ہے اور صرف، اکرام کے لئے  
 ہو تو مکروہ نہیں۔

اور فتح الباری میں اس بحث کے اختتام پر فرماتے ہیں قَالَ الْغَزَالِيُّ الْقِيَامُ عَلَى  
 سَبِيلِ الْإِعْظَامِ مَكْرُوهٌ وَعَلَى سَبِيلِ الْإِكْرَامِ لَا يَكْرَهُ وَهَذَا الْفَصِيلُ حَسَنٌ دَفْعُ الْبَارِي  
 ص ۴۳۳) یعنی امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قیام بطور تعظیم مکروہ ہے اور جو اکرام کی  
 وجہ سے ہو تو مکروہ نہیں، اور یہ اچھی تفصیل ہے۔

اب اگر اس سے مراد وہی ہو جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ جمیوں کے دستور کے  
 مطابق کھڑا ہونا تو ممنوع ہے اور علماء و مشائخ کے لئے کھڑا ہونا جائز ہے (جیسا کہ ملا  
 علی قاری رحمہ اللہ نے اس تفصیل سے گویا یہی مطلب سمجھا ہے) پھر تو جمہور علماء کے قول  
 ہے جیسا کہ حضرت ملا علی قاری مذکورہ بالا قول کے تحت لکھتے ہیں کہ لَعَلَّ ارَادَ بِالْإِكْرَامِ الْقِيَامَ الْتَعْتِيزَ لِمُرِيدِ الْمَحَبَّةِ وَ  
 بِالْإِعْظَامِ التَّمَثُّلَ لِلْقِيَامِ دَهْوًا عَلَى عَادَةِ الْأَمْرِ (المَرْقَاةُ ص ۵۸۲) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور اس میں کوئی فرق نہیں۔ اور اگر اس قول سے مراد ان کا اسی قیام تعظیم و تکریم جو دینی شرف ہی کی وجہ سے کیا جاتا ہے کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہو پھر تو تعظیم کے لئے کھڑا ہونا مکروہ اور اکرام کی خاطر جائز ہے۔ اسی طرح گویا متنازع فیہ قیام ہی میں تفصیل (یا فرق) کرنا مقصود ہوا۔ اور امام ابن حجر رحمہ اللہ نے آخر میں بذات تفصیل حسن فرما کر غالباً یہی فرق مراد لیا ہے کیونکہ بظاہر الفاظ اسی مطلب کی تائید کرتے ہیں۔

اور امام ابو داؤد نے سنن ابی داؤد میں جواز اور منع پر جو مختلف ابواب جس انداز سے وضع کئے ہیں اور اسی طرح بعض دوسرے حضرات کے اقوال سے اسی طرف اشارہ ملتا ہے کہ وہ قیام تعظیمی کو مکروہ فرماتے ہیں اگرچہ عجم کا دستور نہ بھی ہو لیکن مسلمان بھائی کے اکرام کے لئے قیام کو جائز فرماتے ہیں۔ بہر حال اگر اس تفصیل (فرق) کو تعظیمی قیام ہی میں مان لیا جائے تو شاید پھر اس کے جواز میں کسی کو بھی کلام نہ رہے گا۔ کیونکہ مجلس سے فراغت کے بعد صحابہ کا قیام اور انتظار فرمانا حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لے جاتے اس روایت کو ضرورت پر اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے قیام کو محبت اور انصار کے قیام کو حضرت معاذؓ کی مدد پر محمول کیا جائے (اگرچہ ان روایات میں قیام تعظیم کی کافی گنجائش ہے، تب بھی ان کو اکرام سے خالی ماننے کی کوئی خاص وجہ نہیں، ان سارے واقعات میں اکرام و احترام کا تصور بھی موجود ہے۔ پھر محبت اور اکرام کے حکم میں بھی کوئی خاص فرق نہیں جیسے محبت اپنے محل وقوع میں جائز بلکہ بعض اوقات ضروری ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی مسلمان بھائی کا اکرام اور مہمان کا اکرام چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو) بھی ضروری ہے اور ہمیں اس کا حکم دیا گیا ہے۔

(ابتداءً صغیرۃ گوشہ) یعنی شاید امام حجت الاسلام کی مراد قیام اکرام سے قیام تحیہ و سلام ہو جو کہ محبت کے بڑھانے کے لئے ہو اگر تاہم جیسا کہ اس پر مصنفہ دلائل کرتا ہے اور قیام اعظام سے مراد ان کا وہ قیام ہو جس میں وہ امراء اور بڑے لوگوں کی عادت کے مطابق بیٹھا ہو اور لوگ اس کے لئے سیدھے (تعظیم) کے لئے کھڑے ہوں۔

لے حیث قال اولاً باب فی القیام الامارۃ التی تدل علی الجواز ثم ترجم بعد قسمۃ ابواب، باب العمل بقیوم للرجل یعظمہ الملک و کتاب الادب ابو داؤد

البتہ کسی غیر کی توقیر و تعظیم اگرچہ فی نفسہ جائز ہے لیکن پھر بھی اکرام اور تعظیم کے حکم میں فرق صاف طور پر واضح ہے۔ ہمیں بعض لوگوں کا اکرام کرنے کا تو حکم ہے لیکن تعظیم کی ممانعت ہے جیسے کافر مہمان وغیرہ کا اکرام جائز اور اس کی تعظیم ممنوع ہے۔ اور علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ کسی آنے والے کے لئے ذبح کرنے کے حکم میں فرق کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "فَإِنْ قَصَدَ التَّعْظِيمَ لَا تَحِلُّ ..... وَإِنْ قَصَدَ الْإِكْرَامَ تَحِلُّ" (رد المحتار ص ۱۹) یعنی اگر ذبح کرنے میں نیت اور قصد تعظیم کی ہے تو یہ مذہب و طہال نہیں اور اگر قصد اکرام کی ہے تو حلال ہے۔

**قیام اکرام اور قیام تعظیم میں فرق** | اب سوال یہ ہے کہ قیام تعظیم اور قیام اکرام میں فرق کیسے کیا جائے اس فرق کو علماء کے اقوال سے کچھ اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر آپ کے یہاں کوئی شخص آئے اور آپ اس کے لئے کھڑے ہو جائیں، آگے بڑھ کر مصافحہ و سلام کریں اور اپنی جگہ پر بٹھائیں یا پھر کسی کو رخصت کرتے وقت اس کے لئے کھڑا ہونا وغیرہ یہ سب کچھ اکرام و احترام میں داخل ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی غیر آپ کی طرف نہ آ رہا ہو کسی دوسری طرف جا رہا ہو یا ویسے ہی راستے سے گزر رہا ہو، اس کو دیکھ کر تعظیم کے لئے کھڑے ہو جانا یا برفا اکرام سے باہر اور داخل تعظیم ہے۔ اسی طرح اور بھی قرآن ہو سکتے ہیں، جن کے ذریعے قیام اکرام اور قیام تعظیم میں تمیز کی جاسکتی ہے۔ اسی فرق کے بارے میں علامہ ابن قیم کے قول سے بھی اشارہ مل سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "وَالْقِيَامُ يَنْقَسِبُ إِلَى ثَلَاثٍ مَرَاتِبٍ: قِيَامٌ عَلَى رَأْسِ الرَّجُلِ وَهُوَ فِعْلُ الْجَبَابِرَةِ وَقِيَامٌ إِلَيْهِ عِنْدَ قَدُومِهِ وَلَدَبَائِئِهِ بِأَقْيَامٍ عِنْدَ رُفَاتِهِ وَهُوَ الْمُنَازَعَةُ" یعنی قیام کے تین مراتب ہیں پہلا یہ کہ کسی کے سر پر (یعنی ارد گرد یا سامنے جب کہ وہ بیٹھا ہوا ہو) یہ توجاہ اور متکبر لوگوں کا فعل ہے (جو بالاتفاق ناجائز ہے) دوسرا یہ کہ کسی کے لئے کھڑے ہو جانا جب وہ آئے تو اس میں کوئی مصافحہ نہیں۔ اور تیسرا یہ کہ اس کو دیکھتے ہی کھڑا ہو جائے اس علماء کا اختلاف ہے۔

ایک دوسری جگہ (حافظ ابن قیم) سے منقول ہے: "إِنَّ الْقِيَامَ عَلَى ثَلَاثَةٍ

اَقْسَامُ اَلَّذِي اَنْ يَكُوْنَ رَجُلٌ مُّقْتَدِي يَذْهَبُ لِحَاجَتِهِ اِلَى جَانِبِ اَخِي وَ اَيُّهَا  
 اِلَى هَذَا الرَّجُلِ الْقَائِلُ فِهَذَا اَمْسَيْتُ عَنْكَ وَ الثَّانِي اَنْ يَأْتِيَ مَقْتَدًا اِلَى هَذَا الْقَائِلِ  
 فَيَقِيَامُ اِلَى جَانِبِهِ وَ قِيلَ مُسْتَحَبُّ اَقْوَلُ عِنْدِي اَنْ اَنْتَ غَيْرُ مُرْتَضِي اِذَا بَوَّلْتَ فَيَنْدُ وَ اَلثَّانِي  
 اَنْ يَكُوْنَ الْمُقْتَدِي جَالِسًا وَ اَلثَّانِي ثَانِيَيْنِ فَهَذَا طَرِيقُ اَلْعَاجِزِ - مَعْنَى قِيَامُ كِي تَمِن  
 قَمِيں ہيں۔ اول یہ کہ مقتدی اور پیشوا آدمی کسی ضرورت سے کسی دوسری طرف جا رہا  
 ہو اور قیام کرنے والے شخص کی طرف نہیں آتا تو اس شخص کا قیام اس مقتدی کے لئے  
 منع ہے۔ دوسری قسم یہ کہ مقتدی (امام) آدمی اس کھڑے ہونے والے شخص کے پاس  
 آ رہا ہو تو اس آدمی کے لئے کھڑا ہونا جائز ہے اور کہا گیا ہے کہ مستحب ہے۔ (لیکن  
 میں کہتا ہوں کہ میرے نزدیک یہ قیام بھی ناپسندیدہ ہے جب کہ اس میں مبالغہ کیا جائے  
 تیسری قسم (قیام کی) یہ ہے کہ مقتدی بیٹھا ہوا ہو اور لوگ (اس کے سامنے یا ارد گرد  
 کھڑے ہوں۔ یہی اعاجم کا دستور ہے۔

ان عبارات میں غور کرنے سے اکرام کے قیام اور تعظیم کے قیام میں فرق واضح  
 ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ کسی مسلمان بھائی کی آمد پر  
 اس کے اکرام کے لئے کھڑا ہونا کسی کے نزدیک بھی ناجائز نہیں، غور کا مقام ہے  
 کہ علامہ ابن قیم متنازع فیہ قیام میں، قیام سے منع کرنے والے حضرات کے  
 ساتھ ہیں۔ لیکن پھر بھی اوپر بیان کردہ دوسری قسم کے قیام کو مکروہ اور ناجائز نہیں  
 فرماتے جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ قیام جس میں اختلاف ہے، صرف وہی  
 قیام تعظیم و تحمید ہے جو علما، کرام اور مشائخ عظام کی عظمت و تعظیم کی وجہ سے کیا  
 جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ بہر حال یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اس قسم کے اختلاف کو  
 چاہے کتنا ہی شدید طور پر متنازع فیہ کیوں نہ ہو، کفر و شرک کے برابر اختلاف بنا  
 لینا یا کفر و شرک جیسا اختلاف ماننا اور حوام کو اس غلط نظریہ کا باور کرنا بہت  
 بڑا ظلم ہے۔

چاہے کوئی قیام کو جائز سمجھ ہو یا اس کا مخالف ہو، دونوں کے لئے ایک  
 دوسرے پر بے جا الزامات لگانا کوئی دینی خدمت نہیں، اسی طرح قیام تعظیم و تحمید

کو جائز سمجھ کر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ رکوع اور سجدہ تعظیم بھی جائز ہیں، یہ بھی ظلم عظیم ہے۔ کیونکہ رکوع اور سجدہ تہجد کی حرمت صراحتاً ثابت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔ اَيُنَحِّىْ بَعْضُنَا الْبَعْضًا تَوَاسِعًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: لَا اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی ذات مبارک ہی کے لئے سجدہ کرنے کے بارے میں عرض کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کی حرمت پر اجماع ہے۔ تیسری بات یہ کہ قیام کی بعض قسمیں تو باجماع امت جائز اور ثابت ہیں، لیکن سجدہ اور رکوع کی کوئی قسم بجز رکوع اور سجود دین اسلام میں جائز نہیں، اور نہ صراحتاً ثابت ہے۔

باب چہارم

توسل بالاعمال  
والذوات الصالحہ

# دعا اور توسل

انسان کو جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے یا کسی مرض اور مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے، غرض جب اس کو کوئی ایسا مسئلہ پیش آتا ہے جس کا حل اسباب کے تحت اپنے ممکن وسائل اور ذرائع کی حدود میں اس کو نہیں ملتا، تو ایسی حالت میں وہ ایک ایسی ہستی سے اس مسئلہ کے حل اور اس حاجت برآری کے لئے سوال کرتا ہے جس کے بارے میں اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کی پکار کو سن رہا ہے اور اس کی ہر مشکل اور حاجت کو جانتا اور دیکھتا ہے۔ نیز وہ مشکلات و مصائب کو دور کرنے حاجات اور ضروریات کے پورا کرنے پر بھی قادر ہے اور کلی اختیار اس کو حاصل ہے۔ دین اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی وہ ہستی ہے جو پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ وہ اسباب و ذرائع سے بالاتر اختیار و اقتدار کا مالک ہے۔ اور

لہٰذا اس سے مراد یہ ہے کہ اسباب کے ماتحت کسی سے مدد مانگنا وہ خاص استعانت (یعنی مدد طلب کرنا) اور دعائیں جو صرف اللہ سے مانگی جاتی ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مختلف قسم کے اسباب پیدا فرمائے ہیں، ان میں تاثر رکھی ہے جیسے لگ سے گرمی کا حصول، پانی سے پیاس کا ختم یا کم ہونا یا جیسے مریضوں کی شفا یابی کے لئے ادویات کا استعمال اور ماہرین طب کے ہاں جانا، حصول علم کے لئے صحبت استاد کا کارگر ہونا، اسی طرح ہر انسان دوسرے انسانوں سے مدد حاصل کرتا ہے، مہملہ کو صاحبِ کار کی ضرورت، صاحبِ عمارت کو مہملہ کی ضرورت، گاہک کو سامان کی ضرورت ہے، تاجر کو گاہک کی ضرورت، غرض صنعت کا مزدور، حاکم و محکوم وغیرہ جو بھی ہوں ایک دوسرے کی خدمت کرتے ہیں۔ ہر انسان مادی اسباب سے فائدہ اٹھانے اور دوسروں سے کام لینے کا محتاج ہوتا ہے ان سے مدد حاصل کرتا ہے جس کی وجہ سے دنیا کا نظام چل رہا ہے اور یہ مدد مانگنا کسی بھی دین و شریعت میں نہایت زیادہ ممنوع نہیں بلکہ ناجائز و ممنوع وہ استعانت ہے جس میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو صاحبِ اختیار جان کر مادی یا شرعی اٹھانے پر

اس کا یہ اختیار و اقتدار اور قدرت ایسی بے نہایت ہے کہ اس کے ارادے کے بغیر کوئی چٹان نہ ہل سکتا ہے اور نہ گرسکتا ہے۔ وہ ہر جگہ ہر وقت تمام مخلوق کے حالات اور ضروریات کو پوری طرح جانتا اور دیکھتا ہے۔ وہی قسموں کا بنانے والا مشکلوں کا حل کرنے والا، حاجات کو پورا کرنے والا اور مصیبتوں کو دفع کرنے والا ہے۔ یہاں تک تو کفار و مشرکین بھی مانتے ہیں کہ قادر مطلق اور مختار کل سوا سے اللہ تعالیٰ کے کوئی دوسرا نہیں۔ البتہ مسلمانوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی فرشتہ، نبی اور ولی یا کسی دوسری مخلوق کو کسی دائرہ میں کوئی اختیار و قدرت ایسی پر نہیں کی ہے جس کی وجہ سے وہ اس دائرہ میں کسی کام خود مختاری سے پورا کر دے اور نہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ کسی کی دعا کو قبول کرے یا اسے رد کرے، اس لئے ایک مسلمان صرف اللہ سے ہی دعا مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی پر عمل کرتا ہے کہ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ۝۱۶۰ (المومن آیت ۱۶۰) اور تمہارے پروردگار نے فرمایا مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے تکبر کر کے منہ موڑتے ہیں وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

**دُعا عبادت ہے** | اگرچہ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر میں یوں کہا ہے کہ تم میری عبادت کرو، میں تمہیں ثواب دوں گا، اور بعض نے وہ مفہوم لیا ہے جو اوپر ترجمہ میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت میں دونوں تفسیریں ہم معنی ہیں ان میں اصلاً کوئی فرق نہیں، کیونکہ عبادت اور دُعا اگرچہ لفظی مفہوم کے اعتبار سے دونوں البتہ حاشیہ صفحہ گزشتہ اس سے اسباب سے بالاتر کوئی چیز مانگی جائے۔

لے مشرکین عرب اگرچہ یہ کہتے تھے کہ قادر مطلق اور کامل اختیارات کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت و اختیار کا کچھ حصہ فلاں شخص کے سپرد کیا ہے اور وہ شخص اسی دائرہ میں خود مختار ہے اس لئے وہ بتوں و دیوتاؤں کو پکارتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے جیسا کہ پچھلے صفحات میں یہ مفصل گزر چکا ہے۔

بدا جدا میں مگر مصداق کے اعتبار سے دونوں میں کوئی تفاوت نہیں اس لئے یہاں پہلے فقرے میں جس چیز کو دُعا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، اسی کو دوسرے فقرے میں عبادت کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت نام ہے کسی کے سامنے استہاد وجہ کی عاجزی اور تذلل اختیار کرنے کا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب بندہ اپنے پروردگار کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کر کے اور اس سے دعا مانگتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور اس کی آقائی کا اعتراف اور اپنی بندگی و عاجزی کا اقرار کرتا ہے، تو یہ اظہار بندگی بجاۓ خود عبادت بلکہ روح عبادت ہے اور اس پر کہ دعا عبادت ہی ہے، رحمتہ للعالمین خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات موجود ہیں۔

چنانچہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مذکورہ بالا آیت کریمہ کی تفسیر میں یہ حدیث بیان فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **إِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ تَقْرَأُ وَتَبْكُوا أَدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ** اَلَّذِينَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ۔ یعنی دعا عبادت ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے استدلال میں، یہ آیت تلاوت فرمائی۔ **وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ** اَلَّذِينَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ۔

اور سنن الترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **الدُّعَاءُ مَعَ الْعِبَادَةِ** یعنی دعا عبادت کا منظر ہے (سنن الترمذی ابواب الدعوات) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **لَيْسَ شَيْءٌ أَكْرَمَ عَلَى اللَّهِ مِنَ الدُّعَاءِ** اللہ تعالیٰ کے نزدیک دُعا سے زیادہ کوئی چیز مکرم نہیں (سنن الترمذی ابواب الدعوات ۱۲۴)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ **مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَدْعُو بِدَعْوَةٍ لَيْسَ فِيهَا تَعَدُّ وَلَا قَطْعٌ لَهُ رَحِمٌ إِلَّا أَعْطَاهُ اللَّهُ بِهَا** (سنن الترمذی ابواب الدعوات ۱۲۴) اسی حدیث شریف کو مسند احمد ابو داؤد و نسائی ابن ماجہ وغیرہ نے بھی نقل کیا ہے، امام ترمذی اس حدیث کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ ہذا حدیث حسن صحیح۔

اِحْدَى ثَلَاثِ اِمَانٍ يُجْعَلُ دَعْوَتُهُ وَاِمَانٌ يَدْخُرُ هَالِكٌ فِي الْاُخْرَى وَرَءَا اَنْ  
يُصْرَفَ مِنَ الشُّرُوفِ مِثْلًا مَا قَالُوا اِذَا اُنْكَثِرُ قَالَ - اللّٰهُ اَكْثَرُ رِوَاہ احمد کنز فی الشکوۃ کتاب  
الدعوات یعنی ایک مسلمان جب بھی کوئی دعا مانگتا ہے بشرطیکہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا  
نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں قبول فرماتا ہے یا  
تو جو مانگتا ہے وہی دنیا میں عطا کرتا ہے یا اس دعا کو آخرت میں اجر و ثواب دینے کے  
لئے محفوظ کر دیتا ہے یا اس کو وہ مانگی ہوئی چیز تو نہ ملی مگر اسی درجہ کی آفت اور  
مصیبت جو اس پر آنے والی تھی اس پر آنے سے روک لیتا ہے صحابہ کرام نے عرض کیا  
پھر تو ہم کثرت سے دعا مانگا کریں گے اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
فرمایا اللہ تعالیٰ کا فضل و عطا بہت زیادہ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ سے مانگنے پر دنیا و  
آخرت کا اجر و ثواب ملتا ہے اسی طرح اگر کوئی اپنے آپ کو مستغنی سمجھے اور تکبر کی وجہ سے  
اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں پر عتاب فرمایا ہے  
جیسا کہ مذکورہ بالا آیت کریمہ کے دوسرے فقرے میں ارشاد ہے - اِنَّ الَّذِیْنَ  
یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَیْذُخْلُوْنَ جَهَنَّمَ ذَاخِرِیْنَ - یعنی بے شک جو  
لوگ میری عبادت سے (یعنی دعا اور عبادت سے بوجہ استغناء اور تکبر منہ  
موڑتے ہیں وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم نے فرمایا - مَنْ لَوَّ لِسَالِ اللّٰهُ یَغْضَبُ عَلَیْہِ (ترمذی الباب الدعوات ۲۶) یعنی جو شخص  
اللہ تعالیٰ سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھ کر بوجہ تکبر کے اپنی حاجت کا سوال نہیں کرتا  
اللہ تعالیٰ کا اس پر غضب ہوتا ہے۔

غرض دعا عبادت بلکہ مغز اور روج عبادت ہے اس لئے جس طرح دوسری  
عبادات صوم صلوٰۃ انذر و نیاز وغیرہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کئے جاتے ہیں اسی طرح  
دعا بھی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور اسی سے مانگی جاتی ہے۔  
لہذا جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو صاحب اختیار جان کر اس سے اسباب

سے بالاتر کسی چیز کا سوال کرتا ہے وہ صریح شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔

جب دعا کی حقیقت اور اس کی حیثیت سے واقفیت ہوتی تو مناسب یہ ہے کہ کسی عمل یا کسی مقبول بندہ پر دعائیں توسل کرنے کی حقیقت اور حیثیت کو بھی واضح کر دیا جائے تاکہ جائز و ناجائز توسل میں فرق و امتیاز کھل کر سامنے آجائے۔

**دُعائیں توسل کی اقسام** | دعائیں توسل کی کئی قسمیں ہیں بعض ان میں بالاتفاق وسیلہ اور ذریعہ سے یا حمد و ثناء درود شریف پڑھ کر دعا مانگنا وغیرہ اور بعض اقسام بالاتفاق ناجائز مثلاً کسی مخلوق سے براہ راست کوئی ایسی چیز مانگنا جو اسباب سے بالاتر ہو مثلاً کسی انسان یا فرشتہ سے یا جن کو صاحب اختیار جان کر ان سے اولاد وغیرہ مانگنا۔

**استشفاع** | توسل کی ایک قسم استشفاع ہے جس میں کسی مخلوق سے براہ راست تو اپنی حاجات نہیں مانگی جاتیں، البتہ ان کی خدمت میں گزارش کی جاتے کہ وہ حق تعالیٰ شانہ کے دربار میں ہماری حاجت اور مراد پوری ہونے کی دعا فرمائیں اس کا حکم یہ ہے کہ جو حضرات دنیا میں تشریف فرما ہیں ان سے دعا کی درخواست کرنا بالاجماع جائز بلکہ مستحب ہے، البتہ وہ نیک و صالح جو اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں ان کی قبور پر جا کر ان سے دعا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اس میں ہمارے علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، بعض اُسے جائز کہتے ہیں اور بعض اس کو ناجائز اور بدعت کہتے ہیں، جو حضرات توسل کی اس قسم کو بدعت اور ناجائز کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح توسل کے اختیار کرنے سے شرک میں پڑ جانے کا خطرہ ہے، اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ نیک اور صالح شخص سے اگر ان کی حیات میں دعا مانگی جائے تو یہ آپ کے نزدیک بھی جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے تو پھر اس کے مرنے کے بعد اگرچہ آپ مرنے والے کے سننے کے قائل بھی ہیں، اس سے دعا کی درخواست کرنا بدعت اور ناجائز کیوں قرار دیتے ہیں، حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی صالح شخص سے سوال کرنے میں اور وفات کے بعد یا غائب ہونے کی صورت میں ان سے سوال کرنے میں فرق یہ ہے کہ زندگی میں تو کوئی ان کی پرستش نہیں کر سکتا تھا کیونکہ انبیاء و صالحین اپنی زندگی کے اندر اپنے حضور میں کسی مشترک نہ حرکت کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے بلکہ روکتے تھے اور اس پر سزا دیتے تھے اس پر حضرت حافظؒ نے متعدد دلائل پیش کئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا قول اس پر شاہد ہے۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتُ بِهٖ  
اَلْاٰ اَعْبُدُوْا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمۡ وَاَنْتُمْ  
عَلَيْهِمْ شٰہِدٌۢ مَا دُعِیْتُ فِیْهِمْ  
فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتُ اَنْتَ الْغَیْبُ  
عَلَيْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شٰہِدٌ  
یعنی تو نے جو مجھے حکم دیا تھا میں وہی میں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ اللہ جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے اسی کی عبادت کرو اور جب تم میں ان میں موجود رہا ان کا غائبانہ حال رہا پھر جب تو نے مجھے دنیا سے اٹھالیا تو تو ہی ان کا نگہبان تھا اور تو تمام چیزوں کی خبر رکھتا ہے۔ (مائدہ آیت ۱۱۴)

اسی طرح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے یوں کہا۔ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَفُیْتُ۔ تو آپ نے فرمایا۔ اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰهِ نِدًا۔ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحَدَّكَ۔ کیلئے تو نے اللہ کا شریک بنا دیا بس یوں کہو۔ اللہ وعدہ جو چاہے۔ اور اس کو نصیحت کر کے فرمایا کہ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ مُحَمَّدٌ کَمَا کَرُوْا وَاَمْرٌ لِّیْ کَمَا دِیَا کَرُوْا۔ مَا شَاءَ اللّٰهُ تَوَشَّاءَ مُحَمَّدٌ جو اللہ کی مرضی اور اس کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی۔

اسی طرح ایک شادی کے موقع پر انصار کی بچیاں اپنے ان آباء و اجداد کی شجاعت بیان کرتی تھیں جو بدر کے دن شہید ہو گئے تھے، تو ان میں سے ایک بچی نے جب یہ کہا۔ وَخِیْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ یَعْلَمُوْا مَا فِیْ عِنْدِہِمْ میں اللہ کے رسول موجود ہیں جو آئندہ کل کی بات جانتے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دَعِیْ ہٰذَا وَقُوْلِیْ بِالْذِّیْ کُنْتُ لَقَوْلِیْنَ۔ ایامت کہہ اور جو تو پہلے کہتی تھی وہی کہہ۔ اور جب صحابہ رضی اللہ عنہم اجماعاً نماز میں صفت بستر آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے)

ہوتے تھے، تو فرمایا۔ لَا تَعْظُمُونِي كَمَا تَعْظُمُونَ الْعَاجِزَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا۔ اسی طرح میری عزت و تعظیم نہ کرو جیسے عجمی لوگ ایک دوسرے کی کیا کرتے ہیں۔

اسی طرح جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے منع فرمایا اور کہا۔ إِنَّهُ لَا يُصَلِّحُ السُّجُودَ إِلَّا اللَّهُ وَلَوْ كُنْتَ أَمْرًا أَحَدًا أَنْ يُسْجَدَ لَهُ حَيْدَ لَمْ مَرَّتِ الْمَرْأَةُ أَنْ تُسْجَدَ لَزَوْجُهَا مِنْ عَظَمِ حَقِّهِ عَلَيْهَا۔ یعنی سجدہ فقط اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے اگر میں کسی شخص کو کسی شخص کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ شوہر کو سجدہ کرے کیونکہ شوہر کا بیوی پر بہت بڑا حق ہے۔

اور جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں زنادقہ کا وہ گروہ پیش ہوا جو ان کی خدائی کا قاتل تھا تو آپ نے ان کے جلادینے کا حکم دیا۔

لے ٹھونڈ رہے کہ یہ زنادقہ کا وہ گروہ تھا جو عید اللہ ابن سبا کے پیروکار تھے اپنے کو شیعان علی باور کراتے تھے مالا نکر ان کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ عبداللہ بن سبا میں کا یہودی عالم تھا۔ اس منافق نے اسی ارادے اور منصوبے کے تحت یہودیت چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا جس کے تحت سینٹ پال (پولس) نے یہودیت چھوڑ کے عیسائیت قبول کی تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو منسوخ کر ڈالا تھا۔ ابن سبا نے بھی وہی کچھ کرنا چاہا جو سینٹ پال نے کیا تھا چنانچہ اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ غیر معمولی عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہوئے ان کی شان میں طرح طرح کی غلو کی باتیں کرنا شروع کیں۔ ان کی طرف عجیب عجیب معجزے منسوب کر کے ان کو ایک مافوق البشر ہستی باور کرانے کی کوشش کی۔ بعض کم فہم نو مسلموں کو یہ باور کرایا کہ اللہ نے نبوت و رسالت کے لئے حضرت علی بن طالب کو منتخب کیا تھا لیکن جبریل کو اشتباہ ہو گیا اور غلطی سے وحی محمد بن عبد اللہ کے پاس لے گئے۔ یہاں تک اس منافق نے کچھ سادہ لوحوں کو قومی سبق پڑھایا جو ساؤل (پولس) نے عیسائیوں کو پڑھایا تھا۔ اور ان کا یہ عقیدہ ہو گیا کہ حضرت علی اس دنیا میں خدا کا روپ دھار کر آئے ہیں اور گویا وہی خدا ہیں۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی طرح یہ بات پہنچ گئی کہ ان کے لشکر کے کچھ لوگ ان کے بارے میں اسی طرح کی باتیں چلا رہے ہیں تو آپ نے ان زندہ لقیوں کو قتل کر دینے اور لوگوں کی عبرت کے لئے آگ میں ڈلوا دینے کا حکم فرمایا۔ باقی مآشیرہ صفحہ ۹۷

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ اسی طرح مثالیں پیش کر کے آگے فرماتے ہیں کہ انبیاء اور صالحین کی شان میں غلو کرنا، ان کو رب بنالینا اور ان کے ساتھ شرک کرنا یہ اس قسم کی باتیں ہیں جو ان کی غیبت میں یا ان کی وفات کے بعد حاصل ہوتی ہیں چنانچہ مسیح اور عزیر علیہما السلام کے ساتھ ان کی غیبت اور وفات کے بعد شرک کیا گیا پس یہی راز ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کسی صالح ولی اللہ کی زندگی میں ان کے روبرو ان سے دلیقہ ناشیہ صفحہ گزشتہ لیکن اس وقت خاص حالات میں اس کا رروائی کو دوسرے مناسب وقت کے لئے ملتوی کر دیا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں الوہیت کا عقیدہ رکھنے والے اور اس کی دعوت دینے والے زمانہ انہی کے حکم سے قتل کئے گئے اور آگ میں ڈال دیئے گئے لیکن پھر بھی اللہ میں سے بہت سے شایعین اور خود عبداللہ ابن ہاشم غرض شایعین بچ نکلے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد لوگوں سے یہ کہنے لگا کہ یہ مقتول حضرت علی نہیں بلکہ شیطان ہے جس نے لوگوں کے سامنے حضرت علی کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ مالاخر حضرت علی کو اسی طرح آسمان پر اٹھایا گیا ہے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زہرہ اٹھایا گیا تھا۔ وہ اور اس کے پیروکار اسی طرح مکر و فریب کر کے لوگوں میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرتے رہے۔ چونکہ ان کی یہ دعوت و تحریک خفیہ طور پر اور سرگوشیوں کے ذریعہ جاری تھی اس لئے اس سے متاثر ہونے والے ایک ہی خیال اور عقیدہ کے نہیں تھے اس کے دلیلیں جو بات اور متنی بات مناسب سمجھتے تھے وہی کہتے اگر وہ اس کو قہر ل کر لیتا تو وہی اس کا عقیدہ بن جاتا، اسی طرح ان کے مختلف فرقے بنتے چلے گئے یہاں تک کہ ان کی تعداد ستر سے متجاوز ہو گئی۔

یہاں بتانا یہ ہے کہ جس طرح پولس یہودی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو مخ کر دیا تھا اسی طرح یہودی سازش اسلام کا حلیرہ بگاڑنے میں بھی کامیابی کا خواب دیکھتے تھے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین و تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسی شدت سے اس فتنہ کی سرکوبی کی جس کی وجہ سے سبائی گروہ رافضی، شیعہ اس بات پر مجبور ہو گئے کہ وہ اپنے عقائد و نظریات کو عقیدہ تفسیر کے نقاب میں چھپائے لیکن عصر حاضر میں تو اس من گھڑت عقیدہ تفسیر کے نقاب کو ایسا چال کر دیا گیا کہ ان کا اصلی چہرہ منظر عام پر آ گیا۔ ان کے خرافات و کفریات کی قلعی ایسی کھل گئی کہ عوام سادہ لوح مسلمان بھی اب ان کی کفریات اور خرافات سے بے خبر نہیں ہیں۔

سوال اور ان کی وفات کے بعد یا غیر ماضی میں ان سے درخواست کرنے میں فرق ظاہر ہو جاتا ہے اور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں بلکہ تمام سلف صالحین میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جو انبیاء کی قبور کے پاس نماز پڑھنے کو اختیار و پسند کرتا ہو یا مزارات کے پاس دعا کی ہو، اور نہ کبھی غائبانہ ان سے سوال اور استخاضہ (فریاد خواہی) کرتے تھے نہ قبروں کے پاس، علیٰ ہذا الیاس اعتکاف اور مجاور ہو کر بیٹھنے کا ان سے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس کے جواب میں قائلین حضرات فرماتے ہیں کہ بہت سے سلف صالحین فقہاء بلکہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی یہ بات منقول ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف پر حاضر ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھنے کے بعد ان سے بارگاہ الہی میں مغفرت اور شفا بخش کرنے کی درخواست کرتے تھے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر پر ماضی کے وقت صلوٰۃ و سلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ عالی میں مغفرت اور شفاعت وغیرہ کی درخواست کرنے والی دعائیں اور ان دعاؤں کی تعلیم مناسک حج وغیرہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس لئے ایسا شخص جو قبر شریف پر حاضر ہو جائے اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دعا اور شفاعت کی درخواست کرے تو یہ جمہور علما کے نزدیک جائز بلکہ مستحسن ہے۔ البتہ حافظ ابن تیمیہ اور ان کے ہم خیال علما اس کو خلاف سنت اور بدعت کہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا جمہور علما اس بات کو بھی جائز کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے کی قبر پر حاضر ہو کر یہ درخواست کرنا کہ وہ قبر والا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری حاجت پوری ہونے کی دعا کرے، اس کے جواب میں یوں کہا جاتا ہے کہ جو صحابہ کرام اور متقدمین علما اس بات کے قائل نہیں کہ مردے اپنے زیارت کرنے والے کے سلام، کلام کو سنتے ہیں، ان کے نزدیک تو مردوں کو خطاب کرنا بھی درست نہیں، اس لئے ان میں سے نوکسی کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس طرح توسل کا قائل ہو سکے اور نہ ان حضرات کا یہ معمول ہو سکتا ہے کہ وہ کسی میت سے دعا کی درخواست کرتے اور سماع موتی کے بارے میں جن حضرات کا نظریہ یہ تھا کہ قبر کے نزدیک مردے ہماری باتوں کو سنتے ہیں اور جانتے ہیں، تو ان میں سے بھی کسی صحابی یا

مقتدین علماء میں سے کسی سے یہ ثابت نہیں کہ اس نے کسی صالح یا شہید کی قبر پر جا کر ان سے دعا کی درخواست کی ہو۔ اس لئے حافظ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد اور علماء آلوسی اور دیگر متعدد علماء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ اگرچہ اس بات کے قائل ہیں کہ مردے فی الجملہ سنتے اور جانتے ہیں، لیکن پھر بھی اسل طرح دعا کی درخواست کرنے پر عدم جواز کا فتوہ دیتے ہیں اور ان کے نزدیک توسل کرنا بدعت اور ناجائز ہے، البتہ بعض متاخرین علماء غیر انبیاء علیہم السلام کی قبور پر جا کر ان سے دعا کی درخواست کرنے کو بھی جائز بتاتے ہیں، لیکن پھر بھی انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کسی نیک صالح یا شہید کی قبر پر جا کر ان سے دعا کی درخواست کرنا زیادہ کشتہ چیز معلوم ہوتی ہے اس لئے غیر انبیاء علیہم السلام میں مانعین کے قول پر عمل کرنا احوط اور اسلم ہے واللہ اعلم۔

توسل کی اقسام میں سے ایک قسم ایسی بھی ہے جس میں نزاع تو ضرور ہے لیکن یہ ایسی نزاع نہیں جس کی بنیاد پر کسی ایک فریق کو اخوۃ قائلین میں سے ہو یا منکرین میں سے، مشرک، بدعتی یا گمراہ کہا جاتے اور یہاں صرف توسل کی اس قسم پر قدرے تفصیل سے بحث کرنی مقصود ہے تاکہ اس بے خطر توسل میں اختلاف کو دیکھ کر توسل کی دوسری اقسام کی حقیقت بھی واضح ہو جائے۔ اس قسم کے توسل کے ساتھ توسل بالاعمال کی کچھ تشریح اس لئے پیش کی جاتی ہے تاکہ کسی شخصیت پر توسل کرنے کی حقیقت معلوم کرنے میں آسانی ہو۔

**توسل بالاعمال** اپنے نیک اعمال چاہے ظاہری ہوں یا باطنی کی وساطت (ذریعہ) سے اللہ تعالیٰ سے مانگا جائے، سوال کیا جائے۔ توسل کی اس قسم

پر قرآن مجید کی متعدد آیات کریمہ اور احادیث شریفہ شاہد ہیں جس میں سے صرف ایک آیت کریمہ اور ایک ہی حدیث پر اکتفا کرتا ہوں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

رَبَّنَا اِنَّا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي  
لِلَّذِيْنَ اٰنَ اٰمَنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاَمَّا  
رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكْفِّرْ عَنَّا  
سَيِّئَاتِنَا وَتَوَخَّاهُمْ اَلَمْ يَجْعَلْ

یعنی اے ہمارے رب، ہم نے اللہ کی طرف بلانے والے (روحِ علی اللہ علیہ وسلم) کے اس اعلان کو سنا کہ اے لوگو! تم اپنے رب کی ذات، صفات پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لے آئے اور ہماری برائیاں دور

کر دیجئے اور ہم کو نیک لوگوں کے زمرہ میں شامل  
فرما کر موت دیجئے۔

اور ایک صحیح حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ عین آدمی کہیں جا رہے تھے، بارش  
نے انہیں گھیر لیا، وہ بارش سے بچنے کے لئے ایک غار میں داخل ہو گئے۔ پہاڑ کا ایک  
پتھر غار کے منہ پر آگرا اور باہر نکلنے کا راستہ بند ہو گیا۔ اب انہوں نے کہا کہ جو اعمال ہم  
نے خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کئے ہیں، ان کے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا  
چاہیئے۔ شاید اللہ پاک اس پتھر کو دور کر دے۔ تو ان میں سے ایک نے کہا اے اللہ  
میرے ماں باپ بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ میں بکریاں چراتا  
تھا۔ جب شام کے وقت میں واپس آتا اور دودھ دوہتا تو سب سے پہلے اپنے ماں باپ  
کو پلاتا، ایک دن میں بکریوں کو چرانے کے لئے بہت دور لے گیا اور رات دیر سے  
لوٹا۔ میرے والدین سوچکے تھے۔ میں نے حسب معمول دودھ دوہا اور ان کے سر ہانے  
کھڑا ہو گیا۔ میں نے ان کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور یہ بھی اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اپنے  
بچوں کو ان سے پہلے دودھ پلا دوں، بچے بھوک کے مارے چلاتے رہے۔ میرا اور ان  
کا یہی حال رہا یہاں تک کہ صبح ہو گئی، تب والدین جاگے اور انہوں نے پہلے دودھ پی لیا  
پس اے اللہ اگر میں نے یہ کام خالص تیری رضا کے لئے کیا ہوں تو اس پتھر کو اتنا ہٹا دے  
کہ میں آسمان نظر آجائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے پتھر کو اتنا ہٹا دیا کہ آسمان نظر آنے لگا۔ دوسرے  
نے عرض کی اے اللہ میرے چچا کی ایک بیٹی تھی مجھ کو اس کے ساتھ ایسی شدید محبت تھی  
جس قدر کہ آدمی کو عورت سے ہو سکتی ہے۔ میں نے اس سے اس کے نفس کا مطالبہ کیا  
اس نے انکار کیا، یہاں تک کہ ایک سال اسے قحط سے سخت تکلیف پہنچی، اور وہ  
میرے پاس (مجبوراً) آئی۔ میں نے اسے ایک سو بیس دینار اس بشرط پر دیتے کہ وہ  
میری خواہش نفس کو پورا کرے، جب میں نے اس پر قابو پالیا، تو وہ کہنے لگی۔ اے اللہ  
کہ بندے! اللہ سے ڈرا اور مہر کو ناحق نہ توڑا پس میں اس سے فوراً اٹھا اور اس سے  
اپنا سونا اور دینار بھی واپس نہ لیا، اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام خاص تیری

رضامندی کے لئے کیا ہو تو ہماری مصیبت کو دور کر دے۔ پس اللہ تعالیٰ نے  
فار کے منہ کو مختور اور کھول دیا۔

تیسرا شخص کہنے لگا کہ میں نے کچھ مزدور کام پر لگائے۔ جب انہوں نے  
کام ختم کر دیا تو میں نے سب کو مزدوری دے دی سوائے ایک آدمی کے جس نے  
دخا ہو کر اپنا حق چھوڑ دیا اور چلا گیا۔ میں اس کے حق میں زراعت کرنے لگا ہوں  
تک کہ بہت سال و مویشی جمع ہو گئے۔ کافی مدت کے بعد وہ میرے پاس آیا اور  
میں نے لگا اللہ سے ڈر، مجھے میری مزدوری دے دے۔ میں نے اسے کہا کہ یہ سب اوش  
لگاتے، بیل، بکریاں اور چرواہے لے جاؤ۔ وہ کہنے لگا اے اللہ کے بندے میرے  
ساتھ مذاق نہ کرو۔ میں نے جواب دیا کہ میں تیرے ساتھ مذاق نہیں کرتا۔ پس وہ ان  
سب کو لے کر چلا گیا۔ اے اللہ! اگر میں نے یہ کام خالصتہ تیرے لئے کیا ہو تو ہماری  
تکلیف کو دور کر دے۔ اللہ تعالیٰ و تبارک نے اس پتھر کو دور کر دیا۔ اور وہ باہر  
نکل کر چلے گئے (متفق علیہ مشکوٰۃ باب البر والصلة)

تینوں حضرات نے اپنے اپنے نیک عمل کے ذریعہ سے دعا کی، اسی کو توسل  
بالاعمال کہتے ہیں۔ اس قسم کا وسیلہ اختیار کرنے میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ بالاجماع جائز  
اور مستحسن ہے۔

کسی شخصیت پر توسل | اللہ تبارک و تعالیٰ سے انبیاء علیہم السلام اور صالحین  
یعنی نیک بندوں کے ذریعے، وسیلے یا واسطے سے  
دعا کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر متقدمین (پہلے زمانے کے) علماء اور فقہائے کرام میں  
کسی نے خاص بحث نہیں کی اور نہ ہی اس کو صراحتاً منع فرمایا ہے۔ البتہ اس میں  
حضرت حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ نے اختلاف کیا ہے۔ وہ اپنے رسالہ قاعدہ  
جلیلہ میں لکھتے ہیں کہ:-

وَلَفْظُ (التَّوَسُّلِ) قَدْ يَرادُ بِهِ ثَلَاثَةٌ أُمُورٍ يُرَادُ بِهِ أَمْرَانِ مُتَّفَقٌ  
عَلَيْهِمَا بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ أَحَدُهُمَا هُوَ أَصْلُ الْإِيمَانِ وَالْأُخْرَى هُوَ التَّوَسُّلُ

بِالْإِيمَانِ بِهِ (اُمّی بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم) وَطَلَعَتْ، وَالثَّانِي دُعَاؤُكَ  
وَشَفَاعَتُكَ وَهَذَا الْيُضَانَا فِعْمٌ الْإِزْمَاعِيهِ جَلِيلٌ ۱۱۳ یعنی توسل کے تین معنی لئے جاتے  
ہیں۔ دو معنی تو تمام مسلمانوں کے ہاں بالاتفاق جائز ہیں۔ ان میں سے ایک تو اصل  
ایمان و اسلام ہے وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور ان کی اطاعت کے ذریعہ  
سے (توسل کیا جائے) یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جائے۔ دوسرا یہ  
کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور شفاعت کا وسیلہ بن کر لانا (یعنی توسل کرنا) اور یہ بھی نفع  
پہنچاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت حافظ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو کوئی بھی ان دونوں معانی  
میں سے کسی ایک کا انکار کر دے وہ کافر اور مرتد ہے۔ اگر تو بہ نہ کرے تو مرتد ہونے  
کی وجہ سے قتل کیا جائے گا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ دوسری قسم کے توسل سے انکار پہلی  
قسم کے انکار سے ہلکا کفر ہے۔

چند معنیجات چھوڑ کر آگے لکھتے ہیں

فَلَعَطُ التَّوَسُّلِ يُرَادُ بِهِ ثَلَاثَةٌ مَحَارِبُ  
أَحَدُهَا التَّوَسُّلُ بِطَاعَتِهِ فَهَذَا أَفْضَلُ  
لَا يُبَيِّنُ الْإِيمَانُ إِلَّا بِهِ، وَالثَّانِي التَّوَسُّلُ  
بِدُعَائِهِ وَشَفَاعَتِهِ وَهَذَا أَكْثَرُ فِي  
حَيَاتِهِ وَيَكُونُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَتَوَسَّلُونَ  
بِشَفَاعَتِهِ، وَالثَّالِثُ التَّوَسُّلُ بِمَعْنَى  
إِلَاقَسَامٍ عَلَى اللَّهِ بِذَاتِهِ وَالسُّؤَالُ بِذَاتِهِ  
فَهَذَا أَهْوَالُ الذَّنْبِ لَوْ تَوَكَّنَ الصَّحَابَةُ لَيَعْلَمُونَ  
فِي الْإِسْتِسْقَاءِ وَخَوَافِهِ لَوْ فِي حَيَاتِهِ وَلَوْ  
بَعْدَ مَمَاتِهِ لَوْ عِنْدَ قَبْرِهِ وَلَا غَيْرُ  
قَبْرِهِ وَلَا يَعْرِفُ هَذَا أَقْبَلُ شَيْئًا

یعنی توسل سے تین معنی مراد لئے جاتے ہیں اول  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا وسیلہ یہ تو فرض ہے  
بغیر اس کے ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ دوسرے آپ  
صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور شفاعت کا ذریعہ (وسیلہ)  
یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تھا اور پھر قیامت  
کے دن سب لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا  
ذریعہ (وسیلہ) بنیں گے۔ تیسری قسم توسل کی وہ ہے جس  
میں اللہ تعالیٰ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات  
مبارک کی قسم دی جائے یا ان کی ذات مبارک کو ذریعہ  
بن کر سوال کیا جائے۔ یہ وہ توسل ہے جس کو صحابہ  
رضی اللہ عنہم نے کبھی نہیں اختیار کیا، راستہ بارگاہ

مِنَ الدَّعِيَّةِ الْمَشْهُورَةِ بَيْنَهُمْ  
وَإِنَّمَا يَنْقُلُ شَيْءٌ مِّنْ ذَلِكَ فِي  
أَحَادِيثٍ ضَعِيفَةٍ مَرْفُوعَةٍ وَ  
مَوْقُوفَةٍ أَوْ عَنْ مَنْ لَيْسَ قَوْلُهُ حُجَّةً  
(قاعدہ ہلیلہ ص ۵۵)

وغیرہ کے لئے کسی اور کام کے لئے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہ ان کی رحلت کے بعد نہ ان کی قبر مبارک کے پاس نہ ان کی قبر کے علاوہ کسی دوسری جگہ اور نہ اس قسم کا توسل مشہور دعاؤں میں پایا جاتا ہے بلکہ اس قسم کے توسل کی تائید میں ضعیف مرفوع اور موقوف احادیث پیش کی جاتی ہیں یا ایسے لوگوں کے اقوال پیش کئے جاتے ہیں جن کا قول حجت اور دلیل نہیں۔

اور اسی رسالہ ص ۱۶ میں لکھتے ہیں۔

وَأَمَّا السُّؤَالُ بِهِ مِنْ غَيْرِ إِقْسَامٍ  
بِهِ فَهَذَا الْيُسْرَ مَا مَنَعَ غَيْرُ وَاحِدٍ  
عَنِ الْعُلَمَاءِ وَالشُّنَنِ الصَّحِيحَةِ عَنِ  
النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَخَلْفَائِهِ  
الْمُرِيدِينَ تَذَلُّ عَلَى ذَلِكَ.

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے ذریعہ سے سوال کرنا اس طور پر کہ آپ پر قسم نہ بھی دلائی جاتے اس کو بھی متعدد علما نے منع فرمایا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح سنتیں اور خلفائے راشدین کا عمل اس کے منع پر دلالت کرتا ہے۔

اسی طرح حضرت حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ نے جا بجا اس قسم کی عبارات لکھی ہیں اور ان میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ بہت سے علما نے اس توسل سے منع فرمایا ہے اور یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ توسل کی یہ قسم آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے عہد مبارک میں نہیں تھی۔

پہلے دعویٰ کی حمایت میں انہوں نے وہ حدیثیں نقل کی ہیں جو غیر اللہ پر قسم کھانے کی ممانعت میں آتی ہیں۔ یا وہ اقوال جو اللہ کو کسی (غیر اللہ) مخلوق کی قسم دینے کے بارے میں ہیں۔

وہ اپنے دعویٰ کی تائید میں فقہائے احناف کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ۔  
وَيَكْرَهُ أَنْ يَقُولَ فِي دُعَائِهِ بِحَقِّ  
فُلَانٍ وَبِحَقِّ أُنْيَاكَ وَرُسُلِكَ  
یعنی دعائیں یہ کہنا کہ اے اللہ فلاں آدمی کے حق کے ذریعے یا تیرے نبیوں اور رسولوں کے

لَا تَنْتَ لَهُ حَقٌّ لِّلّٰهِ خَلْقًا -

(المائدہ ج ۴ ص ۴۷۵)

علیم السلام کا حق جو تجھ پر ہے اس کے وسیلہ سے میرا یہ کام کر دے (یا میری یہ دعا قبول کر لے)

یہ کننا مکروہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر مخلوق کا کوئی حق (واجب) نہیں البتہ جس کو اللہ تعالیٰ خود اپنی رحمت سے بغیر کسی وجوب کے خاص کر دے یا اپنے فضل و کرم سے اپنے بندوں کے لئے کسی چیز کا وعدہ کر لے تو یہ دوسری بات ہے کم و بیش اسی طرح کے الفاظ میں یہی مسئلہ خلاصۃ الفتاویٰ جلد ۴ صفحہ ۳۲۶، بحر الرائق جلد ۵ صفحہ ۲۰۷ اور الدر المختار جلد ۵ صفحہ ۲۵۴ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

اور حقیقت یہاں چار الگ الگ مسائل ہیں۔

**چار جہاں مسئلہ**

(۱) اول تو یہ کہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام کی قسم کھانا مثلاً یوں کہنا کہ فلاں (انسان) کی قسم یا کعبہ کی قسم میں یہ کام نہیں کروں گا۔ یہ بالاتفاق ناجائز اور ریح توحید کے خلاف ہے۔

(۲) دوسرا مسئلہ یہ کہ کسی مخلوق (یعنی اللہ کے سوا کسی اور) کی قسم اللہ تعالیٰ کو دی جاتے اس کو بعض علماء نے جائز لکھا ہے اور ثبوت میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک صحیح حدیث نقل کی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

رُبَّ أَشْعَثَ مَذْفُوعٍ بِالْأَبْوَابِ  
لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللَّهِ لَا بُدَّكَ -

(رواہ مسلم مشکوٰۃ)

لیکن یہ حدیث اُن کے لئے دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ یہاں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اگر ایسے لوگوں کی ذات کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ کو قسم دی جائے تو اللہ تعالیٰ اس قسم دینے والے کے سوال کو پورا کر دے گا۔ بلکہ یہاں تو خود انہی کی شخصیت کا حال بیان کیا جا رہا ہے اگر وہ خود اللہ پر قسم کھالیوں کہ اللہ کی قسم اللہ ضرور ایسا ایسا کرے گا تو اللہ پاک ان کو قسم پورا کر دے گا۔

دوسرا مسئلہ یہ کہ کسی کے حق کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا مثلاً یہ کہنا کہ

اے اللہ فلاں کا جو حق تجھ پر ہے اس کے ویسے سے میرا فلاں کام کر دے۔ اس کو بھی ہمارے علما نے ناجائز لکھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ کوئی چیز ضروری لازم یا واجب نہیں۔ البتہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے کرم و فضل سے کسی کو خاص کر دے یا کسی کیلئے کسی شے یا ثواب کا وعدہ فرمائے تو یہ ایسا حق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف سے مقرر کر رکھا ہے، نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ پر کسی مخلوق کا حق اصلاً ثابت ہے لیکن بعض علما اس کو جائز کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ بعض دعاؤں میں اسی طرح کے الفاظ موجود ہیں (اَلسَّيِّئَاتُ اَللّٰهُ اَسْ) کی مثالیں آئیں گی، اب جو لوگ ایسے الفاظ سے دعا کرنے کو جائز فرماتے ہیں وہ ان الفاظ کو حقیقی معنی میں نہیں لیتے بلکہ اس سے برکت، ثواب جس کا اللہ نے از خود وعدہ کیا ہے حرمت وغیرہ مراد لیتے ہیں۔ لیکن چونکہ ظاہری الفاظ سے حقیقی معانی بھی ذہن اور فہم میں آجاتے ہیں اس لئے یہاں پر بھی منع کو بہتر سمجھا جاتا ہے اور اسی کو ترجیح دی جاتی ہے۔

(۴) چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ کسی نیک شخص کے طفیل یا برکت کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے مثلاً اے اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل یا برکت سے میرا فلاں کام کر دے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر متقدمین (پہلے زمانے کے) فقہاء نے کوئی خاص بحث نہیں کی ہے۔ اور جو حضرات اس کو منع فرماتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ (توسل) اکثر متبوعین (یعنی وہ بڑے امام علماء جن کی امت مسلمہ نے پیروی کی ہے) کے ہاں نہیں تھا۔ اور اپنے قول کی تائید میں مذکور بالا حنفی فقہاء اور دیگر علمائے کرام کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ حضرات جو اس قسم کے توسل کے قائل ہیں وہ مخالفین کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ متقدمین میں سے کسی نے بھی اس کو منع نہیں فرمایا اور اس بات کی تائید بھی بعض فقہاء سے ظاہر ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ یہی توسل متقدمین فقہاء کے نزدیک بالاتفاق جائز ہے جیسا کہ حنابلہ کی کتابوں میں ہے۔

وَيَجُوزُ التَّوَسُّلُ بِصَالِحٍ وَقَبِيلٍ  
یعنی نیک شخص کے ذریعے توسل جائز ہے اور

يَسْتَعِيبُ قَالَ أَحْمَدُ فِي مَنْسِكِهِ الَّذِي  
كُتِبَ لِلْعَمْرِؤِ زِيَّ أَنَّهُ يَتَوَسَّلُ بِالنَّبِيِّ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي دُعَائِهِ وَ  
جَزَمَ بِهِ فِي الْمُسْتَوْعِبِ وَغَيْرِهِ ۵۹  
(الفروع ج ۱ ص ۵۹۵ وكذا في الكشاف القناع)

کہا گیا ہے کہ مستحب ہے (حضرت امام احمد  
مناسک حج میں فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم کے ذریعہ سے توسل کیا کریں اور کتب  
خاندان المستوعب وغیرہ میں اس پر تاکید کی گئی  
ہے اس پر یقین کیا گیا ہے۔

اکثر حنبلی فقہاء نے اس قول سے یہی اختلافی توسل ہی مراد لیا ہے۔ البتہ آج  
کل کے اکثر علمائے خاندان کا وہی نظریہ ہے جو حافظ ابن تیمیہ کا ہے۔ اور وہ امام احمد  
رحمہ اللہ کے اس قول کی تاویل کرتے ہیں جیسا کہ حامد فقہی نے کشاف القناع پر تعلق  
کر کے لکھا ہے۔

يُرِيدُ الْإِمَامُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ  
التَّوَسُّلَ بِطَاعَتِهِ وَاتِّبَاعِ هَدْيِهِ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا التَّوَسُّلَ بِجَاهِهِ -  
یعنی امام احمد رضی اللہ عنہ کی مراد یہاں رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع و اطاعت کرنے کے  
ذریعے توسل کرنا ہے نہ کہ ان کی جاہ (مرتبہ)

لیکن حامد فقہی نے امام احمد کے قول کی جو تاویل کی ہے وہ حقیقت سے دور  
معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حضرت امام نے تو صاف طور پر لکھا ہے کہ دعائیں آپ صلی اللہ  
علیہ وسلم کے ذریعہ توسل کیا کریں  
اسی طرح امام شافعی کے بارے میں تاریخ خطیب میں ہے جس کو عقود الجمان  
میں بھی نقل کیا گیا ہے کہ:

رَوَى الشَّافِعِيُّ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ الصَّمْبَرِيُّ  
وَالْخَطِيبُ عَنْ عَلِيِّ بْنِ مَيْمُونٍ قَالَ  
سَمِعْتُ الشَّافِعِيَّ يَقُولُ إِنِّي لَا تَبْرُكُ  
بِأَبِي حَنِيفَةَ (عقود الجمان ص ۳۶۳)

تو یعنی ابو عبد اللہ اور خطیب بغدادی علی بن ميمون  
سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے تھے کہ میں  
نے امام شافعی سے سنا ہے وہ کہتے تھے  
کہ میں امام ابو حنیفہ کے ذریعے سے تبرک  
حاصل کرتا ہوں۔  
(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسی طرح دیگر متقدمین فقہائے کرام کے اور اقوال بھی موجود ہیں جن سے ثابت کیا جاتا ہے کہ توسل کی یہ قسم ان کے یہاں مروج تھی اور انہوں نے اسے منع نہیں فرمایا لیکن حقیقت یہ ہے کہ متقدمین علماء نے اس قسم کے توسل پر کوئی واضح بحث نہیں کی ہے جس سے اس مسئلہ کی صحیح اور صاف نشاندہی ہو سکے۔ متاخرین (بعد کے دور میں آنے والے علماء) کے اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ یہی مسئلہ سلف صالحین میں موجود تھا۔ وہ ثبوت میں بعض احادیث اور ایسے قرآن مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر سلام کرنا یا واپاں جا کر دعا کی درخواست کرنا وغیرہ پیش کرتے ہیں، امام ابو حنیفہؒ سے بھی کچھ اشعار اس بارے میں نقل کئے گئے ہیں لیکن اشعار کا اعتبار اس مسئلہ میں اس لئے نہیں کیا جاسکتا کہ اکثر وہ غلبہٴ حال و محبت، انظار شوق یا بیداری کے غم کی وجہ سے ہو سکتے ہیں۔

اور جو حضرات یہ فرماتے ہیں کہ توسل کی یہ قسم متقدمین اور ائمہ کے ہاں نہیں تھی وہ عدم جواز پر متقدمین کے ایسے اقوال پیش کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی قسمینے (حاشیہ صفحہ گزشتہ) معقود الیمان فی مناقب الامام اعظم ابی حنیفۃ النعمان للمؤرخ الکبیر شیخ الاسلام محمد بن یوسف الصالحی الدمشقی الشافعی۔ مکتبۃ الامان السامیہ۔ المدینۃ المنورہ

لے اس قسم کی روایات کا تعلق مسئلہ استشفاع سے ہے۔  
 اسی حال ان غائبانہ خطابوں کا ہے جو بعض صادق زبانوں سے نکلی ہیں مثلاً یا رسول اللہ یا محمد اواہ محمد وغیرہ۔ یہ سب کچھ انظار محبت یا حسرت وغیرہ میں ہوا کرتے ہیں۔ جیسے مشق ماں اپنے بچے کی وفات کے بعد اس کا نام پکارتی ہے بشرطہ اپنے اشعار میں پیٹروں، جینکلوں، ہواؤں وغیرہ کو مخاطب ہوتے ہیں عشاق اپنے محبوبوں کو غائبانہ پکارتے ہیں حالانکہ یہاں کسی خطاب اور پکار سے واقعہٴ نذر پکار مقصود نہیں ہوتی۔ اور نہ ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ (یعنی جسے پکارا جاتا ہے) میری پکار کو سن رہا ہے، بلکہ یہ تو ایسی خطاب و پکار ہوا کرتی ہے جو عشق و محبت یا حسرت وغیرہ کی وجہ سے زبانوں پر جاری ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی نذر و پکار پر نہ تو واقعی احکام جاری ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ایسے خطابوں سے غائبانہ استشفاع اور توسل پر استدلال کرنا صحیح معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم

کے بارے میں ہیں یا مخلوق کے حق کے ذریعہ سے دُعا مانگنے کی ممانعت پر وارد ہوتے ہیں۔ حالانکہ متقدمین علماء نے ممانعت کی وجہ بھی صلاف بیان فرمائی ہے تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ پر کسی مخلوق کا حق ثابت ہے۔ ان کا قول واضح ہے إِنَّكَ لَا تَخْتَلِفُ عَلَيْهِ الْمَخْلُوقُ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى اللہ تعالیٰ پر کسی مخلوق کا کوئی حق نہیں۔ اب توسل کی اس قسم کو ناجائز کہنے والے حضرات درحقیقت مختلف مسائل کو غلط اطلاق کر رہے ہیں، اور فی الحقیقت متقدمین کے بعض افعال و اقوال اسی توسل کے جائز ہونے کی تائید کرتے ہیں (جیسا کہ اوپر گزر چکا، حضرات امام احمد و امام شافعی وغیرہ کے بارے میں)۔

اسی طرح متاخرین علماء کی اکثریت نے اس کے جواز کی تفسیر کی ہے۔ بعض نے اس پر مستقل رسالے لکھے ہیں حتیٰ کہ بعض علمائے احناف (جو کہ شرک و بدعت کے معاملہ میں نہایت حساس واقع ہوتے ہیں انہوں) نے بھی اس کے جواز پر تفسیر کی ہے جیسا کہ ملا علی قاری اپنی آخری تصنیف "شرح النقایہ" میں لکھتے ہیں۔

قِيلَ وَيَحْرُمُ أَنْ يَقُولَ فِي دُعَائِهِ بِحَقِّ  
فُلَانٍ نَبِيًّا كَانَ أَوْ وَلِيًّا أَوْ بِحَقِّ الْبَيْتِ  
أَوِ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ إِنَّكَ تَرْضَى لِلْخَلْقِ  
عَلَى اللَّهِ لَكِنْ قَدْ يُعَالَى أَنَّهُ لَا حَقَّ لَهُمْ  
وَجُوبًا مِنْ أَصْلِهِ لَكِنْ اللَّهُ جَعَلَ لَهُمْ  
حَقًّا فَضْلًا أَوْ يُرَادُ بِالْحَقِّ الْحَرَمَةُ  
وَالْعِظْمَةُ فَيَكُونُ مِنْ بَابِ التَّوَسُّلِ  
وَقَدْ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ  
وَقَدْ عُدَّ مِنْ آدَابِ الدُّعَاءِ التَّوَسُّلُ  
بِالْأَنْبِيَاءِ وَالْأَوْلِيَاءِ عَلَى مَا فِي الْحُضُنِ  
الْحَصِينِ جَاءَ دَوَائِدُ اللَّهِ هَرَفَتْ

کہا گیا ہے کہ حق فلاح چاہے نبی ہو یا ولی اللہ  
یا حق بیت اللہ یا حق مشعر الحرام دعائیں کہنا حرام  
ہے کیونکہ مخلوق کا کوئی حق اللہ پر نہیں ہے لیکن  
کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر مخلوق کا کوئی حق واجب  
نہیں سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے  
لئے حق اور فضل مقرر کر دیا ہے یا اس سے  
مراد ان کی حرمت اور عظمت کے ذریعہ سے  
(سوال کرنا ہے پس یہ وسیلہ کے باب (دائرہ)  
میں ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ  
اللہ تعالیٰ کے لئے وسیلہ و صونہ اور انبیاء اور  
اولیاء کے ذریعہ سے التوسل کرنا دعا کے آداب

أَسْأَلُكَ بِحَقِّ السَّائِلِينَ عَلَيْكَ  
وَبِحَقِّ مُمْشَايَ إِلَيْكَ فَإِنِّي لَمَدُّ  
أَخْرَجَ اسْتِشْرَاقًا لَمْ يَبْطُرْ أَوْ لَا  
بِرِيَاءٍ وَلَا سَمْعَةٍ .... الحديث

(شرح النفاہ ۲۶ ص ۱۹۶ وفی الطحاوی علی  
الدر المختار ۴۴ ص ۱۹۹)

میں سے ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے  
کہ اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اس حق  
کے ذریعہ سے جو سائلین (مانگنے والوں) کا تجھ پر  
بننا ہے اور سوال کرتا ہوں اس حق کے ذریعہ سے  
جو تیری رضا کے لئے میرے چلنے کی وجہ سے  
(تجھ پر ہے) پس میں نہیں نکلا ہرگز نہیں نکلا فخر  
کی وجہ سے اور نہ تجھ کی وجہ سے۔

اور علامہ کشمیری رحمہ اللہ کو اس مسئلہ میں کچھ تردد ہے، وہ فرماتے ہیں۔

یہ توسل متاخرین کے نزدیک جائز ہے اور حافظ  
ابن تیمیہ نے اس سے منع فرمایا ہے، میں خود  
اس میں متردد ہوں، کیونکہ ابن تیمیہ نے حضرت  
امام (ابو حنیفہ) کا قول تجرید قدوری سے نقل کیا  
ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے اسمائے مبارک کے  
بغیر (پکارے) کسی (مخلوق) کی قسم دینا جائز نہیں  
پس حافظ نے اللہ تعالیٰ کو قسم دینے کی ممانعت  
کو بنیاد بنا کر توسل کی نفی کی ہے، پس اگر توسل  
کا مطلب اللہ تعالیٰ کو قسم دینا ہے، پھر تو مسئلہ  
ایسا ہی ہے جیسے کہ حضرت حافظ فرماتے ہیں۔

وَهَذَا التَّحْوِجَاتُ عِنْدَ السَّائِرِينَ  
وَمَنْعُهُ الْإِذَا خُطِرَ رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى  
ابْنُ تَيْمِيَّةٍ وَإِنِّي مُتَرَدِّدٌ فِيهِ لِأَنَّهُ أَقْبَى  
إِعْبَارُهُ عَنِ إِلَهٍ مِمَّنْ تَجَرَّدَ الْقُدُورِيُّ  
إِنَّ إِلَهَ قَسَامٍ عَلَى اللَّهِ لَخَيْرٌ أَسْمَاءٍ  
لَهُ تَجَوُّزٌ فَتَقَسَّمُكَ بِنَفْيِ إِلَهٍ قَسَامٍ عَلَى  
لَفِي التَّوَسُّلِ فَإِنْ كَانَ التَّوَسُّلُ إِقْسَامًا  
فَالْمَسْأَلَةُ كَمَا ذَهَبَ إِلَيْهِ ابْنُ تَيْمِيَّةٍ  
رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى وَإِنْ لَمْ يَكُنْ إِقْسَامًا  
يَبْقَى جَائِزًا - (اد فیض الباری ص ۲۶۳، ۲۶۴)

اور اگر توسل اللہ تعالیٰ کو قسم دینا نہیں پھر مسئلہ جائز باقی رہتا ہے۔

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں، ترمذی شریف کی روایت میں ہے  
کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی کو جو اندھا تھا ان کلمات سے تعلیم دی۔ اے  
اللہ تیرے سامنے تیرے نبی محمد کے وسیلہ سے جو نبی رحمت ہے التجا کرتا ہوں پھر  
آگے (اعرابی نے) عرض کیا۔ اے اللہ تو ان (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کی سفارش کو میرے

حق میں قبول فرما فُتِبَتْ مِنْهُ التَّوَسُّلُ الْقَوْلُ الْيُسْرُ وَجَيْئُهُ بِذِكْرِ الْخَافِظِ  
ابْنِ تَيْمِيَّةٍ تَطَاوُلَ وَتَوَاسَّيَ قَوْلِي تَوَسُّلَ بِحُجَّتِهِ ثَابِتٌ هُوَ كَيْفَ لِهَذَا خَافِظِ ابْنِ تَيْمِيَّةٍ  
کا اس سے انکار زیادتی ہے (فیض الباری ج ۲ ص ۶۸)

یہاں علامہ آلوسی رحمہ اللہ تعالیٰ کا نظریہ ایسے مسائل میں ابن تیمیہ اور ان کے  
شاگردوں سے ملتا جلتا ہے۔ وہ ان مسائل پر گہری تحقیق کرتے ہوئے توسل کی اس  
نوع کے بارے میں لکھتے ہیں۔

وَبَعْدَ هَذَا أَكَلَهُ أَنَا لَا أَرَى بَأْسًا فِي التَّوَسُّلِ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى بِجَاهِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ  
تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ اللَّهِ تَعَالَى حَيًّا وَمَيِّتًا، وَبِرَأْسِهِ مِنَ الْجَاهِ مَحْنَى يَرْجِعُ إِلَى صِفَةِ  
مِنْ صِفَاتِهِ تَعَالَى، مِثْلُ أَنْ يَرَادَ بِهِ الْمَحَبَّةُ الْتَامَةُ الْمُسْتَدْعِيَّةُ عَدَمُ رَدِّهِ وَقَبُولُ  
شَفَاعَتِهِ، فَيَكُونُ مَعْنَى قَوْلِ الْقَائِلِ: إِلَهِي أَتَوَسَّلُ بِجَاهِ نَبِيِّكَ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ أَنْ تَقْضِيَ لِي حَاجَتِي بِإِلَهِي أَجْعَلَ مَحَبَّتَكَ لِي وَسِيلَةً فِي قَضَائِ حَاجَتِي، وَلَا فَرْقَ  
بَيْنَ هَذَا وَقَوْلِكَ: إِلَهِي أَتَوَسَّلُ بِرَحْمَتِكَ أَنْ تَفْعَلَ كَذَا إِذْ مَعْنَا الْيُسْرُ إِلَهِي أَجْعَلَ  
رَحْمَتَكَ وَسِيلَةً فِي فَعْلِ كَذَا، بَلْ لَا أَرَى بَأْسًا أَيْضًا بِالْإِقْسَامِ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى بِجَاهِهِ  
صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهَذَا الْمَعْنَى وَالْكَلَامُ فِي الْحَرَمَةِ كَالْكَلَامِ فِي الْجَاهِ، وَلَا يَجُوزُ  
ذَلِكَ. فِي التَّوَسُّلِ وَالْإِقْسَامِ بِالذَّاتِ - الْبَحْثُ - لَعَلَّ لَوْ يَعْهَدُ التَّوَسُّلُ بِالْجَاهِ وَالْحَرَمَةِ  
عَنْ أَحَدٍ مِنَ الصَّحَابَةِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمْ. وَلَعَلَّ ذَلِكَ كَانَ تَخَافُ شَيْئًا مِنْهُمْ عَمَّا يَخْشَى  
أَنْ يَلْقَى مِنْهُ فِي أَذْهَانِ النَّاسِ إِذَا ذَاكَ. وَهُوَ قَرِيبٌ مِمَّا يَعْهَدُ بِالتَّوَسُّلِ بِالْإِقْسَامِ شَيْءٌ  
تَعَارَفْتُمْ بِهِ مِنْ خَلْقِهِمْ مِنَ الْأُمَمَةِ الظَّاهِرِينَ، وَقَدْ تَرَكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ  
تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَذِهِ الْكَلِمَةَ وَمَا سَيِّسَهَا عَلَى قَوَاعِدِ ابْنِ أَبِيهِ لَكُونَ الْقَوْمُ حَدِيثِي عَهْدًا  
بِكُفْرٍ كَمَا ثَبَتَ ذَلِكَ فِي الصَّحِيحِ، وَهَذَا الَّذِي ذَكَرْتَهُ أَنَّمَا هُوَ لَدَفُ الْحُجْرَةِ عَنْ  
النَّاسِ وَالْفِرَارُ مِنْ دَعْوَى تَضْلِيلِهِمْ. كَمَا يُزَعَمُهُ الْبَعْضُ. فِي التَّوَسُّلِ بِجَاهِ عَرِيقِ  
الْجَاهِ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْعَيْلِ إِلَى أَنْ أَدْعَاهُ كَذَلِكَ أَفْضَلُ مِنْ اسْتِعْمَالِ الْأَدْعِيَةِ  
الْمَأْثُورَةِ الَّتِي جَاءَ بِهَا الْكِتَابُ وَصَحَّحْتُ بِهَا السَّنَةَ السَّنِيَّةَ، فَإِنَّهُ لَا يَسْتَرِيبُ مِنْ صِفَتِهِ فِي

ان ما علمہ اللہ تعالیٰ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وعلیہ الصحابة الکرام  
رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ وثلقاہ من بعدہم بالقبول افضل واجمع والنعہ واسلم فقد قيل  
عاقيل ان حقا وان كذا باربعی ههنا امران الاول ان التوسل بجاه غیر النبی صلی اللہ  
تعالیٰ علیہ وسلم لا بأس به ایضاً ان كان المتوسل بجاهه مما علم ان له جاهاً عند اللہ تعالیٰ  
كما لمقطوع بصاحبه وولایته واما من لا تقطع فی حقه بذلك فلا يتوسل بجاهه لما فیہ  
من الحکما الضمنی علی اللہ تعالیٰ بما لم یعلم تحققه منه عز شأنه، وفي ذلك جرأة  
عظيمة علی اللہ تعالیٰ الثاني ان الناس قد اکثر وامن دعاء غیر اللہ تعالیٰ من الاله ولاء  
الرحیاء منهم والاموات وغيرهم، مثل یاسیدی فلان اغثنی، وليس ذلك من  
التوسل المباح فی شئ، واللہ نقی بحال المؤمن عدم التقویٰ بذلك وان لا یحوم حول حجاب  
وقد عدہ اناس من العلماء مشرکاً وان لا یکتبه، فهو قریب منه ولا یرى احدا ممن  
یقول ذلك الا وهو یعتقد ان المدعو الحی الغائب او الہیت المغیب یعلموا الغیب  
او یسمع النداء ویقدر بالذات او بالغیر علی جلب الخیر ودفع الازی و الالهام دعا  
ولا فتمح فاه، وفي ذلک بلاء من ربکوعظیوم فالعزم التجنب عن ذلك وعدم  
الطلب الا من اللہ تعالیٰ القوی الغنی الفعال لما یرید۔

یعنی اس تمام تر بحث کے بعد بھی مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جاہ پر توسل  
الی اللہ میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا، چاہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی حالت  
میں ہو، یا رحلت فرمانے کے بعد ہو، اور جاہ سے کوئی ایسا معنی مراد لیا جائے گا، جو  
اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت کی طرف راجع ہو، مثلاً اس سے مراد یہ ہو  
کہ ایسی بکلی اور سچی محبت جو عدم رد اور قبول شفاعت کا تقاضا کرتی ہو، پس اس صورت  
میں قائل کے اس قول، اے میرے اللہ میں توسل کرتا ہوں، آپ کے نبی کی جاہ پر کہ  
آپ میری حاجت پوری کریں، کا مطلب یہ ہو گا، اے میرے مولا! تجھے جو محبت آپ صلی اللہ  
علیہ وسلم کے ساتھ ہے، اس محبت، کو میری حاجت پوری کرنے کا وسیلہ بنادیں، پس  
اس قول میں اور آپ کے اس قول میں کوئی فرق نہیں، کہ اے اللہ میں توسل کرتا ہوں

آپ کی رحمت پر کہ آپ ایسا کر دیجئے۔ کیونکہ اس کا منہوم بھی یہ بنتا ہے۔ اسے اللہ اپنی رحمت کو (میرے لئے) وسیلہ بنا دے۔ اس عمل میں بلکہ (میرے نزدیک) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جاہ پر اللہ کو قسم دینے میں بھی مضائقہ نہیں۔ اگر یہی (پہلے بیان کردہ) معنی اختیار کئے جائیں۔ اور (آپ کی) حرمت کے ذریعہ سے مانگنے میں ایسا ہی کلام ہے جیسا کہ جاہ کے ذریعہ سے مانگنے میں۔ اور اس جواز کو صرف ذات ہی پر توسل اور اقسام میں نہیں جاری کیا جائے گا۔ البتہ یہ ہے کہ توسل بالجہ کسی صحابی سے مروی نہیں اور شاید انہوں نے یہ توسل اس لئے نہیں کیا ہو کہ شرک سے حفاظت ہو۔ کیونکہ اس وقت یہ ڈرتھا کہ یہ چیز ان کے اذہان میں پیوست نہ ہو جاتے۔ اس لئے کہ وہ اس وقت توسل پر توسل کے زمانے سے کچھ قریب تھے۔ پھر آنے والے ائمہ صالحین نے ان کی اقتدائی کی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کو گرانے اور اس کو دوبارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طرز اور بنیاد پر بنانے (کے خیال) کو ترک کر دیا تھا۔ کیونکہ ان کی قوم زمانہ کفر کے قریب ملتی جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ اور میں نے جو جواز ذکر کیا ہے۔ (صرف) اس لئے کہ اس میں لوگوں سے حرج دفع ہو جاتے۔ اور توسل کرنے والوں کی طرف گمراہی کی نسبت کرنے سے بچایا جاتے۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند ہستی پر توسل کرنے کے بارے میں (یہ غلط گمان ہے) کہ ان پر توسل کرنے والے گمراہ ہیں، اور میں نے جو یہ راہ اختیار کی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ میرا میلان اسی طرف ہے کہ اس طرح (توسل بالجہ سے) دُعا مانگنا ان دعاؤں سے افضل ہے جو ماثورہ ہیں اور قرآن میں آتی ہیں۔ اور سنت (مبارک) کی زبان سے صراحت کے ساتھ نکلی ہیں، کیونکہ اس بات میں کوئی منصف شک نہیں کرے گا کہ جو چیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے تعلیم کی ہے جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عمل کیا ہے اور بعد والوں نے اس کو قبول کیا ہے وہ افضل ہے اور بہت اکامل پوری ہے اور النفع ہے اور اسلم ہے۔ اور (ہر قسم کے) غل و غش سے محفوظ (پاک) ہے۔

اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں۔

یہاں دو باتیں باقی ہیں۔ ایک تو یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کی جاہ کے ذریعہ پر بھی دُعا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ اُجس کی جاہ پر توسل کیا جاتا ہے وہ ایسے لوگوں میں سے ہو جس کی جاہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ثابت ہو۔ جیسے کوئی یقینی طور پر صالح اور ولی اللہ ہو (مثلاً انبیاء علیہم السلام اور وہ لوگ جن کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر بتایا ہو مثلاً عشرہ مبشرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جس کے بارے میں ولی اور صالح ہونا ثابت نہیں تو اس کی جاہ پر توسل نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ پر ایسا حکم لگانا ہے جس کے بارے میں حق تعالیٰ و تبارک کی طرف سے کوئی (سچی) تحقیقی بات نہیں معلوم اس میں اللہ پر ایک عظیم جرات کرنا ہے۔

دوسری بات یہ ہے لوگوں نے غیر اللہ سے مانگنے میں بہت کثرت کی یعنی زندہ یا مُردہ اولیا۔ سے شکالیوں کہتے ہیں اے فلاں میری مدد کر! اور یہ مباح توسل میں سے نہیں ہے اور مومن کی شان تو یہ ہے کہ وہ اس میں نہ پڑے۔ اور وہ شرک کی حدود کے قریب (بھی) نہ جائے۔ اور اس کو علما۔ نے شرک میں سے شمار کیا ہے اور (اگر) یہ شرک نہیں ہے تو اس کے قریب ہے۔ اور میں نہیں دیکھتا کسی کو جو یہ (ایسی باتیں کہ اے فلاں میری مدد کر! کہتا ہو مگر وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جس کو وہ پکار رہا ہے (چاہے) وہ زندہ ہے یا مُردہ) وہ غیب کو جانتا ہے اور ہماری نذا کو سنتا ہے۔ اور بذات خود قدرت رکھتا ہے اپنی ذات پر بھی اور غیر پر بھی کُخیر کو حاصل کرے اور مصیبت کو دفع کرے۔ اگر یہ (اس کا عقیدہ) نہ ہو تو وہ دعا مانگنے والا (اس سے دُعا نہ مانگتا اور نہ دُعا کے لئے منہ کھولتا اور اس غلط طرز عمل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم آزمائش ہے۔ پس یقینی بات یہ ہے کہ اس سے پرہیز کرنا اور اس رب اللہ تعالیٰ و تبارک سے مانگنا چاہیے جو کہ قوی اور غنی ہے۔ اور وہ کرنے والا ہے اس چیز کو جو وہ چاہے وہ فعال لما یرید ہے۔

حضرت حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے دوسری بات یہ کہی تھی کہ یہ توسل (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل یا جاہ کے ذریعہ سے سوال کرنا) نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اس توسل کو اختیار کیا تھا گویا ان کے نزدیک یہ بدعت ہے۔

اس پر وہ حضرت عمر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے واقعات سے استدلال کرتے ہیں جیسا کہ بخاری شریف ابواب الاستسقا میں ہے۔

(۱) عن أنس بن مالك أن عمر بن الخطاب كان إذا قحطوا استسقى بالعباس بن عبد المطلب رضي الله عنه فقال اللهم انا كنا نتوسل اليك بنبينا صلي الله عليه وسلم فنتسقين وانا نتوسل اليك بعمر بنينا فاستقمنا قال فيسقون (بخاری ۱۶ ص ۱۳۷)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہو جاتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے بارش کی دعا کرتے اور کہتے اے اللہ تم میرے پاس میرے بیٹی کا وسیلہ لے کر آیا کرتے تھے تو تو ہمیں سیر کیا کرتا تھا اب ہم لوگ اپنے نبی کے چچا یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا وسیلہ لے کر آتے ہیں، ہیں سیر کیا

(راوی کہتے ہیں) پھر وہ لوگ سیراب کئے جاتے (یعنی بارش ہو جاتی)

(۲) اسی طرح شام میں جب لوگوں پر قحط پڑا تو معاویہ بن سفیان رضی اللہ عنہ نے حضرت یزید بن اسود قرشی رضی اللہ عنہ کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے دعا کی وہ کہتے تھے اللهم نستشفع اونتوسل بخيارنا اے اللہ ہم شفاعت طلب کرتے ہیں یا وسیلہ اختیار کرتے ہیں ان لوگوں کا جو ہم میں سے بہترین سب سے زیادہ نیک ہیں پھر اس کے بعد فرمایا۔

يا يزيد ارفع يدك عن رفع يدية ودعا الناس حتى يسقوا۔

اے یزید ہاتھ اٹھا یعنی دعا کر، تو انہوں نے ہاتھ اٹھاتے اور دعا کی اور لوگوں نے بھی دعا کی حتیٰ کہ وہ سیراب کئے گئے۔

ان حدیثوں کے پیش نظر حافظ ابن تیمیہ اور ان کے ہم خیال حضرات کی بحث کا

خلاصہ یہ ہے کہ:-

اگر وفات کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے وسیلہ سے دُعا مانگنی جائز ہوتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی آپ کو نظر انداز نہ کرتے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مجمع میں آپ کا وسیلہ چھوڑ کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا وسیلہ کبھی اختیار نہ کرتے۔ اسی طرح ان کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ چھوڑ کر یزید بن اسود رضی اللہ عنہ کا وسیلہ اختیار کیا۔ تو یہ واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ کسی بھی مخلوق کی ذات کو توسل کا ذریعہ بنانا جائز نہیں چاہے وہ زندہ ہو یا مردہ۔ کیونکہ یہاں بھی حضرت عباسؓ کی ذات کو ذریعہ نہیں بنایا گیا اور نہ توسل الیک بعونہینا سے مراد توسل الیک بدعا و عقیقہ نہینا ہے یعنی ہم لوگ اپنے نبی کے چچا کی دعا کا وسیلہ لے کر آتے ہیں یہاں اُن سے دُعا کروانا مقصود و محتاج نہ ان کی ذات پر توسل کرنا۔

اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ یہاں یہ دعویٰ کرنا کہ لفظ دُعا جو مضاف ہے عم یعنی چچا کی طرف، کو حذف کیا گیا ہے۔ غلط ہے۔ یہ محض ان کے ذہن کی ایجاد ہے حدیث شریف اس سے پاک ہے۔ اس حدیث میں تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ذات کو وسیلہ اور واسطہ بنا کر حضرت عمرؓ کا دُعا مانگنا ثابت ہوتا ہے اور منکرین توسل اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ ہمارے ذہن کی ایجاد نہیں بلکہ ان ہی روایات میں اس کا قرینہ موجود ہے۔ وہ یہ کہ پھر ان ہی حضرات سے دعا کروائی گئی جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں توسل سے مراد صرف ان سے دعا کروانی تھی۔ نہ کہ ان کی ذات پر توسل کرنا۔ اور قائلین توسل کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت معاویہؓ نے یزید بن اسودؓ پر توسل کرنے کے بعد انہی سے دعا کروائی۔ اس طرح بعض روایات میں حضرت عمرؓ کے بارے میں بھی یہ آتا ہے کہ پہلے حضرت عمرؓ نے دُعا مانگی اور پھر انکی درخواست پر حضرت عباسؓ نے بھی دعا کی جس سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک نیک آدمی دوسرے نیک آدمی سے دعا کے لئے گزارش کر سکتا ہے، اگرچہ وہ اس سے درجہ میں کم

ہو، بڑے یا چھوٹے ہونے کا فرق نہیں، حدیث ابی صالح میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ منبر پر رونق افروز ہوتے تو ساتھ ہی حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی تشریف فرما ہوتے۔ پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دعا کی۔

اللھم انا تو جھنا الیک بعونک  
و صلو ابید فاستننا الغیث ولا تجعلنا  
من القانطین۔  
اے اللہ ہم تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور  
ان کے باپ کی مثل کے وسیلے سے تیری طرف متوجہ  
ہوتے ہیں ہم پر رحمت کر بارش برسا اور ہمیں  
میلوس نہ فرما۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ قل یا  
ابا الفضل کہ آپ بھی کچھ فرمائیے اے ابو الفضل۔ تو انہوں نے یوں دعا کی جس کا مفہوم  
یہ ہے۔

اللھم لعلی یزول بلاء الابدن  
ولعلی یکشف الابدن و قد  
توجہ الی القوم الیک بالذنوب  
ولوا صینا بالتوبۃ فاستننا الغیث  
آپ کے حضور میں وسیلہ بنایا ہے ہم اپنے گناہ آلودہ ہاتھ پھیلاتے حاضر ہیں اور توبہ و ندامت سے سر  
جھکاتے ہیں۔ پس ہم پر رحمت کی بارش برسا۔

اس سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت عباسؓ پر توسل کے ساتھ ساتھ  
ان سے دعا کروانا بھی مقصود تھا۔

اور علامۃ الزمر قافی رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے  
فاتخذ وہ (یعنی العباس) وسیلۃ الی اللہ۔ یعنی حضرت عباسؓ کو اللہ تعالیٰ کے  
لئے وسیلہ پکڑو، بلکہ الاستیعاب میں ابن عبد البرؒ نے استفادہ عمر رضی اللہ عنہ کا سبب  
بھی بیان کیا ہے۔

کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں بحالہ (رماد) میں بہت سخت قحط پڑ گیا۔ فقال

کعب بن یامیر المؤمنین ان بنی اسرائیل کا نوا اذ اصابہم مثل هذا استسقوا  
 بعضہ الہ نبیاء فقال عمرؓ هذا عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصنوبہ  
 وسید بنی ہاشم فمشی الیہ عمرؓ وشکا الیہ تو حضرت کعبؓ نے حضرت  
 عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا اے امیر المؤمنین جب بنی اسرائیل ایسی مصیبت میں  
 مبتلا ہوتے تو انبیاء علیہم السلام کی جماعت کے ذریعے توسل کرتے تو حضرت عمر  
 رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور مثل باپ ہیں۔ اور  
 بنی ہاشم کے سردار ہیں۔ پس اُن کے پاس چلے گئے اور اس قحط کی شکایت کی جس  
 سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں توسل بالذات ہے جو کہ قرابت رسول اللہ صلی اللہ  
 علیہ وسلم کی وجہ سے ہے۔

جب توسل بالذات ثابت ہو جاتا ہے تو اس حدیث کی وجہ سے جواز  
 توسل کو صرف زندوں کے ساتھ خاص کرنا بھی صحیح نہیں کیونکہ مانگنا تو اللہ تعالیٰ  
 ہی سے ہے۔ زندہ شخصیت پر توسل تو اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا  
 نیک اور مقرب و مقبول بندہ ہے۔ اگر وہ وفات پا جاتا ہے تو موت کے ساتھ  
 اس کی نیکی اور مقبولیت تو زائل نہیں ہو جاتی کہ ان کے مرنے کے بعد توسل کو لغو  
 یا ناجائز قرار دیا جائے۔

پس حضرت عباسؓ کے واسطے سے دعا کرنے سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے  
 کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے توسل صحابہؓ کے ہاں ناجائز تھا۔ اور نہ ہی انہوں  
 نے وضاحت کی ہے کہ آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کا وسیلہ اختیار کرنا چونکہ جائز  
 نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے مجبوراً آپؐ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنایا۔ بلکہ  
 حدیث میں یہ جملہ قابل غور ہے۔ انا توسل الیک بعم نبینا ہم تیرے حضور میں اپنے  
 نبی کے چچا کا وسیلہ لے کر آتے ہیں۔ یہ نہیں کہا گیا کہ ہم تیرے حضور میں عباس بن  
 عبد المطلب یعنی عباس جو بیٹا عبد المطلب کا ہے کا وسیلہ لے کر آتے ہیں جس  
 سے معلوم ہوتا ہے اس میں بھی دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو وسیلہ بنایا گیا ہے

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کا اظہار کیا گیا ہے۔ بلکہ اس حدیث مبارک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ توسل، زیادہ نیک آدمی یا فاضل کی موجودگی میں بھی ایک کم درجہ کے نیک آدمی یا مفضول کے ذریعے بھی جانتا ہے۔ جیسا کہ کسی سے دعا کی درخواست کرنا، فاضل اور مفضول دونوں سے جانتا ہے۔

اور اس کا جواب یوں دیا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایات سے تو صاف ظاہر یہ ہے کہ مفسودان حضرات کا حضرت عباسؓ اور حضرت یزید بن اسودؓ کے وسیلہ اور ذریعہ اللہ تعالیٰ سے بارش کی درخواست کرنی تھی، اور اس کے لئے انہی حضرات سے دعا کروانی تھی۔ ہر کسی ذات پر توسل کرنا تو ان روایات میں اس کا بہت کم احتمال ہے، غرض مذکورہ بالا روایات میں تائید اور مانعین دونوں کے لئے بحث مباحثہ کی کافی گنجائش موجود ہے۔ اور جو لوگ توسل کا انکار کرتے ہیں وہ طبرانی وغیرہ کی ایک حدیث سے اس کے منع پر استدلال کرتے ہیں وہ یہ ہے۔

ایک منافق مسلمانوں کو تکلیف پہنچایا کرتا تھا۔ تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ قوموا لتغیث برسول اللہ من هذا المنافق فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انه لا يستغاث بي وانما يستغاث باللہ، چلو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس منافق کے خلاف فریاد لے جائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فریاد مجھ سے نہیں کی جاتی، فریاد تو خاص اللہ تعالیٰ ہی سے کی جاتی ہے۔

اس حدیث کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اگر اس کو مانا لے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب بھی قحط ہوتا اس کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر استغاثہ (بارش مانگنے کی دعا کرنا) اور ان کو دوا مانگ کرنا، اللہ تعالیٰ کی بارش کے بارے میں انہی سے دعا کرنا تو یہ۔ ری باتیں ایسی ہیں جن سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا توسل حضرت عباسؓ پر تھا۔ لکن سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرواتے تھے، ان کی ذات کو وسیلہ بنا کر اور خود اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کرتے کہ اللہ آپ کے نبی کے فضیل ہم پر بارش نازل فرماتے۔

بھی جلتے تو اس کا صحیح مفہوم اور تفصیل ایک دوسری حدیث شریف سے معلوم کیا جاسکتا ہے جیسا کہ سنن ابی داؤد میں جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا: جانیں مشقت میں ڈال دی گئی ہیں اور اہل و عیال مجھ کے ہیں، اموال میں نقصان پڑ گیا ہے اور مویشی ہلاک ہو گئے ہیں۔

فاستسق اللہ لنا فانما نستشفع بك على الله ونستشفع بالله عليك فقال النبي صلى الله عليه وسلم سبحان الله سبحان الله فما زال يسبح حتى عرف ذلك في وجوه اصحابه ثم قال ويحك انه لا يستشفع بالله على احد شان الله اعظم من ذلك (رواه ابو داؤد مشخوۃ باب بداء الخلق)

سو آپ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کریں، ہم آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے شفاعت طلب کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ذریعہ آپ سے شفاعت طلب کرتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سبحان اللہ سبحان اللہ آپ دیر تک تسبیح پڑھتے رہے یہاں تک کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے چہروں پر اس اعرابی کے لئے غضب کے آثار ظاہر ہو گئے، پھر آپ نے فرمایا تیری حالت پر انہوں نے اللہ

تعالیٰ کو ذریعہ بنا کر کسی سے شفاعت نہیں کی جاتی، اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بڑی ہے۔

اب یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعرابی کے اس قول نستشفع بالله عليك (یعنی ہم اللہ کو ذریعہ بناتے ہیں آپ کے پاس شفاعت کا) کی توتر دید کی اور منع فرمایا لیکن اس کے پہلے قول انما نستشفع بك على الله (کہ ہم آپ کو ذریعہ بناتے ہیں اللہ کے ہاں شفاعت کا) پر کوئی انکار نہیں فرمایا اور اس قول کو جو از پر ہی برقرار رکھ دیا گیا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی حدیث شریف کا بھی یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ذریعہ بنا کر کسی مخلوق سے فریاد یا شفاعت نہیں طلب کی جاتی، لیکن مخلوق کو ذریعہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے توسل اور شفاعت جائز ہے۔

لیکن اس کا جواب منکرین توسل یہ دیتے ہیں کہ مخلوق پر توسل اور ان سے سفارش کروانے سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ زندہ ہے تو ان سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی

درخواست کی جائے نہ کہ اس کی شخصیت پر توسل کرنا۔

**قائلین توسل کے دلائل** | الفرض جن احادیث سے حافظ ابن تیمیہ اور ان کے ہم خیال متنازع فیہ توسل کے منع پر استدلال کرتے ہیں انہی روایات اور متقدمین کے اقوال سے ان کے مخالفین اس کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ توسل کے قائلین قرآن مجید کی آیات، احادیث اور آثار بھی جواز میں پیش کرتے ہیں، جن میں سے چند حوالے پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۱۔ وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَهُ اللَّهُ عَلَى الْكَافِرِينَ۔

اور جب آئی ان کے پاس کتاب (قرآن مجید) جو تصدیق کرتی ہے اس کتاب (توراة) کی جو ان کے پاس ہے اور وہ اس سے قبل اس کی برکت سے کافروں پر فتح مانگتے تھے تو پھر جب ان کے پاس وہ نبی آئے جسے وہ جانتے تھے تو انکار کر دیا اس

(سورۃ البقرہ آیت نمبر ۸۹) کے ماننے سے، سو پھر کفار ہو کر کفر کرنے والوں پر۔

یہاں یہود کے دانستہ کفر اور تعصب کی ایک مثال بیان کی گئی ہے، توراة اور انجیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو اشارتیں موجود تھیں، ان کی وجہ سے یہود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا شدید انتظار کر رہے تھے، اور اپنے دینی و دنیاوی مقاصد میں کامیابی اور اپنے مخالفین پر فتح مندی کو آپ کی بعثت پر منحصر سمجھتے تھے وہ اللہ تعالیٰ سے جس طرح فتح طلب کرتے تھے اس کے بارے میں مختلف اسباب نزول آئے ہیں ان میں سے دو کو عام طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اور یہ دونوں باقی شان نزول سے زیادہ قوی ہیں۔ پہلی شان نزول علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ کی روایت سے نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل بنی قریظہ اور بنی نضیر کے یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے اوس اور خزرج کے مشرکین پر اللہ تعالیٰ سے فتح مانگتے تھے جیسا کہ سدی سے روایت ہے کہ جب ان کے اور مشرکین کے درمیان جنگ سخت ہو جاتی اور فتح کی کوئی

ظاہری صورت نہ رہتی تو اس وقت تو رات کو سامنے رکھ کر کھولتے اور ان مقامات پر ہاتھ رکھ کر دعا کرتے، جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور کمالات کا ذکر تھا دُعا یوں کرتے۔

اللہم انا نسئلك بحق نبیک الذی وعدتنا ان نبعث فی آخر الزمان ان تنصرنا الیوم علی عدونا فینصرون  
اے اللہ ہم تجھ سے تیرے اس نبی کے حق یعنی حرمت اور طفیل سے) سے سوال کرتے ہیں۔ جس کی بعثت کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ آج تو ہمیں اپنے دشمن پر فتح دے، پس ان کی مدد کی جاتی

ورود المعانی ج۱ الطبع بلاق مصر)  
حاکم اور ہیثمی نے ایک ضعیف سند سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی قسم کی روایت نقل کی ہے جس میں ہے کہ خبیر کے یہود دشمن کے مقابلے میں اس طرح دعا کرتے تھے۔

اللہم انا نسئلك بحق محمد النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجہ لنا فی آخر الزمان۔  
اے اللہ ہم تجھ سے اُمّی نبی محمد کے حق یعنی حرمت طفیل سے) سے سوال کرتے ہیں، وہ نبی جس کا تو نے ہمارے ساتھ وعدہ فرمایا ہے کہ تو اس کو

ہمارے لئے آخری زمانہ میں مبعوث فرمائے گا۔

اس کے علاوہ تفسیر کبیر میں علامہ رازی نے اس آیت کی شان نزول میں پانچ وجوہ تحریر کی ہیں۔ ان میں سے دو ایسی ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہود کا توسل کرنا ثابت ہوتا ہے، اور تفسیر ابن کثیر میں بھی اس کے قریب قریب روایت نقل کی گئی ہے، اگرچہ ان کے نزدیک ترجیح دوسری روایت کو معلوم ہوتی ہے، اسی طرح تفسیر علامہ ابی مسعود اور امام البیہقی نے بھی اپنی تفسیر میں کچھ ایسی روایتیں جمع کی ہیں جن میں بعض سے توسل بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم صراحت ثابت ہوتا ہے۔

(دیکھئے الدر المنثور ج ۱ ص ۸۸)

دوسری وجہ سبب نزول میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اہل کتاب اپنی ترقی اور فتنہ دہی کا انحصار آپ کی بعثت اور تشریف آوری پر سمجھتے تھے اور مشرکین عرب سے کہتے تھے

کہ عنقریب محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائیں گے تو ہم ان کے ساتھ مل کر تم کو ختم کر ڈالیں گے۔ جیسا کہ تفسیر ابن کثیر میں اس کو قنادہ سے نقل کیا گیا ہے اور ابوالعلاء رحمہ اللہ سے بھی اس کی یہی تفسیر منقول ہے کہ:-

كانت اليهود تستنصر بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم علی مشرک العرب فيقولون اللهم البعث هذا النبي الذي نبأنا عندنا حتى نعذب المشركين ونقتل يهود  
یہود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مشرکین عرب کے مقابلہ میں نصرت طلب کرتے تھے کہتے تھے اے اللہ بھیج یہ نبی جس کا ذکر ہم زبور و انجیل میں اپنے پاس لکھا ہوا پاتے ہیں تاکہ ہم مشرکین کو عذاب دیں اور ان کو قتل کر دیں۔

(ابن کثیر ج ۱ ص ۱۲۴)

اسی طرح تھوڑے سے فرق کے ساتھ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت منقول ہے۔

الخرم اہل کتاب کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے فتح و نصرت طلب کرنے کا مطلب، ان روایات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ آپ عنقریب دنیا میں تشریف لائیں گے تو ہم ان کے ساتھ ہو کر مشرکین کے خلاف جنگ کریں گے اور ان پر فتح حاصل کریں گے پس وہ اللہ سے یہی سوال کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس نبی موعود کو جلد ہی بھیج دے تاکہ ان کو فتح حاصل ہو جائے۔

اب جو حضرات توسل کو منع فرماتے ہیں وہ اس دوسری روایت کو لیتے ہیں اور سبب نزول کی پہلی مذکورہ روایت کو دوسری کی نسبت کمزور سمجھتے تھے جب دوسری روایت زیادہ قوی ہوتی تو اس آیت سے توسل بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم پر استدلال صحیح نہیں بلکہ بعض مفسرین نے اس آیت کریمہ کی تفسیر یہ کی ہے کہ آپ کی بعثت سے قبل وہ آپ کے اوصاف حمیدہ بیان کرتے تھے ایک نبی آنے والے ہیں اور ایک کتاب لانے والے ہیں مگر آپ کی بعثت کے بعد وہ منکر ہو گئے۔ لیکن اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ان دونوں روایتوں میں تقابلی یا تضاد کی کوئی وجہ نہیں کہ ایک کو تو

مان لیا جائے اور دوسری کو مکمل طور پر خارج کر دیا جائے، بلکہ دونوں روایتیں اپنی جگہ صحیح ہو سکتی ہیں۔ اہل کتاب آپ کی ذات مبارک کو توسل کا ذریعہ بھی بناتے ہوں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی دعا بھی کرتے ہوں گے اور یہی بات اس دوسری تفسیر کے بارے میں بھی کہی جاتی ہے کہ اہل کتاب مشرکین عرب کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ بیان کرتے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے دعا بھی مانگتے۔ اس میں تقابل و تعارض نہیں، اسی طرح جتنی تفسیریں اور اسباب نزول بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے کوئی تضاد ایسا نہیں کہ ایک کو مان لیا جائے تو دوسرے کے لئے کوئی گنجائش نہ رہے، بلکہ حافظ ابن تیمیہ کے شاگرد حافظ ابی نعیم رحمہ اللہ نے بھی بدائع الفوائد میں پہلی تفسیر کو نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں

ان الیہود یدعیار لون جیرانہم من العرب فی الجاہلیہ ولستنقصون علیہم بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم قبل ظہورہ فیفتح لہم وینصرون علیہم۔ ۱۵ (بدائع الفوائد ج ۲ ص ۱۳۵)

نماز باہلیت میں یہود اپنے عرب پڑوسیوں سے لڑتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یعنی ان کے وسیلے سے نصرت اور مدد طلب کرتے تھے تو ان کو فتح ہو جاتی اور ان کی مدد کی جاتی۔

۱۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ حضرت

## قابلین کا احادیث سے استدلال

آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے جب (مقبول کمر) الخرش ہوئی (جس کی وجہ سے جنت سے دنیا میں بھیج دیتے گئے) تو ہر وقت روتے تھے اور دعا واستغفار کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ آسمان کی طرف منہ کیا اور عرض کیا: اسئلک بحق محمد غفر لہ۔ اے اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں، وحی نازل ہوئی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون میل (جن کے واسطے سے تم نے استغفار کیا، عرض کیا کہ جب آپ نے مجھے پیدا کیا تو میں نے عرش پر لکھا ہوا دیکھا تھا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ تو میں سمجھ گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے (مخلوق میں) اونچی ہستی نہیں ہے جن

کا نام آپ نے اپنے نام کے ساتھ رکھا ہے۔ وحی نازل ہوتی کہ وہ خاتم النبیین ہیں۔  
 تمہاری اولاد میں سے ہیں، لیکن وہ نہ ہوتے تو تم پیدا نہ کئے جاتے۔  
 اس کے جواب میں منکرین تو سل فرماتے ہیں کہ پہلے تو یہ حدیث بہت کمزور  
 ہے دوسرے یہ کہ قرآن مجید کے مقابل ہے، اس لئے اس پر کسی طرح استدلال نہیں  
 ہو سکتا۔ قرآن مجید اور دوسری صحیح احادیث میں حضرت آدم علیہ السلام کی جو دعائیں ذکر  
 ہیں ان میں اس کی طرف اشارہ تک نہیں۔

لیکن اس اعتراض کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ فی الواقع حضرت آدم علیہ السلام  
 نے اس وقت کیا کیا دعائیں کی ہوں گی اور کس کس طرح سے گڑ گڑاتے ہوں گے۔  
 اس بارے میں بہت سی روایات وارد ہوتی ہیں، اور ان میں کوئی تعارض اور تقابل  
 نہیں، کیونکہ جس پر مالک کی ناراضگی ہو وہی جانتا ہے کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے  
 پھر ایسے شخص پر جس کو فرشتوں سے سجدہ کروایا، اپنا مقرب بنایا، جو شخص جتنا مقرب  
 ہوتا ہے اتنا ہی عتاب کا اثر اس پر زیادہ ہوتا ہے، بشرطیکہ مکینہ نہ ہو اور وہ تو نبی  
 تھے حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام اتنے روتے تھے کہ تمام  
 دنیا کے آدمیوں کا رونا اگر جمع کیا جائے تو ان کے برابر نہیں ہو سکتا، چالیس سال تک  
 سر اوپر نہیں اٹھایا اس لئے اگر دوسری دعاؤں کے ساتھ یہ بھی ہو کہ انہوں نے حضور  
 صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ اختیار فرمایا ہو تو اس میں تعارض اور تضاد کی بات نہیں البتہ  
 حدیث ضعیف ضرور ہے لیکن اس تو سل کے بارے میں اور احادیث بھی ہیں جن سے  
 اس کی تائید ہو سکتی ہے۔

(۲) عن امیہ بن خالد بن عبد اللہ  
 بن اسید عن النبی صلی اللہ  
 حضرت امیہ بن خالد بن اسید نبی کریم صلی اللہ  
 علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ

لے أخرجه الطبرانی فی الصغير والحاکم والبیہقی کلاهما فی الدلائل وابن عساکر فی الدرر وفی مجمع الزوائد  
 رواه الطبرانی فی الاوسط وفیه من لم اعرفہم۔

علیہ وسلم انہ کان لیستفتح بصعاليك  
المہاجرین۔  
علیہ وسلم فقراء مہاجرین کے ذریعہ اللہ تعالیٰ  
وتبارک سے فتح طلب کرتے تھے۔

رواہ فی شرح السنۃ مشکوٰۃ باب فضل الفقراء

اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ ابن ملک رحمۃ اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ  
صلی اللہ علیہ وسلم فقرائے مہاجرین کے توسل سے اس طرح دُعا مانگتے تھے۔  
اللہم النصرنا علی الاعداء بحق  
عبادک الفقراء المہاجرین۔  
اے اللہ ہماری مدد فرما دشمنوں و کفار کے  
مقابلہ میں تیرے فقراء مہاجرین بندوں کے حق  
(وسیلہ سے)۔ (المرقاۃ کتاب الرقاق)

اور شیخ عبدالحق اشعث اللمعات میں یوں نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ  
وسلم دعا میں اس طرح کہتے۔

اللہم النصرنا بالفقراء المہاجرین۔  
اے اللہ ہماری مدد فرما فقراء مہاجرین کی  
برکت یا وسیلہ سے۔

اس سے منکرین توسل یہ جواب دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فقراء مہاجرین  
کی دعا کے ذریعے فتح مانگتے تھے نہ یہ کہ ان کی ذات پر توسل فرماتے تھے۔

اس بات کو قائلین توسل رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ دعویٰ بلا دلیل ہے اور  
حدیث شریف سے تو یہی توسل معلوم ہوتا ہے اور اس پر مرقات اور اشعث اللمعات  
کے حوالوں کی شہادت بھی موجود ہے۔

منکرین توسل کی طرف سے جواب یوں دیا جاتا ہے کہ دعویٰ بلا دلیل نہیں، بلکہ  
اس پر قوی دلیل موجود ہے۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بہت دلیہر بہادر، قوت  
والے اور سختی شخص تھے۔ ان کا بیٹا مصعب بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہما صحیح بخاری میں  
ان سے روایت کرتے ہیں کہ (حضرت) سعد (یعنی اس کے باپ) کو یہ گمان ہو گیا کہ ان کو

لہ قال الملا علی قاری رحمہ اللہ ثم رأیت فی الجامع انہ رواہ ابن شیبہ والطبرانی عن امیر بن عبد اللہ ولفظہ کان

صلی اللہ علیہ وسلم لیستفتح ویستنصر بصعاليک المسلمین (المرقاۃ)

ان سے کم تر اضعیف اور فقیر شخص پر فضیلت حاصل ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اهل تنصرون و تترن قون الالبضعاف کور بخاری کتاب الجہاد ص ۴۵ جلد دوم یعنی تمہاری مدد دشمنان اسلام پر نہیں کی جاتی اور نہ تمہیں رزق دیا جاتا ہے مگر اپنے ضعفاء کی برکت سے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو یہ خیال اور گمان ہوا کہ ان سے کمزور اور ضعفاء کی نسبت اسلام کو زیادہ نفع ہے تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس گمان کی اصلاح کی اور یہ کلمات ارشاد فرماتے اور ان کلمات میں امت کو یہ بتایا کہ یہ گمان رکھو کہ آپ کو قوت، شجاعت وغیرہ کی وجہ سے دوسرے فقراء اور کمزور مسلمانوں پر فضیلت حاصل ہے بلکہ انہی ضعفاء اور کمزور مسلمانوں کی مخلصانہ دعاؤں کی برکت سے آپ کو کفار و مشرکین پر فتح حاصل ہوتی ہے اور رزق بھی۔

یہاں تو ظاہر ہے کہ ضعفاء اور کمزوروں کے طفیل دعائیں مقصود نہیں اور نہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان پر توسل کر کے دعا کی تھی بلکہ یہاں مراد صرف ان کے اخلاص اور دعا کی برکت بتانا ہے۔ اور کمزور، ضعیف لوگوں کو کم تر نہ سمجھنے کی تعلیم ہے پس اسی طرح مذکورہ بالا حدیث سے بھی مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فقراء و مہاجرین کی دعا کے ذریعے فتح مانگتے تھے۔

(۳) اسی طرح ابن ابی شیبہ نے بسند صحیح مالک دار جازن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں قحط پڑ گیا تو ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر پر تشریف لے گئے اور کہا یا رسول اللہ استسق اللہ لامتناہی فانہو قد هلكوا فاناه رسول الله صلى الله عليه وسلم في المنام فقال انت عمر فاقرئه السلام واخبر ان انهم ليسقون (الحدیث ردفا۔ الوفا ج ۴ ص ۴۲، مطبوعہ احیاء التراث العربی) اسے رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کے لئے بارش مانگ لیں، وہ تو ہلاک ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو خواب میں آتے اور فرمایا کہ عمرؓ کے پاس جاؤ، ان کو سلام کہنا اور خبر دینا کہ ان پر بارش برسانی جاتے گی۔

اس حدیث سے استدلال اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی جب کہ آپ برزخ میں ہیں (گویا یہ توسل میں مبالغہ ہے جس کا تعلق مسئلہ استشفاع سے ہے) تو اس پر نہ حضرت عمرؓ نے انکار فرمایا اور نہ اور کسی صحابی نے ان کے اس فعل کو برّا جانا۔

اس روایت پر مانعین توسل اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں خواب دیکھنے والا شخص نامعلوم ہے کہ یہ شخص کون تھا اس کا نام کیا تھا، صحابی تھا یا غیر صحابی وغیرہ۔ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ خواب دیکھنے والا کوئی نامعلوم شخص نہیں بلکہ وہ ایک صحابی ہے جس کی نشان دہی سیف بن عمرؓ نے "الفتوح" میں کی ہے کہ خواب دیکھنے والے ایک صحابی تھے جس کا نام بلال بن الحارث المزنی ہے۔ لیکن مانعین اس کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سیف بن عمرؓ ایک ایسا راوی ہے جس پر ائمہ جرح و تعدیل نے سخت تنقید کی ہے بلکہ بعض نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ وہ واقعہ کی طرح جھوٹی اور من گھڑت حدیثیں گھڑتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ سیف بن عمرؓ بہت ہی کمزور اور ضعیف راوی ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ اور صرف اس کی روایت پر اعتماد کر کے اس شخص سے حضرت بلال بن الحارث المزنیؓ مراد لینا صحیح نہیں۔ لہذا روایت میں اس شخص کو بہ ستور ایک نامعلوم شخص سمجھا جائے گا۔ اس کے جواب میں قائلین کہتے ہیں اگر مان لیا جائے کہ خواب دیکھنے والے کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ وہ کون تھے لیکن مالک الدار ایک ثقہ راوی ہیں جو اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو اس مسئلہ کو ایک نامعلوم شخص کے خواب اور اس کے توسل کرنے پر استدلال کر کے اس کو ثابت نہیں کیا جاتا، بلکہ اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ وہ شخص حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور انہیں خبر دی تو حضرت عمرؓ رو پڑے اور فرمایا اے میرے رب میں نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا مگر جس امر سے میں عاجز ہو گیا تو یہاں استدلال اس بات سے ہے کہ حضرت عمرؓ کا اس شخص کے خواب اور اس کے اسی طرح توسل کرنے پر کوئی انکار نہ فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس توسل کو جائز سمجھتے تھے ورنہ حضرت

عمر اس پر ضرور انکار فرماتے اور اس کی اس کارروائی پر اس کی تغلیط کرتے۔

اسی طرح اس حدیث میں قائلین اور مانعین دونوں کے لئے بحث کی کافی گنجائش ہے۔ نیز دونوں فریق اس حدیث کی سند پر بھی بحث کرتے ہیں، کوئی اس کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کسی نے اس کو کمزور اور ناقابل اعتبار بنانے کی زور آزمائی کی ہے۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ جس طرح اس حدیث کو بالکل صحیح اور بے غبار ثابت کرنا سخت مشکل ہے، اسی طرح یہ بھی آسان نہیں کہ اس کو ایسا کمزور اور ناقابل اعتبار ثابت کر کے بالکل مسترد کیا جاتے۔ واللہ اعلم۔

(۴) اور سنن الدارمی میں حضرت ابو الجوزاء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مدینہ منورہ کے لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے شکایت کر کے اس کا علاج دریافت کیا۔ پس عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کو دیکھ کر آسمان کی طرف روشن دان بناؤ۔ یہاں تک کہ اس قبر اور آسمان کے درمیان چھت (حجاب) نہ رہے۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا، سوان پر بہت بارش برساتی گئی یہاں تک کہ گھاس اُگی اور اونٹ موٹے ہو گئے اور چربی سے بھول گئے تو اس سال کا نام فتنی رکھا گیا۔

فقالنظر واقبرالنبي صلى الله عليه وسلم فاجعلوا منه كوا الى السماء حتى لا يكون بينه وبين السماء سقف ففعلوا فمطروا مطرا حتى لا يكون بنت العشب وسمنت الابل حتى لفقت من الشحم فسمي عام الفتن.

(رواہ الدارمی مشکوٰۃ باب الکرامات)

اس واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے توسل میں مہالغہ کی وجہ سے یہ سب کچھ کیا، جیسا کہ شیخ عبدالحق رحمہ اللہ تعالیٰ اشعت اللمعات میں لکھتے ہیں۔ کہ درحقیقت استسقاء واستشفاع ست بذات شریف و کشف قبر مبارک است درآن اشعت اللمعات کتاب الفتن، باب الکرامات الفصل الثالث، یعنی حقیقت میں یہ استسقاء اور ذات شریف پر توسل کرنا ہے اور قبر کی طرف اوپر سے کھڑکی کھولنا توسل میں مہالغہ کے لئے ہے۔

لہ سنن الدارمی المداول سنہ ۴۴۴ مطبوعہ نشر السنۃ ملتان پاکستان۔

اسی طرح ملا علی قاری رحمہ اللہ نے بھی مشکوٰۃ کی شرح مرقاۃ میں لکھا ہے (دیکھتے مرقاۃ ج ۱ ص ۲۳۱، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)

منکرین توسل اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ پہلے تو اس حدیث کی سند پر تنقید موجود ہے۔ اگر اس کی سند کو معتبر بھی تسلیم کیا جاتے پھر بھی اس سے قولی توسل (یعنی زبانی یوں کہنا کہ اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہم پر بارش نازل فرما دیجئے) ثابت کرنا صحیح نہیں۔ قائلین توسل کا جواب اوپر گزر چکا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا کرنا توسل میں مبالغہ ہے۔ واللہ اعلم۔

(۵) حضرت فاطمہ بن اسد رضی اللہ عنہا (جو حضرت علیؑ کی والدہ ہیں) کی وفات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں گئے اور ان کے سر ہانے بیٹھ کر فرمایا: ماں! اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے۔ اسی حدیث میں ہے کہ آگے حضورؐ نے یہ دعا کی۔

اللہ الذی یحییٰ ویمیت وھو حی  
لا یموت اغفر لامی فاطمۃ بنت  
الاسد ولقنها جنتھا ووسع علیھا  
مدخلھا بحق نبیک والہ نبیاء قبلی  
فانک ارحم الراحمین۔  
(رواہ الطبرانی فی الکبیر والوسط)

آپ ہی ارحم الراحمین (سب سے زیادہ رحم کرنے والے) ہیں۔

اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس پر استدلال کرنا صحیح نہیں۔  
(۶) حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کی روایت جو متعدد کتابوں میں موجود ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اسے نقل کیا ہے، ایسی ہے۔

ایک نابینا شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ  
حضرت آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو عافیت اور بینائی دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم  
لہ قال: یشی رتہ اللہ فی ریح بن صلاہ ولفظ ابن حبان والی کم و فی ضحیٰ بقیۃ بابر جلال الصبح مجمع الزوائد ج ۱ ص ۲۵۴

نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو دعا کروں اور اگر چاہے تو صبر کر لے اور صبر ہی تیرے لئے بہتر ہے اس نے کہا کہ حضرت آپ دعا کیجئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ اچھی طرح وضو کرے اور یہ دعا کرے۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ وَالْوَجْهَ إِلَيْكَ  
بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ إِنِّي تَوَجَّهْتُ  
إِلَيْكَ إِلَى رَبِّي فِي حَاجَتِي هَذَا لِتَقْضِيَ  
لِي - اللَّهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِيَّ (رواه الترمذی فی  
البواب الدعوات وقال هذا حديث حسن غریب)

(اے اللہ! آپ میرے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کو قبول فرمائیے۔

اس حدیث کے جواب میں منکرین توسل کی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ اس میں درخواست اللہ تعالیٰ و تبارک ہی سے ہے کہ میرے حق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور شفاعت کو قبول فرماویں، حدیث کے الفاظ میں صراحت موجود ہے فشفعہ فی یعنی اے اللہ تو ان کی شفاعت میرے بارے میں قبول فرما تو یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہی پر توسل ہے۔ ذات مبارک صلی اللہ علیہ وسلم پر توسل ثابت نہیں ہو سکتا۔ قائلین توسل نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں، یہاں دو ہی کو نقل کیا جاتا ہے۔ اول اگر یہاں صرف دعا کی قبولیت کے بارے میں اللہ سے درخواست تھی یعنی صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا پر توسل مقصود تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی لمبی دعا کیوں تعلیم فرمائی جس میں توسل بالذات کی بھی تصریح موجود ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی تعلیم فرمایا والوجه الیک بنبیک محمد بنی الرحمة اور تیری طرف تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو نبی رحمت ہیں کے وسیلہ سے متوجہ ہوتا ہوں۔ پس توسل نے اس کے جواب میں منکرین توسل کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تیری طرف تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو نبی رحمت ہیں کی دعا کے وسیلہ اور ذریعہ سے متوجہ ہوتا ہوں اس لئے آخر میں یوں درخواست کی کہ اے اللہ تو ان کی شفاعت اور دعا میرے حق میں قبول فرما۔

بالذات یہاں صراحت موجود ہے فشفعه فی توبہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت پر توسل کے ساتھ ساتھ یہ دعا بھی مانگی کہ اے اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت ہمارے حق میں قبول فرما۔ بہر کیف حدیث شریف میں ذات مبارک صلی اللہ علیہ وسلم پر توسل واضح طور پر موجود ہے۔ دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ اگر مراد صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا پر توسل کرنا ہوتا تو اس حدیث شریف کے راوی عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے خود یہ دعا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اوروں کو تعلیم نہ کی ہوتی۔ کیونکہ حدیث کا راوی حدیث شریف کا مطلب اور معنی دوسروں سے بہتر طور پر جانتا ہے خصوصاً جب کہ بات بھی سچی سادی ہے۔ اس میں کوئی خاص پیچیدگی نہیں، چنانچہ طبرانی معجم کبیر میں نقل کرتے ہیں ایک شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس ایک (ضروری) کام کے سلسلہ میں آیا جا کر آیا تھا حضرت عثمان بن عفان خلیفہ راشد (بوجہ مصروفیت) نہ اس کی طرف توجہ فرماتے اور نہ اس کی حاجت براری کرتے۔ وہ شخص حضرت عثمان بن حنیف سے ملا اور اپنی حاجت کی شکایت کی۔

فقال له عثمان بن حنیف ایت المیضاة فتوضا ثم ایت المسجد فصل قیہ رکعتین ثم قل اللهم انی اسئلك واتوجه الیک ینیبنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا پر توسل اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اگر اس حدیث کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی حضرت عثمان بن حنیف کا ہی اجتہاد ہے کہ انہوں نے اس سے یہی بچا اور دوسروں کو تعلیم کی۔ ورنہ حدیث میں تو فشفعه فی توبہ کے الفاظ اس بات کی وضاحت کے لئے کافی ہیں کہ یہاں مراد اس سے یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کرے کہ اے اللہ تو میرے حق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور دعا کو قبول فرما۔

لہٰذا قارئین اس کے بواب میں یوں فرماتے ہیں جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

علیہ وسلم نبی الرحمة والهدی

محمد صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی نبی رحمت کے وسیلہ سے۔  
اسی طرح مذکورہ بالا حدیث کی پوری دُعا ان کو بتائی اور انہوں نے اسی طرح  
کیا۔ روایت کے آخر میں ہے کہ اس دعا کی برکت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے  
ان کی تعظیم و تکریم کی اور اس کا کام بھی کر دیا۔

امام طبرانیؒ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور علامہ منذری رحمہ اللہ نے بھی اس  
روایت کو نقل کر کے طبرانی رحمہ اللہ کے اس قول الحدیث صحیح کی تائید کی ہے۔ اور امام  
بیہقی رحمہ اللہ نے بھی اس کو دو طریق سے نقل کیا ہے۔ علامہ ابوالحسن الشیخی مجمع الزوائد  
میں اس حدیث شریف کو نقل کر کے اس کی صحت کا گواہ قرار کرتے ہیں۔ یہ واقعہ آپ  
صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے عہد کا ہے۔ اس پر نہ  
کسی صحابی نہ خود خلیفہ راشد حضرت عثمانؓ نے انکار کیا جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ  
توسل بالنبی بعد الوفاۃ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں بلا کسی تکبر ہوتا رہا۔

اس کا جواب منکرین توسل کی طرف سے یوں دیا جاتا ہے کہ خلیفہ راشد حضرت  
عثمانؓ بن عفان کو اس توسل کرنے والے نے یہ نہیں بتایا کہ میں نے اس طرح توسل  
کر کے دعا مانگی ہے بلکہ دعا مانگ کر حاضر ہوتے۔ انہوں نے اس کا کام کر دیا تو اس سے  
یہ کہاں ثابت ہوا کہ اس شخص کے اسی طرح توسل یا حضرت عثمانؓ بن حنیف کے اس توسل  
کی تعلیم کرنے کی اطلاع امیر المومنین حضرت عثمانؓ بن عفان کو ہو گئی ہوگی اور انہوں  
نے ان پر تکبر نہیں فرمائی۔ البتہ حضرت عثمانؓ بن حنیف نے اس سے یہی توسل سمجھ لیا  
تھا۔ اس لئے انہوں نے دوسرے کو بھی تعلیم کی۔

لہ وقال الطبرانی عقبہ الحدیث صحیح بعد ذکر طرق التی روی بہا (مجمع الزوائد ج ۲ ص ۲۴۹)

یہ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ حضرت مالک الدارمازن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت پر ہی اعتراض نہیں  
ہو سکتا کیونکہ وہاں مالک الدارمخود اس شخص کی آمد اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی حالت بیان کرنا روایت کرتے  
ہیں تو وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ثابت ہو سکتی ہے اور ان کا تکبر نہ کرنا صحیح رکھتا ہے لیکن یہاں خلیفہ  
راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اطلاع کے ثبوت کے بغیر ان کے تکبر نہ کرنے کا کوئی معنی اور وزن نہیں۔ واللہ اعلم

اسی طرح اس کے جواز اور عدم جواز پر مذاہب اربعہ کے اور دیگر متاخرین علمائے بہت طویل بحثیں کی ہیں، لیکن یہاں صرف علامہ شوکانی رحمہ اللہ تعالیٰ جو اہل حدیث وغیر مقلدین کے امام سمجھے جاتے ہیں، اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے متقدمین بھی ان کو حجت کہتے ہیں، انہی سے کچھ نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

یہ بالکل واضح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی زندگی میں وسیلہ بنانا اور آپ کے انتقال کے بعد دوسرے بزرگوں کو وسیلہ بنانا صحابہ کرامؓ کے اجماع سکوتی سے ثابت ہے، کیونکہ جب حضرت فاروقؓ نے حضرت عباسؓ کو وسیلہ بنایا تو کسی صحابی نے بھی اس کا خلاف نہیں کیا، میرے خیال میں جواز تو سل نبی کریمؐ سے مخصوص کر دینا چاہیہ کہ عز الدین (ابو محمد عبدالسلام) کو وہم ہوا ہے اس کی کوئی وجہ نہیں۔ اس عدم تخصیص کی دو دلیلیں ہیں۔ پہلے تو وہی صحابہ کا اجماع جس سے ہم مطلع کر چکے ہیں، اور دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں ارباب فضل اور کمال کو بطور وسیلہ پیش کرنے کا دراصل یہ مطلب ہے کہ ان کے اعمال صالحہ اور کمالات کو وسیلہ بنایا جاتا ہے کیونکہ کوئی شخص وسیلہ بننے کے قابل ہی تب ہوتا ہے جب کہ وہ اعمال صالحہ کرے تو گو یا جب کوئی شخص یوں کرے کہ اسے اللہ میں غلاں صاحب کمال کو تیرے دربار میں وسیلہ پیش کرتا ہوں تو اس کا وسیلہ بننا بلحاظ کمال کے ہوگا اور نیک عمل کو وسیلہ بنانا حدیث سے ثابت ہے جیسا مسلم و بخاری وغیرہ میں موجود ہے کہ نبی کریمؐ نے ان تین شخصوں کا قصہ بیان کیا جو غار میں اٹھتے اور غار کے منہ پر پتھر آگیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے بڑے عمل کو وسیلہ بنایا اور پتھر غار سے ہٹ گیا، تو اگر اعمال صالحہ سے تو سل ناجائز ہو یا بشر کہ ہوتا جس طرح عز الدین وغیرہ سخت گیر لوگ کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان تین آدمیوں کی دعا قبول نہ کرتے اور نبی کریمؐ ان کا قصہ بیان کرنے کے بعد ان کے فعل تو سل کو ضرور ناجائز قرار دیتے (قاضی مرحومؒ تو سل کو ثابت کر کے اب منکرین تو سل کے دلائل کا جواب دیتے ہیں) اور فرماتے ہیں کہ جب واضح ہو گیا کہ تو سل جائز ہے تو اسے معلوم ہو گیا کہ جو دلائل منکرین تو سل پیش کرتے ہیں مثلاً مَا عَبَدُكُمْ إِلَّا لِيُقَرَّرَ لَكُمْ أَلَى اللَّهِ

زُلْفٰی اور فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا اور لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُوْنَ لَهُمْ شَيْئًا ہمارے دعویٰ جواز تو سل بالنبی والصالحین کے لئے مضر نہیں۔ بلکہ اگر ان آیات کو امتناع تو سل کے لئے پیش کیا جائے گا تو یوں کہا جائے گا کہ محل نزع اور امتناع تو سل سے یہ دلائل بالکل اجنبی ہیں کیونکہ مشرکوں کے اس قول سے کہ ما نعبدہم الا اللہ ہ صاف واضح ہے کہ مشرک قرب الہی حاصل کرنے کے لئے بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے جو شخص بزرگ کو وسیلہ بناتا ہے وہ اس کی عبادت نہیں کرتا بلکہ یہ سمجھ کر خدا کے دربار میں اس کی عزت ہے اس کو وسیلہ بناتا ہے۔ اسی طرح یہ آیت فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا جواز تو سل کے خلاف نہیں کیونکہ اس میں تو صرف یوں کہا گیا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی دوسرے کو نہ پکارو اور یوں نہ کہو یا اللہ یا فلاں اور جو کسی بزرگ کو وسیلہ بناتا ہے وہ تو صرف اللہ کو پکارتا ہے یا اللہ کے کسی نیک بندہ کو بوجہ کمال وسیلہ بناتا ہے جس طرح ان غار والے تین اشخاص نے اپنے نیک اعمال کو وسیلہ بنایا تھا اور اسی طرح یہ آیت وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ جواز تو سل کے خلاف نہیں کیونکہ مشرک تو ان کو بلاتے تھے جو ان کی سنتے نہیں تھے اور خدا کو جو ان کی سنتا ہے اس کو نہیں بلاتے۔ لیکن کسی بزرگ کو وسیلہ بنانے والا تو صرف اللہ کو بلاتا ہے کسی دوسرے کو نہیں بلاتا ہمارے سابق کلام سے منکرین تو سل کے تمام دلائل کی بھی قلعی کھل جاتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان دلائل کو منع تو سل سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مثلاً ان کا یہ استدلال کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ لَا تَمْلِكُ لِنَفْسٍ شَيْئًا وَالَّذِيْ يَوْمُ الثَّوْرِ اَللّٰہ جواز تو سل کے منافی نہیں کیونکہ اس آیت میں صرف یہ بیان ہو رہا ہے کہ قیامت کو سب اختیارات اللہ کو ہوں گے اور کسی دوسرے کو کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ لیکن جو شخص کسی بزرگ کو وسیلہ بناتا ہے اس کا تو کبھی عقیدہ نہیں ہوتا کہ یہ بزرگ اختیارات اخروی میں خدا کا شریک ہے جو عقیدہ رکھے کہ غیر اللہ کو امر آخرت میں کچھ اختیار ہے اس کو تو ہم بھی گمراہ سمجھتے ہیں۔ لیکن متوسلین کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح منکرین تو سل کا آیت لَيْسَ لَكَ

مَنْ أَرَادَ مَرَشِيًّا أَرَادَ أَنْ يَكُونَ لِنَفْسِهِ لُفْعًا وَكَذَلِكَ صَحَّحْنَا سَهْلًا لَكُمْ  
 غلط ہے، کیونکہ ان آیتوں میں تو اس کی تصریح ہو رہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم  
 کو امر اللہ میں کوئی دخل نہیں ہوگا۔ اور یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے نفع  
 ونقصان کے مالک نہیں تو دوسرے کے نفع ونقصان کے کس طرح مالک ہو سکتے  
 ہیں، لیکن کسی نبی، ولی یا عالم کے توسل کے عدم جواز میں ان آیتوں کا کیا دخل، متوسل  
 کا تو یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ غیر اللہ کو امر آخرت یا نفع ونقصان میں کوئی اختیار ہے۔  
 توسل کا انکار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا انکار ہے اور شفاعت کا انکار  
 قرآن کا انکار ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود  
 یعنی مقام شفاعت عظمیٰ کے اعزاز سے مشرف فرمایا ہے۔ اور مخلوق کو یہ ہدایت کی  
 ہے کہ آپ کے لئے اللہ تعالیٰ سے اس شرف عظیم کی درخواست کیا کریں اور اللہ تعالیٰ  
 نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہے کہ مقام محمود کی درخواست کیا کرو، آپ کو دیا جائے  
 گا۔ اور امت کی سفارش کرو تمہاری سفارش مقبول ہوگی، ہاں شفاعت کا حق اللہ تعالیٰ  
 کی اجازت سے ہوگا۔ پھر خاص اس کو جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرمائیں، اسی طرح منکرین  
 توسل کا نبی کریم کے اس ارشاد کہ اے فلاں بن فلاں میں تیرے لئے اللہ کی طرف سے  
 کسی چیز کا مالک نہیں، پیش کرنا جواز توسل کے خلاف نہیں کیونکہ اس کا تو صرف یہ مطلب  
 ہے کہ جب کسی کو اللہ نفع یا نقصان پہنچانا چاہے تو میں اس کا خلاف نہیں کر سکتا، اور  
 یہ بات ہر انسان جانتا ہے لیکن یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ توسل ناجائز ہے کیونکہ متوسل  
 کا یہ عقیدہ تو نہیں ہوتا کہ وسیلہ . . . . . امر اللہ میں دخل ہے، بلکہ اس کا تو  
 یہ مطلب ہوتا ہے کہ اختیار کلی صرف اللہ کو ہے اور میں صرف اسی سے درخواست کرتا  
 ہوں، ہاں کسی ایسے بزرگ کو جس کے طفیل دعا قبول ہو سفارش بنانا ہوں اور وسیلہ پیش  
 کرتا ہوں، (ترجمہ در فیض مصنفہ قاضی شوکانی)

اور یہاں یہ شبہ بھی بالکل غلط ہے کہ (معاذ اللہ) جس شخص کے ذریعہ توسل کیا  
 جاتا ہے اس کا رتبہ یا شان اللہ تعالیٰ سے زیادہ نظر آتا ہے یا اس کا اس پر کوئی زور

و جبریل سکتا ہے۔ کیونکہ یہ صرف ایک دم ہے۔ ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ جن حضرات کے وسیلے سے دعا مانگی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نیک و مقرب بندے ہوتے ہیں۔ اور ان سے محبت و تعلق، اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (بے شک اللہ کی رحمت محسنین سے قریب ہے) کے مصداق نزول رحمت کا ذریعہ ہے۔ پس توسل کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں بنتی کہ اسے اللہ فلاں مقبول بندہ پر جو رحمت ہے اس کے توسل سے دعا کرتا ہوں، اور یہاں وہ ان الفاظ سے اپنے پوشیدہ تعلق و محبت کا اظہار کرتا ہے جس میں نہ کوئی خطرہ ہو سکتا ہے نہ مذکورہ بالا شبہ کیا جاسکتا ہے۔

بلکہ توسل بالاعمال جو بالاجماع جائز ہے اور توسل بالشخص میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اور ان کے درمیان یہ نزاع لفظی معلوم ہوتا ہے کیونکہ جو حضرات انبیاء اور صالحین کے توسل سے دعا کے قائل ہیں ان کی مراد یہ ہرگز نہیں کہ وہ ان کی شخصیتوں کو الیاذناب اللہ ان کے اوصاف کمالیہ اور ان کی دینی خدمات وغیرہ سے الگ کر کے توسل کرتے ہیں بلکہ ان کی دینی خدمات اور خداداد خوبیاں پیش نظر رہتی ہیں، صالحین پر ان کے نیک کاموں کی برکت سے اللہ کی رحمتیں برستی ہیں، ان کے ساتھ محبت ان کی دین کی خاطر عظیم قربانیوں کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ ان حضرات کے ساتھ یہ محبت اور تعلق بذات خود ایک پوشیدہ نیک عمل ہے۔ اب اس محبت کے عمل کے ساتھ آواز بھی شامل ہو جاتی ہے اور ان حضرات کے توسل سے اللہ سے سوال کیا جاتا ہے گویا توسل بالاعمال اور توسل بالاشخاص اکٹھے ہو جاتے ہیں، اور یہ مسئلہ بلا نزاع جائز ہو سکتا ہے۔ اور اس بات کے حضرت حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ بھی قائل ہیں، چنانچہ وہ بھی فلاں کے ذریعہ سوال کرنے کے مختلف اسباب بیان کرتے ہوئے تحقیق کرتے ہیں،

فیحمل قول القائل! اسئلك بنیك محمد علی انه اراد انی بایمانف بہ و بہ حقیقۃ و التوسل الیک بایمانف بہ و محبتا و نحو ذلک قل و کرتے یعنی اس قول کے کہنے والے اسے اللہ میں تجھ سے تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے سوال کرتا ہوں، کہ اس پر معمول کیا جاتے کہ اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ اسے اللہ میں تجھ سے محمد

ان هذا جائز بلا نزاع قبل من اراد  
 هذا المعنى فهو في ذلك بلا نزاع  
 واذا حمل على هذا المعنى الكلام من  
 توسل بالنبي صلى الله عليه وسلم بعد مماته  
 من السلف كما نقل عن بعض الصحابة  
 والتابعين وعن الامام احمد وغيره كان  
 هذا حسنا وحيث فلا يكون في  
 المسألة نزاع ولكن كثيرون العوام  
 يطبقون هذا اللفظ ولا يريدون  
 هذا المعنى فهو الذي انكر عليهم  
 من انكر ذلك قاعدة جلية التوسل والوسيلة

صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور ان کے ساتھ محبت  
 کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں اور اسی طرح اور  
 کوئی معنی مراد لیا جائے تو آپ کو یاد ہوگا کہ یہ بلا نزاع  
 بالاتفاق جائز ہے اور کہا گیا ہے کہ جس کا بھی  
 مقصد ہو تو وہ بلا نزاع صحیح ہے اور اگر اسی معنی  
 پر ان اسلاف کے کلام کو محمول کیا جائے جنہوں نے  
 آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی آپ پر توسل کیا جیسا  
 کہ بعض صحابہ تابعین اور امام احمد سے نقل کیا گیا  
 ہے تو یہ اچھا ہوگا اور اسی حالت میں مسئلہ اختلافی  
 نہیں رہتا لیکن بہت سے عوام اس لفظ کو مطلق  
 بولتے ہیں اور اس سے یہی معنی مراد نہیں لیتے۔

یہی لوگ ہیں جن پر انکار کرنے والوں نے انکار کیا ہے۔

پس حضرت حافظ یہاں یہ فرماتے ہیں کہ عوام یہ الفاظ ویسے ہی (بلا سمجھے بوجھے)  
 بول دیتے ہیں اور ان کی مراد اس سے جائز معنی نہیں ہوتا۔ بلاشبہ امام ابن تیمیہ نے  
 جو کچھ فرمایا وہ کسی قدر صحیح ہے۔ تاہم اس کا جواب توسل کو ماننے والے یہ دے سکتے ہیں  
 کہ قابل غور بات یہ ہے کہ جس شخص پر وہ توسل کرتا ہے اگر اس کا اس پر ایمان نہیں اور  
 اس کے ساتھ (اللہ تعالیٰ کے لئے) تعلق ہی نہیں تو وہ اس پر توسل ہرگز نہیں کرے گا  
 میلہ کذاب یا غلام احمد قادیانی وغیرہ دجال و کذاب پر کوئی مسلمان توسل نہیں کرتا۔ اور نہ  
 ہی عیسائی یہودی یا کسی اور باطل فرقہ کے سربراہ پر توسل کرتا ہے۔ اگرچہ وہ اس کا باپ ہی  
 کیوں نہ ہو۔ باوجود پدری محبت کے وہ ہرگز اس پر توسل نہیں کرے گا۔ تو یہ بات اس کی

لئے کہ جو نبیہا کہ اتباع اور اطاعت رسول اعمالِ خیر ہیں اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا  
 اور آپ کے ساتھ محبت و تعلق رکھنا باطنی اعمال میں سے ہے چونکہ توسل بالاعمال بالاجماع جائز ہے اسی  
 لئے یہ توسل بھی بالاجماع جائز ہو سکتا ہے۔

دلیل ہے کہ جب وہ دعا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی صالح شخص پر توسل کرتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کے ساتھ (اللہ تعالیٰ کے لئے) تعلق و محبت کی وجہ سے ہی کرتا ہے۔ اگرچہ وہ اس پر تصریح نہیں کرتا تاہم ایک مسلمان سے ظاہر یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور ان کے ساتھ عقیدت رکھنے کے طفیل اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہے اور وہ اپنے ظاہری اعمال کو نظر انداز کر کے تواضع اور عبدیت کا ثبوت دیتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ اے میرے پروردگار میرا کوئی عمل ایسا نہیں کہ جس کو میں آپ کی بارگاہ عالی میں پیش کر کے اس کے ذریعہ سے دعا کروں البتہ صرف آپ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و عقیدت کا تعلق ہے پس اے اللہ آپ اس تعلق (جو ایک قلبی عمل ہے) کی لاج رکھتے ہوئے میری دعا کو قبول فرمائیے۔

الغرض توسل بالذات اور توسل بالاعمال میں کوئی ایسا خاص فرق نہیں جس کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے بالکل جدا کر کے پہلے کو شرک اور دوسرے کو جائز قرار دیا جائے۔ اگر توسل بالاشخاص شرک ہوتا تو حضرت عمرؓ کا حضرت عباسؓ کے ذریعے توسل کرنا جس سے متنازع فیہ توسل بھی مراد ہو سکتا ہے، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عثمان بن حنیف کی روایت میں نابینا صحابی کو ایسی دعا تلقین کرنا جس میں آپ کے ذریعے توسل کرنے کی کافی گنجائش موجود ہے، اور بقول خود ابن تیمیہؒ بعض صحابہؓ، تابعین اور امام احمد وغیرہ کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر توسل کرنا وغیرہ العیاذ باللہ یہ سب شرک میں داخل ہوگا۔

پھر ان روایتوں اور مثالوں سے علماء کی اکثریت نے توسل بالذات ہی مراد لیا ہے تو کیا فقہائے کرام، صحابہؓ، حضرت عمرؓ اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ انہوں نے العیاذ باللہ امت کی اکثریت کو شرک کے دلدل میں پھنسا دیا۔

اسی طرح پر قرآن کی آیت وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتُونَ هَؤُلَاءَ سے بھی توسل کی یہی قسم مراد ہو سکتی ہے۔ اور اس کی شان نزول میں جو دوسری روایات وارد ہوئی ہیں وہ اس کے متعارض اور مخالف نہیں اور سب اسباب نزول یہاں بلا کسی تکلف اور بآسانی

جمع ہو سکتے ہیں۔

تو ایسی حالت میں سوچنے کی بات ہے کہ آخر اس توسل میں وہ کون سی خرابی ہے جس کے لئے فقہاء کے اقوال، احادیث اور آثار میں دور دور کی تاویلیں کرنے کی ضرورت پڑے یا ایسی احادیث جن میں تاویل کی گنجائش نہ ہو تو اس کو ضعیف یا موقوف ثابت کرنے پر پوری طاقت لگا دی جائے۔

فی الحقیقت اگر ہم ایسے ہی دور کے احتمالات نکالنے لگیں تو شاید شریعت کا کوئی علم بھی پایہ ثبوت تک نہیں پہنچ سکے گا، اسی طرح اگر قرآن مجید کی من مانی تفسیریں شروع ہو جائیں تو نہ کوئی چیز ناجائز ہوگی اور نہ ہی کوئی عمل شرک سے خالی ہوگا۔

الغرض یہ متنازع فیہ توسل کوئی شرک نہیں بلکہ اس میں دعا کی قبولیت کے ساتھ اور ایک فائدہ بھی ہے وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین سے محبت بڑھ جاتی ہے اور محبت ایک ایسی چیز ہے جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ مخلوق کے درمیان محبوب کے فضائل و اوصاف کو محبت کرنے والے میں اس کی استعداد کے مطابق منتقل کر دیتے ہیں، درود شریف کے بارے میں اس آیت مبارکہ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ، یَاٰیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا صَلُّوا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیْمًا کے متعدد فوائد اور اسباب میں یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ درود شریف پڑھنے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق اور محبت میں اضافہ ہوگا، اور یہی محبت درود شریف پڑھنے والے کو حسب استعداد، والہانہ انداز میں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اتباع پر ڈال سکتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات امت کو سمجھائی ہے، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

لَا یُحِبُّ مَنْ أَحَدًا کَوْحَشٍ اَوْ کَوْنٍ اَوْ حَبٍّ

یعنی اس اختلافی توسل جس میں بزرگوں سے مانگنا نہیں ہوا کرتا بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کی جاتی ہے، البتہ دعا کی قبولیت کی امید سے اللہ کے سامنے کسی صالح کے ساتھ اپنی قلبی

اہمیت و عقیدت پیش کر کے، صالح شخصیت پر توسل کرتا ہے۔

اليه من والده وولده والناس  
اجمعين (متفق عليه مشکوٰۃ كتاب الايمان)  
کہ میں اس کو اس کے باپ اور اس کی اولاد  
اور سارے لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں  
پس محبت بڑھانے کے لئے مختلف ذرائع ہوتے ہیں، جیسا کہ آپ صلی اللہ  
علیہ وسلم کی موجودگی میں آپ کے ساتھ ادب و احترام سے ملاقات کرنا اور آپ سے  
دعاؤں کی درخواست کرنا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ  
فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ  
لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا  
اسورة النساء۔ آیت ۶۴  
یعنی اگر وہ لوگ جب ظلم کر بیٹھے تھے اپنی جانوں  
پر حاضر ہوتے آپ کے پاس پھر اللہ تعالیٰ سے  
معافی چاہتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی  
ان کے لئے (اللہ سے) مغفرت طلب کرتے تو

وہ ضرور اللہ کو پاتے، بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا۔  
یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے  
دعا کی درخواست کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دعا کے لئے فرمایا ہے۔  
حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے آپ سے عمرہ کرنے کی  
اجازت مانگی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت بھی دی اور فرمایا۔

وَقَالَ امْشُرْ كُنَايَا اخِي فِي دَعَائِكَ  
اے ہمارے چھوٹے بھائی اپنی دعا میں ہمیں  
ولا نفسنا۔  
مشریک کرنا اور ہم کو نہ بھولنا۔

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کلمہ فرمایا  
(ہے) جس کے بدلے میں مجھ کو تمام دنیا بھی خوش نہیں کر سکتی۔

(رواہ البوداؤد والترمذی مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

اسی طرح آپ کی عدم موجودگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار اور تبرکات کو دیکھنا  
اور ان کی حفاظت کرنا، آپ سے محبت بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ ارشاد  
باری تعالیٰ ہے۔

وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ  
اور بنا لو ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام

مُصَلَّى۔

کے کھڑا ہونے کی جگہ کو جاتے نماز۔

مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر کرتے رہے۔ اس پر ان کے قدم مبارک کے نشان بھی بطور معجزہ چڑ گئے ہیں (دیکھئے بخاری ج ۲ کتاب التفسیر)۔

اسی طرح جب بنی اسرائیل کو حضرت طالوت کے بارے میں من جانب اللہ بادشاہ مقرر ہونے میں تردد ہوا تو انہوں نے اپنے پیغمبر سے کوئی ظاہری حجت طلب کی اللہ تعالیٰ و تبارک کا ارشاد ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ  
أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّالُوتُ فِيهِ سَبْكَةٌ  
فَرْقُكُمْ وَبَقِيَّتُهُ مِمَّا تَرَكُ  
الْمُؤَسَّى وَالْحَارُونَ - الآية۔

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اس (طالوت) کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ جو مقدس صندوق تم کھوپکے ہو وہ صندوق تمہارے پاس (واپس) آئے گا۔ اس میں تسلی (کا سامان) ہو گا تمہارے رب کی طرف سے اور اس میں بچی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں چھوڑ گئے

(البقرہ آیت ۲۴۸)

ہے موسیٰ اور ہارون کی اولاد۔

اللہ ہی ان آیات کے اسرار اور حکمتوں کو خوب جانتا ہے۔ پھر بھی اس میں ایک حکمت یہ دکھائی دیتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے آثار و نشانات دیکھ کر ان کی خدا داد صفات اور کمالات اور دینی خدمات سامنے آتی ہیں، ان سے تعلق اور محبت مضبوط تر ہو جاتا ہے ان کی صداقت اور حقانیت پر یقین بڑھ جاتا ہے۔

پس اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار اور تبرکات کو رکھا گیا اور آپ نے اس پر کوئی انکار نہیں فرمایا۔

(۱) امام نسائی رحمہ اللہ خلق بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وفد بن کر حاضر ہوئے۔ ہم نے آپ کے ہاتھ مبارک پر بیعت کی اور آپ کے ساتھ نماز پڑھی اور آپ کو خبر دی کہ ہمارے علاقہ میں (نصاری) کی ایک عبادت گاہ ہے۔ ہم نے آپ سے آپ کے وضو سے پچا ہوا پانی مانگا۔ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا۔

فتوضاً وتمضض ثم صبه لنا في  
الاهوة وامرنا فقال اخرجوا فاذا  
اتبعوا رضكو فاكسروا بيعتكم و  
النضحا مكانها بهذا الماء واتخذوها  
مسجدا قلنا ان البلد لعبد والحر شديد  
والما ينشف فقال مذكوة من الماء  
فانه لا يزيله الا طيبا.

(رواه النسائي، مشكوة باب المساجد)

اور وضو فرمایا اور منہ میں پانی ڈالا کھلی کی پھر اس  
کو ہمارے لئے ایک پھاگل میں ڈال دیا اور ہم کو  
حکم دیا کہ جاؤ جس وقت اپنی زمین کو پہنچو۔ اپنی  
عبادت گاہ (جینہ) کو توڑ ڈالو اور اس کی جگہ پر  
یہی پانی پھیر کر اور اس کو مسجد بنا لو۔ ہم نے عرض  
کیا کہ شہر دور ہے اور گرمی سخت ہے پانی خشک  
ہو جائے گا۔ فرمایا اس میں اور پانی ڈالو (اس لئے کہ  
وہ اس کی برکت کو زیادہ کر دے گا۔

(۲) بخاری اور مسلم میں ابو جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ مکہ میں ابلح میں تھے چمڑے کے ایک سرخ خیمہ میں تشریف  
فرماتے تھے اور میں نے بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے آپ سے بچا ہوا پانی لیا اور  
میں نے لوگوں کو دیکھا، جلدی جلدی لیتے تھے  
اس پانی کو، جس کو مل جاتا، اپنے بدن پر مل لیتا  
اور جس کو نہ ملتا اپنے ساتھی کے ہاتھ سے تری  
لے لیتا (اور اپنے بدن پر مل لیتا)

ورأيت الناس يبتدون ذلك  
الوضو فعن اصاب منه شيئا تقسم به  
ومن لم يصب منه اخذ من بلل  
يد صاحبه الحديث

(متفق عليه مشكوة باب السترة)

پس بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے آثار اور تبرکات اپنے فدائین  
صحابہ پر تقسیم بھی کر دیتے تھے۔

(۳) امام ترمذی حضرت کبشہ رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ:-

دخل على رسول الله صلى الله عليه وسلم  
فشرب من في قربة معلقة قائما  
فقلت الي فيها فقطعته (سنن الترمذی)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے  
آپ نے لٹکی ہوئی مشک کے منہ سے کھڑے  
ہو کر پانی پیا میں نے (فوراً) کٹ کر لیا

البواب الاشریہ وقال بذہ حدیث حسن غریب صحیح (۴۷) بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتی منی فاتی الجمرة فزماها فتواتی منزل یبعث ونحر نسکة ثم دعا بالخلق وناول الخالق شقة الہ یعن فخلقه ثم دعا ابا طلحة الانصاری فاعطاه ایا لا ثم ناول الشقی الا لیس فقال اخلق فخلقه فاعطاه ابا طلحة فقال اقسو بین الناس (متفق علیہ مشکوٰۃ باب الخلق)

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منی آئے اور جبرو کے پاس آگے اس پر کھڑا رہے۔ پھر منی میں اپنے مکان میں آئے۔ پھر سر موٹہ ہنسنے والے کو بلایا اپنے سر کا دیاں حصہ اس کے آگے کیا۔ پھر ابو الخو انصاری کو بلایا اور اس کو وہ بال دیتے۔ پھر دوسرے کا، بایاں حصہ آگے کیا اور فرمایا اس کو موٹہ دو۔ وہ بال بھی ابو طلحہ کو دے دیتے اور فرمایا اس کو لوگوں میں تقسیم کر دو۔

۵۱ مسلم شریف کی صحیح حدیث میں ہے کہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اس نے اکسروانی طیلسان کا جبہ نکالا جس کے گریبان اور پانکوں پر ریشم کا کپڑا لگا ہوا تھا۔ کئے لگیں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ جو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا جب وہ وفات پا گئیں تو میں نے لے لیا۔

وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یلبسہا و نحن نخلسہا للعرضی نستشفی بہا۔ (رواہ مسلم مشکوٰۃ کتاب اللباس)

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پہنا کرتے تھے اور ہم بیماروں کے لئے اس کو دھوئے میں اور اس کے ذریعے شفا طلب کرتے ہیں۔

۶۱ اسی طرح امام بخاری حضرت عثمان بن عبد اللہ بن مویہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میرے گھر والوں نے مجھے ایک پیالہ دے کر ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا۔

وکان اذا صاب الانسان عین او شیء بعث الیہا مخضبتہ فاخرجت من شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور جب کسی کو نظر لگ جاتی یا کوئی تکلیف ہوتی وہ بڑا پیالہ ان کے پاس بھیجتا۔ وہ رام لڑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مبارک نکالتی اس نے

وكانت تمسك في جبل من فضة  
فخض خضته له فشرب منه قال  
فاطلمت في الجبل من ايت مشعرات  
حمراء (رواه البخاري والرقى مشكاة كتاب الطب)

انہیں چاندی کی خول میں رکھا ہوا تھا وہ اس پالہ  
میں اس کو ملائی پھر وہ اسے پی لیتا عثمان بن عفان  
فرماتے ہیں میں نے خول میں جھانک کر دیکھا اس  
میں چند ایک سرخ بال تھے۔

اس قسم کے واقعات کی کافی تعداد کتب احادیث میں موجود ہے اب یہاں  
اس کے سوا اور کیا مراد ہو سکتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق اور محبت کے ثلما  
کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ کے موتے مبارک و خیرہ کے طفیل تبرک حاصل  
کرتے یا اللہ تعالیٰ سے شفا یابی کی امید پر ان (آثار) کے ذریعے گویا عملی توسل کرتے  
اس پر حدیث شریف میں تصریح بھی موجود ہے۔

(۱) امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ نے ام سلیم رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں اکثر تشریف لاتے اور میرے ہاں قیلولہ  
فرماتے تھے میں آپ کے لئے چمڑے کا بچھونا بچھا دیتی آپ اس پر  
سوتے تھے۔

وكان كثير العرق فكانت تحجم عرقه  
وتجعله في الطيب فقال النبي صلى الله عليه  
وسلم ما هذا فقلت عرقك نجعله في  
طيبنا وهو من الطيب الطيب وفي رواية  
قائمه ما رسول الله مزجو بركته لعيبانا  
قال اصبت (متفق عليه)

آپ کو پسینہ بہت آتا تھا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم  
کا پسینہ جمع کرتی تھی اور خوشبو میں ملا دیتی نبی صلی اللہ  
علیہ وسلم نے فرمایا اے ام سلیم یہ کیا ہے ام سلیم کہنے  
لگی یہ آپ کا پسینہ ہے ہم اس کو خوشبو میں ملا دیتے  
ہیں اور یہ نہایت عمدہ خوشبو ہے ایک روایت میں  
یوں ہے کہ (ام سلیم نے) کہا ہم اسے بچولہ کے لئے

اس سے برکت کی امید رکھتے ہیں آپ نے فرمایا تم نے خوب کیا۔  
الغرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار دیکھنے سے آپ کے ساتھ تعلق اور محبت میں  
انصاف ہو سکتا ہے اور یہی محبت و تعلق اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

لے بعض قائلین توسل ان روایات جن سے تبرک بآثار الصالحین ثابت ہو سکتا ہے انہی (باقی ماشیہ اگلے صفحہ)

خلاصہ یہ کہ متنازع فیہ توسل عقائد میں سے نہیں جس کے لئے قطعی اور یقینی دلائل کی ضرورت ہو اور نہ اسی طرح توسل کرنا فرض یا واجب یا سنت مؤکدہ ہے تاکہ قائلین توسل سے اس کے ثبوت میں صریح اور صحیح احادیث، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے عام معمول کا مطالبہ کیا جائے یا یوں کہا جائے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی طرح توسل کیوں نہ کیا یا فلاں خلیفہ ارشد یا فلاں امام نے اسی طرح توسل کیوں نہیں کیا۔ ان سوالات کی ضرورت تو اس وقت ہوتی جب کہ قائلین توسل اس کی فرضیت یا وجوب کے دعویدار ہوتے، لیکن جب وہ اس کی فرضیت وغیرہ کے قائل نہیں تو صرف اس کے جواز کے لئے ان سے یہ مطالبہ درست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ اسی طرح توسل کرنا فحقی طور پر ایک فرعی مسئلہ ہے جو قرآن و سنت کے خلاف نہیں البتہ طبعاً اللہ تعالیٰ کو قادر مطلق فاعل حقیقی لینے اور دینے والا صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو سمجھا اور مانا جائے اور یہ اعتقاد ہو کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے وہی ہوگا اور جو اللہ جل شانہ کو منظور نہ ہو اس کا ہونا ناممکن اور محال ہے، اور جو کچھ قائلین کتاب و سنت سے پیش کرتے ہیں اگرچہ اس میں دوسری تفاسیر تاویلات اور احتمالات کو زیادہ اہمیت اور فوقیت دی جاسکے، تاہم عدم تعارض و تقابل کی وجہ سے ان نصوص میں اسی طرح توسل کے احتمال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، پھر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس پر عمل کرنا اور سنت سے جلیل القدر علماء کا اس کے جواز پر تضرع کرنا اور اس پر عمل کرنا اور ائمہ متبوعین میں سے کسی سے کسی سے اس کی مانعت صراحت سے صاف لفظوں میں منقول نہ ہونا بلکہ بعض ائمہ کے قول و فعل سے جواز معلوم ہونا یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو اس کے جواز (البقیہ شیعہ گزشتہ روایات سے اس اختلافی توسل پر استدلال کرتے ہیں لیکن اس میں تامل کیا جاسکتا ہے البتہ ان روایات سے صالحین کے آثار پر تبرک حاصل کرنے کا جواز ثبوت ہوتا ہے جس طرح سلف صالحین کی سیرت ان کے اقوال و افعال ان کے کارنامے سن کر ان سے محبت بڑھتی ہے اسی طرح ان کے آثار دیکھنے سے ان کی یاد تازہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کے ساتھ تعلق اور محبت بڑھتی ہے شاید ان کے باقی اور آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہو۔ واللہ اعلم۔

کے لئے کافی و شافی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اگر کوئی اس طرح توسل کرتے بغیر دعا مانگے تو اس کو اللہ قبول نہیں فرمائیں گے۔ اور نہ یہ خیال کیا جائے کہ اس طرح توسل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے ذمہ یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس دعا کو قبول فرمائے بلکہ اس کی حیثیت صرف جواز کی ہے جس کی وجہ سے دعا کی قبولیت کی امید کی جاتی ہے اگرچہ بہتری اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے ذریعہ دعا مانگی جائے یا صاف الفاظ میں اس طرح توسل کریں کہ یا اللہ میری کوئی عمل ایسا نہیں جس کو میں آپ کی بارگاہ میں پیش کر کے اس کے ذریعے سے دعا کروں البتہ آپ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و عقیدت ہے پس اے اللہ اس تعلق اور ان پر ایمان لانے کی لاج رکھ کر میری فلاں حاجت پوری فرما یا اگر ایسا نہ کہیں صرف یوں کہیں کہ اے اللہ فلاں سے جو تعلق و عقیدت ہے اس کے طفیل میرا فلاں کام پورا فرما، اگر تعلق اور عقیدت کی تصریح نہ بھی کرے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، لیکن نیت میں یہی ہو یا اسی طرح اور کوئی جائز معنی ہو تو اس طرح توسل بالاتفاق جائز ہوگا، البتہ اس طرح مطلق توسل (یعنی یوں کہنا کہ اے اللہ فلاں کے طفیل یا واسطے میرا فلاں کام پورا فرما) کرنے میں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ جو یہ فرماتے ہیں کہ عوام اس سے جائز معنی مراد نہیں لیتے، یہ بات ان کی کسی قدر صحیح ہے، اگرچہ ایک مسلمان کی اس کے سوا اس طرح کہنے سے اور کیا مراد ہو سکتی ہے تاہم عوام اور ناواقف مسلمانوں کی حالت ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ وہ کرتے اور کہتے ہیں، ان سے بھی یہیں واقعیت ہے اس لئے عوام کو مسئلہ کی پوری نوعیت سمجھانی چاہیے تاکہ ایمان اور عقائد کی حفاظت ہو۔ نیز اس باب میں قدرے تفصیل سے بحث کرنے سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسی متنازع فیہ توسل میں دونوں طرف یعنی قائلین اور مخالفین کے لئے بحث مباحثہ کی کافی گنجائش ہے اس لئے جس طرح متنازع فیہ توسل کے نہ ماننے والوں کو گستاخ، گمراہ اور کافر کہنا ممنوع و ناجائز ہے، اسی طرح اس کے قائلین کو مشرک اور گمراہ سمجھنا ناجائز اور بہت بڑا ظلم ہے، البتہ حد و دوسے تجاوز کرنا کہیں بھی جائز نہیں، اسی طرح محبت و احترام کے پردے میں مخلوق کی عبادت

بھی ناجائز ہے۔ محبت اور عبادت، دونوں کے حدود شریعت مطہرہ نے مقرر کئے  
 ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے سوا کسی بھی مخلوق کی عبادت کو حرام اور شرک قرار دیا ہے  
 اگرچہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے کیوں نہ ہو اس کے بالمقابل قابل  
 احترام ہستیوں، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام وغیرہ کی بحکم و احترام کا ہمیں حکم دیا گیا ہے  
 محبت اور عبادت دونوں کے حدود اور احکام جدا ہیں اور ان کو بلا امتیاز ایک  
 دوسرے پر چسپاں کرنا سراسر ظلم اور قرآن مجید میں معنوی تخلف کے مترادف ہے  
 اور عوام کو خواہ مخواہ افراط و تفریط میں مبتلا کرنا ہے۔



باب پنجم

شُرک فی الاطاعت

اور

التقلید

## باب پنجم

## شُرک فی الاطاعت

شُرک فی الاطاعت کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے سوا کسی کی مستقل طور پر اطاعت کی جائے یعنی اگر کسی کا حکم، حکم الہی کے خلاف بھی ہو، پھر بھی اس کے آگے تسلیم خم کیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ و تبارک کا ارشاد ہے۔

اتَّخَذُوا اَحْبَارَهُمْ دُؤُنَ رَبِّهِمْ اَنْبِيَاۡهُمْ دُوْنَ اللّٰهِ۔ پل آیت ۳۱ کی بجائے اپنا پروردگار بنا لیا ہے۔

اس آیت شریفہ کی تفسیر صحیح ترمذی میں یوں آئی ہے کہ حضرت عدی بن حاتمؓ فرماتے ہیں میں نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا میری گردن میں سونے کی صلیب تھی آپؐ نے فرمایا اے عدی اس بت کو اتار چھینکو اور میں نے آپؐ کو سورہ التوبہ کی یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سُنَا اِتَّخَذُوا اَحْبَارَهُمْ دُؤُنَ رَبِّهِمْ کہ ان اہل کتاب نے اپنے علما اور راہبوں کو اللہ تعالیٰ کی بجائے اپنا پروردگار بنا لیا ہے، چنانچہ آپؐ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ یہ لوگ اپنے علما اور راہبوں کی پرستش نہیں کرتے تھے لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال قرار دیتے تو یہ اس کو حلال سمجھتے اور جب وہ ان پر کوئی چیز حرام کر دیتے تو یہ لوگ اس کو حرام قرار دیتے۔

معلوم ہوا کہ کسی کی مستقل طور پر شارع یا قانون ساز کی حیثیت سے اطاعت کرنا ناجائز اور ممنوع ہے جس طرح کہ اہل کتاب نے حلال و حرام قرار دینے کا مکمل اختیار اپنے علما اور راہبوں کو دے رکھا تھا مگر جو اطاعت مخلوق کی ہو لیکن حکم الہی کے ماتحت ہی ہو، وہ اطاعت شرک یا حرام نہیں بلکہ مطلوب اور محمود ہے جیسے فقہائے اُمت

اور آئمہ مجتہدین کی تقلید اور اطاعت۔ کیونکہ ان حضرات کا فقہ اور اجتہاد، قرآن و سنت کے تابع ہوتا ہے یعنی اللہ رب العزت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے ماتحت ہوتا ہے اور یہ اطاعت عین اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکامات کو چھوڑ کر اپنے آباؤ اجداد کی پیروی کرنا بھی حرام اور ممنوع ہے۔ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَفْنَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوْ لَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا قَوْلًا يَهْتَدُونَ۔ پٹ آیت ۱۰

ہیں اہل ان کے باپ دادا عقل اور ہدایت نہ رکھتے ہوں تب بھی۔

اس آیت مبارکہ سے جس طرح آباؤ اجداد کی اندھی تقلید اور اتباع کی مذمت ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح مخلوق کی جائز اتباع اور تقلید کی شرائط کی نشان دہی بھی ہو گئی ہے یہاں اللہ تعالیٰ نے باپ دادوں کی مذموم تقلید کے دو سبب بیان فرمادیئے۔ ایک یہ کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کو بر ملا رد کر کے انہیں نہ ماننے کا اعلان کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے آباؤ اجداد عقل اور ہدایت سے کورے تھے (لَا يَعْقِلُونَ) اور لَا يَهْتَدُونَ جس سے معلوم ہوا کہ اگر آباؤ اجداد اور ایک عالم کے متعلق یہ اطمینان ہو جاتے کہ اس کے پاس قرآن و سنت کا علم ہے اور اس کو عقل یعنی درجہ اجتہاد بھی حاصل ہے اگرچہ احکام قرآن و حدیث میں صراحتاً نہ ہوں، ان کو بذریعہ اجتہاد اور عقل نصوص شرعیہ سے نکال سکتا ہے، تو ایسے عالم اور مجتہد کی تقلید اور اتباع اللہ جل شانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور اطاعت ہے۔

قرآن مجید ہی سے اہل حق، اہل علم و عقل اور اہل رشد و ہدایت آباؤ اجداد، باپ دادوں کی پیروی اور اتباع ثابت ہے جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے

وقت اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے انہوں نے جواب میں عرض کیا۔

لَعْبُدُ إِلَهَكَ وَاللَّهُ أَبَاكَ إِنَّا هِمْ  
وَأَسْمِعِيلَ وَاسْحَاقَ إِلَهًُا وَاحِدًا۔  
(البقرہ آیت ۱۳۳)

ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے باپ دادوں کے خدا کی (یعنی ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے خدا کی) وہ خدا ہے واحد جلا شریک

اور حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام میں تقلید کی دونوں قسموں یعنی حق و باطل کی مثال موجود ہے۔

إِنِّي مَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ  
بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ  
وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَاسْحَاقَ  
وَيَعْقُوبَ رَسُولَ اللَّهِ (آیت ۲۵ تا ۲۸)

میں نے اس قوم کی ملت و مذہب کو چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور جو آخرت کے منکر ہیں اور میں نے پیروی کی اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیم اسحاق اور یعقوب کی ملت اور مذہب کی۔

اس سے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ جل شانہ اور اس کے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں بے وقوف باپ دادوں کی تقلید حرام اور ممنوع ہے لیکن اگر باپ دادا علم و عقل اور رشد و ہدایت پر ہوں تو ان کی اتباع جائز اور پسندیدہ ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فقہائے امت اور مجتہدین جن کی بصارت و بصیرت، علم و تقویٰ ہر لحاظ سے ایک مسلم حقیقت ہے کی تقلید اور اتباع کرنا جائز اور مطلوب ہے۔ اور جو لوگ ائمہ مجتہدین کی تقلید کو کافروں کی تقلید پر منطبق کر کے شرک و کفر قرار دیتے ہیں وہ سخت غلطی اور جہالت میں مبتلا ہیں۔ اس موضوع پر حضرت مولانا تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اپنی کتاب "تعلیم کی شرعی حیثیت" میں بہت ہی منصفانہ بحث کی ہے۔ اس باب میں حضرت کی کتاب سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔

تعلیم کی حقیقت | دین کی اصل دعوت صرف ایک اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت و اطاعت کی طرف ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی اسی لئے واجب ہے کہ آپ نے اپنے اقوال و افعال سے اللہ کے احکام کی ترجمانی

فرمائی ہے، علال و حرام اور جائز و ناجائز کو واضح فرمایا۔  
قرآن و سنت میں بعض احکام اور باتیں تو ایسی ہیں جنہیں ہر ایک شخص باسانی  
سمجھ لیتا ہے، مثلاً۔

لَا يَذْنِبُ لِعُضْلِكَوُ بَعْضًا (سورة الحجرات) تم میں سے کوئی کسی کو پیٹھ پیچھے بڑا نہ کرے۔  
معمولی لکھا پڑھا آدمی اور قحورڑی سی عربی جاننے والا اس آیت کے معانی جان لے گا  
یا مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔  
لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجْمِيٍّ (یعنی کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔)

یہ ارشاد بھی بالکل آسان اور واضح ہے اور اس میں بھی کوئی پیچیدگی یا الجھن نہیں  
لیکن قرآن و سنت کے بہت سے احکام ایسے ہیں جن میں اجمال پایا جاتا ہے، کچھ  
ایسے بھی ہیں جو دوسری آیت یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی کسی دوسری حدیث سے  
متعارض نظر آتے ہیں مثلاً۔

(۱) وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو وہ تین قرء  
گزرنے تک انتظار کریں گی۔

یہ مطلقہ عورت کی عدت کا بیان ہے جس کی مدت تین قرء بیان کی گئی ہے قرء  
کا لفظ عربی زبان میں حیض (ماہواری) کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور طہر (پاکی) کے لئے  
بھی، اگر پہلا معنی لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تین مرتبہ ایام ماہواری گزر جائیں، اگر دوسرے  
معنی لئے جائیں تو تین طہر گزرنے پر عدت پوری ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ کس معنی کو  
لیا جائے؟

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔  
مَنْ كَانَ لَهُ امَاةٌ فَقَرَأَ اِلَيْهَا مِنْ قُرْآنٍ فَهُوَ كَقُرْآنِ امَاةٍ  
جن شخص کا کوئی امام ہو تو امام کی قرأت اس کے  
لئے بھی قرأت بن جائے گی۔

دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے۔  
لَا صَلَوةَ لِمَنْ لَوْ قَرَأَ بِفَاتِحَةٍ  
جن شخص نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز

الکتاب۔

نہیں ہوگی۔

اب دونوں حدیثوں کو دیکھتے ہوئے یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلی حدیث شریف کو بنیاد بنا کر دوسری حدیث کا مطلب یوں لیا جائے کہ یہ منفرد (ایکے نمازی) کے لئے ہے۔ یا دوسری حدیث کو اصل مان کر یوں کہیں کہ پہلی حدیث میں قرأت سے مراد سورۃ فاتحہ کے سوا کوئی دوسری سورت ہے اور سورۃ فاتحہ اس سے مستثنیٰ ہے؛

اب صاف ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث سے احکام نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔ اب ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اپنی سمجھ کو رہنما بنا کر اس قسم کے احکام میں فیصلے کرنے لگیں۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہوگا کہ ہمارے جلیل القدر اسلاف اور بزرگوں نے ان آیات و احادیث کا کیا مطلب لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلا طریقہ نہایت خطرناک ہے اور دوسرا طریقہ بہت محتاط ہے۔ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ علم و فہم، تقویٰ و پرہیزگاری، دین و دیانت، ذکاوت و حافظہ کے لحاظ سے ہم لوگ قرونِ اولیٰ کے علماء کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے پھر وہ لوگ قرآن و سنت کو ہم سے کبتر بھی سمجھتے تھے کیونکہ نزول قرآن کے زمانے کے قریب تھے، اور اس زمانے کی معاشرت، طرز گفتگو، قرآن و حدیث کے صحیح پس منظر اور نزول کے ماحول سے مکمل واقف تھے۔

اب اگر ہم اپنی سمجھ پر اعتماد کرنے کی بجائے قرآن و سنت کے احکام میں اس مطلب و مفہوم کو اختیار کر لیں جو ہمارے اسلاف میں سے کسی عالم نے سمجھا ہے تو یوں کہا جائے گا کہ ہم نے فلاں عالم کی تقلید کی ہے۔

**تقلید کی ضرورت** | یہ بات صاف ظاہر ہے کہ تقلید کی ضرورت وہاں پیش آئے گی جہاں قرآن و سنت کے کسی حکم کو ہم ٹھیک طرح نہ سمجھ سکیں۔ خواہ اس بنا پر کہ کسی عبارت کے ایک سے زیادہ معنی نکل سکیں ہوں یا اس میں تفصیل مذکور نہ ہو یا اس کے متعارض دلیل موجود ہو۔ قطعی احکام جن کے سمجھنے میں کوئی مشکل نہ ہو، میں کسی امام یا مجتہد کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ مشہور حنفی عالم علامہ عبد الغنی نابلسی فرماتے ہیں۔

قالا مر متفق علیہ المعلوم من الدین  
بالضرورة لا یتحتاج الی التقاید فیہ  
لا حد الا للیہ کفر ضیئة الصلوة والصوم  
والزکوٰۃ والحج ونحوها وحرمة  
الزنا واللواط وشراب الخمر والقتل  
والرفقة والغصب وما اشبه ذلك  
والہ من المختلف فیہ هو الذی یتحتاج  
الی التقاید فیہ

اسی طرح علامہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

پس وہ منطقتہ مسائل جن کا دین میں ہونا بدھتہ  
معلوم ہے۔ ان میں اکثر اربعہ میں سے کسی کی  
تقلید کی ضرورت نہیں مثلاً نماز، روزے، زکوٰۃ  
حج وغیرہ کی فرضیت، اور زنا، لواط، شراب نوشی  
قتل، چوری، غصب وغیرہ کا حرام ہونا۔ دراصل  
تقلید کی ضرورت ان مسائل میں پڑتی ہے  
جن میں علما کا اختلاف ہو۔

اور شرعی احکام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ احکام  
ہیں جن کا جزو دین ہونا بدھتہ ثابت ہے مثلاً  
پانچ نمازیں، زکوٰۃ، رمضان کے روزے اور  
حج، زنا اور شراب کی حرمت اور اسی جیسے دوسرے  
احکام، تو اس قسم میں تقلید جائز نہیں۔ کیونکہ ان  
چیزوں کا علم تمام لوگوں کو ہوتا ہے۔ لہذا  
اس میں تقلید کے کوئی معنی نہیں  
اور دوسری قسم وہ ہے جس کا علم فکر و  
نظر اور استدلال کے بغیر نہیں ہو سکتا، جیسے  
عبادات، معاملات اور شادی بیاہ کے  
فروعی مسائل اس قسم میں تقلید درست ہے  
کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فاستلوا اہل الذکر  
یعنی اہل ذکر (علماء) سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے

واما الاحکام الشرعیة ففروا بان  
احدہما لعلو ضرورتہ من دین الرسول  
صلی اللہ علیہ وسلم کالصلوات الخمس  
والزکوٰۃ وصوم شہر رمضان والحج  
وتحريم الزنا وشراب الخمر وما اشبه  
ذلك فہذا لا یجوز التقاید فیہ لان  
الناس کلہم یشترون فی ادراک  
والعلوبہ فلا معنی للتقلید فیہ وضرب  
اخرہ یعلومہ لا بالنظر والہ مستدل  
کفروع العبادات والمعاملات والفروع  
والمناکحات وغیر ذلك من الاحکام  
فہذا یسوغ فیہ التقاید بدلیل قول  
اللہ تعالیٰ فاستلوا اہل الذکر ان کنتوا

لہ علامہ التحقیق فی حکم التقلید والتلفیق من خبرہ مطبوعہ مکتبۃ الشیخ۔ استنبول۔

لَتَعْلَمُونَ وَإِنَّمَا لَوْ تَعْلَمُوا التَّقْلِيدَ فِي  
هَذَا الْمَسْأَلِ الَّتِي هِيَ مِنْ فُرُوعِ الدِّينِ  
لَا حَاجَ كُلِّ أَحَدٍ أَنْ يَعْلَمَ ذَلِكَ وَ  
فِي إِيحَابِ ذَلِكَ قَطْعٌ عَنِ الْمَعَالِشِ وَ  
هَلَاكَ الْحَرْثِ وَالْمَأْشِئَةِ فَوَجِبَ  
أَنْ يَسْقُطَ

ہو، نیز اس لئے کہ اگر ہم دین کے ان فردعی مسائل  
میں تقلید کو ممنوع کر دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ  
ہر شخص باقاعدہ علوم دین کی تحصیل میں لگ جائے  
اور لوگوں پر اس تعلیم کو واجب کرنے سے زندگی  
کی تمام ضروریات برباد ہو جائیں گی اور کھیتوں اور  
مویشیوں کی تباہی لازم آئے گی لہذا ایسا حکم نہیں دیا جاسکتا

**کیا تقلید شرک ہے؟** مذکورہ بالا عبارات سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ  
تقلید کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ امام یا مجتہد کو بذاتِ خود  
واجبِ اطاعت سمجھ کر اس کا اتباع کیا جا رہا ہے۔ بلکہ مقصود تو قرآن و سنت کی پیروی  
ہے لیکن امام کی تشریح و تعبیر پر اعتماد کیا جا رہا ہے۔ وہ قرآن و سنت کا شارح و تشریح  
کرنے والا ہے۔ شارح و شریعت یا قانون بنانے والا ہرگز نہیں۔ مقلد اپنے امام کو  
ماخذ شریعت نہیں سمجھتا۔ بلکہ یہ سمجھ کر اس کے قول پر عمل کرتا ہے کہ امام خود قرآن و سنت  
کے علوم میں پوری بصیرت رکھتا ہے اس لئے اس کی تشریح زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔  
اب ذرا انصاف کی نظر سے دیکھ کر بتائیے کہ اس میں شرک یا گناہ کی کون سی بات  
ہے؟ اگر امام کو شارح و قانون ساز، یا بذاتِ خود واجبِ اطاعت مانا جائے تو بلاشبہ  
یہ شرک ہے۔

دیکھتے فی الحال پاکستان میں جو قانون نافذ ہے وہ کتابی شکل میں مرتب اور مدون  
ہے۔ کروڑوں کی آبادی میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو قانون کو کتابوں سے پڑھ پڑھ کر اس  
پر عمل کرتے ہیں؟ اچھے خاصے انگریزی دان بھی وکیل سے مشورہ لیتے ہیں۔ خود قانون کی  
کتاب براہِ راست سمجھنے کی جرأت نہیں کرتے۔ کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے وکلاء  
کو حاکم یا قانون ساز تسلیم کر لیا ہے۔  
بس اسی طرح قرآن و سنت کے احکام کو ٹھیک طرح سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے

آئمہ مجتہدین پر اعتماد کرنے کو تعلیدہ کہتے ہیں۔

**تعلید کا ثبوت آیات قرآن سے** | تعلید کی حقیقت کے بارے میں قرآن کریم میں اصولی ہدایات موجود ہیں اللہ تعالیٰ

کا ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ  
وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ  
(سورۃ النسا - آیت ۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول  
کی اطاعت کرو اور اپنے آپ میں سے اولوالامر  
کی اطاعت کرو۔

”اولوالامر“ سے مراد بعض مفسرین کے نزدیک مسلمان حکام ہیں اور حضرت جابر بن  
عبد اللہ، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت مجاہد، حضرت عطاء بن ابی رباح، حضرت  
عطاء بن السائب، حضرت حسن بصری، حضرت ابو العالیہ اور دوسرے بہت سے مفسرین  
نے اس کا مطلب علماء اور فقہاء لیا ہے۔ اور امام رازی نے اسے ترجیح دی ہے اور علامہ  
ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امراء کی اطاعت کا نتیجہ بھی بالآخر علماء ہی کی اطاعت ہے  
کیونکہ امراء بھی شرعی معاملات میں علماء کی اطاعت کے پابند ہیں۔

بہر حال اس آیت مبارک میں مسلمانوں کو کہا گیا ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت کریں  
اور ان علماء اور فقہاء کی اطاعت کریں جو اللہ اور اس کے رسول کے کلام کی تشریح کرنے  
والے ہیں اسی اطاعت کو اصطلاح میں تعلید کہتے ہیں آگے اللہ پاک فرماتے ہیں۔

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى  
اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ  
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ ۝۱۵۹  
پس اگر کسی معاملے میں تمہارا باہم اختلاف ہو جائے  
تو اس معاملے کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف  
ٹوٹا دو۔ اگر اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

اس جملہ میں مجتہدین کو خطاب کیا گیا ہے اور امام ابو جبر جصاص ”اولوالامر کا مطلب  
علماء لیتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

اور اولوالامر کی اطاعت کا حکم دینے کے فوراً بعد  
اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ اگر کسی معاملے میں تمہارے  
وقولہ تعالیٰ عقیب ذلك فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ  
فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ

يبدل ان اولى الامر هم الفقهاء لانه  
امر سائر الناس بطاعتهم ثم قال  
فان تنازعتموه فامر اولى الامر  
من المتنازع فيه الى سنة نبويه  
صلى الله عليه وسلم اذ كانت العامة  
ومن ليس من اهل العلم ليست هذه  
منزلة لهم لانه لا يعرفون كيفية  
الرد الى كتاب الله والسنة ووجوه  
دلالتها على احكام الحوادث فثبت  
انه خطاب للعلماء

درمیان اختلاف ہو جاتے تو اس کو اللہ اور  
رسول کی طرف لوٹا دو اس بات کی دلیل ہے کہ  
اولوالامر سے مراد فقہاء ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ  
نے تمام لوگوں کو ان کی اطاعت کا حکم دیا اور پھر  
فان تنازعتموه فرما کر اولوالامر کو حکم دیا کہ جس معاملے  
میں ان کے درمیان اختلاف ہو اسے اللہ کی کتاب  
اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف لوٹا دو  
یہ حکم فقہاء ہی کو ہو سکتا ہے کیونکہ عوام الناس اور  
غیر اہل علم کا یہ مقام نہیں ہے اس لئے کہ وہ اس بات  
سے واقف نہیں ہوتے اللہ کی کتاب اور سنت کی

طرف کسی معاملے کو لوٹانے کا کیا طریقہ ہے اور انہیں نت نئے مسائل اخذ کرنے کے لئے دلائل کے طریقے  
کا علم ہوتا ہے لہذا ثابت ہو گیا کہ یہ خطاب علماء کو ہے۔

مشہور اہل حدیث عالم علامہ نواب صدیق حسن خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے  
بھی اعتراف کیا ہے کہ فان تنازعتموه کا خطاب مجتہدین کو ہے۔

والظاهر انه خطاب مستقل متلف  
موجہ للمجتہدین

یہی معلوم ہوا کہ جن میں اجتہاد کی اہلیت نہیں مختلف فیہ مسائل میں ان کو  
براہ راست قرآن و حدیث سے رجوع کر کے خود فیصلہ کرنا درست نہیں، عام لوگوں  
کو خطاب ہے کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں جس کا طریقہ یہ ہے کہ  
اولی الامر یعنی فقہاء سے مسائل پوچھیں اور ان پر عمل کریں، جب کہ دوسرے جملہ میں  
مجتہدین کو خطاب ہے کہ تنازعہ کی صورت میں کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ  
علیہ وسلم کی طرف رجوع کر کے اپنی اجتہادی بصیرت کے ذریعہ احکام اخذ کریں۔ لہذا پہلے

جملہ میں عام مومنین کو تعلیہ کا حکم ہے اور دوسرے جملہ میں متبحر علما کو اجنباد کا۔  
(۲) قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْرِ  
أَوْ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ  
إِلَى الرَّسُولِ وَالْإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ  
لَعَلَّهُمُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ  
(نساء آیت ۸۳)

اور جب ان (عوام الناس) کے پاس امن یا خوف  
کی کوئی بات پہنچتی ہے تو یہ اس کی اشاعت کر  
دیتے ہیں اور اگر یہ اس معاملے کو رسول کی طرف  
یا اپنے اولوالامر کی طرف لوٹا دیتے تو ان میں سے جو  
لوگ اس کے استنباط کے اہل ہیں وہ اس کی تحقیقت  
کو خوب معلوم کر لیتے۔

اس آیت سے یہ اصولی ہدایت ملتی ہے کہ جو لوگ گہری نظر اور تحقیق کی قابلیت  
نہیں رکھتے انہیں اہل استنباط (فقہاء مجتہدین) کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور وہ اپنی  
بصیرت سے جو راہ عمل متعین کریں اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اسی کا نام تعلیہ ہے چنانچہ  
امام رازی اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

فثبت ان الاستنباط حجة، والقياس  
اما استنباط او داخل فيه فوجب ان  
يكون حجة اذا ثبت هذا فنقول الآية  
دالة على امور احدها ان في الاحكام  
حوادث ماله يعرف بالنص بل بالاستنباط  
وثانيها ان الاستنباط حجة، وثالثها  
ان العامي يجب عليه تعليل العلماء في  
احكام الحوادث۔

پس ثابت ہوا کہ استنباط حجت ہے۔ اور قیاس یا تو  
خود استنباط ہے یا استنباط میں داخل ہے لہذا  
وہ بھی حجت ہوا۔ جب یہ بات طے ہو گئی تو اب  
ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت چند امور کی دلیل ہے ایک یہ  
کہ نئے نئے پیش آنے والے مسائل میں بعض امور ایسے  
ہوتے ہیں جو آیات سے (صاف طور پر) معلوم نہیں  
ہوتے بلکہ ان کا حکم معلوم کرنے کے لئے استنباط کی  
ضرورت پڑتی ہے دوسرے یہ کہ استنباط حجت ہے  
اور تیسرے یہ کہ عام آدمی پر واجب ہے کہ وہ پیش آنے والے مسائل و احکام کے بارے میں علما کی

تعلیہ کرے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ آیت جنگ کے مخصوص حالات کے بارے میں ہے، امام رازنی اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

ان قوله وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَمَّ فِي كُلِّ مَا يَتَعَلَّقُ بِالْحَرْبِ وَفِيمَا يَتَعَلَّقُ بِسَائِرِ الْوَقَائِعِ الشَّرْعِيَّةِ. لِأَنَّ الْأَمْنَ وَالْخَوْفَ حَاصِلَ فِي كُلِّ مَا يَتَعَلَّقُ بِبَابِ التَّكْلِيفِ فَثَبَّتَ أَنَّهُ لَيْسَ فِي الْآيَةِ مَا يَوْجِبُ تَخْصِيصَهَا بِأَمْرِ الْحَرْبِ.

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ جب ان کے سامنے امن یا خوف کا کوئی معاملہ آتا ہے، البتہ بالکل عام ہے جس میں جنگ کے حالات بھی داخل ہیں اور تمام شرعی مسائل بھی اس لئے کہ امن و خوف ایسی چیزیں ہیں کہ شریعت کے فرض کردہ احکام کا کوئی باب ان سے باہر نہیں، لہذا ثابت ہوا کہ آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو اسے صرف جنگ کے حالات سے مخصوص کر دے۔

اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خاں صاحب فرماتے ہیں۔

فِي الْآيَةِ إِشَارَةٌ إِلَى جَوَازِ الْقِيَاسِ وَأَنَّ مِنَ الْعُلُومِ مَا يَدْرِكُ بِالتَّنْبِطِ

اس آیت میں قیاس کے جائز ہونے کی طرف اشارہ ہے اور بعض علم ایسے ہیں جن کا ادراک حاصل کرنا، استنباط کے ذریعہ ہوتا ہے۔

(۳) ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَلَوْ أَنَّهُمْ فَرَمُوا كُلَّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ

پس کیوں نہ مکمل پڑا ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک گروہ تاکہ یہ لوگ دین میں تفقہ (سمجھ) حاصل کریں اور تاکہ لوٹنے کے بعد اپنی قوم کو ہشیدہ کریں، شاید کہ وہ لوگ (اللہ کی نافرمانی سے) بچیں۔

(سورۃ التوبہ آیت ۱۲۲)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ علم حاصل کرنے والی جماعت پر یہ واجب ہے کہ وہ دوسروں کو شریعت کے احکام سے باخبر کرے اور دوسروں پر واجب ہے کہ

لے تفسیر کبیر ج ۳ ص ۲۷۲ لے فتح البیان ج ۲ ص ۲۳۰۔

کہ اللہ کی نافرمانی سے بچنے کے لئے ان کے بتلاتے ہوئے احکام پر عمل کریں۔ اسی کا نام تقلید ہے۔ اس پر امام جصاصؒ گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

فَأَوْجِبُ الْحَذَرَ بِأَنْذَارِهِمْ  
وَالْزَمُ الْمُنْذَرِينَ قَبُولَ  
قَوْلِهِمْ۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں پر واجب کیا ہے کہ جب علماء ان کو احکام شریعت بتا کر، ہوشیار کریں تو وہ (اللہ کی نافرمانی سے بچیں اور علماء کی بات مانیں۔

(۴) الشریعہ کا ارشاد ہے

فَأَسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

اس آیت شریفہ میں یہ اصول بتلایا گیا ہے کہ جو لوگ عالم نہ ہوں وہ علم و فن کے ماہرین سے پوچھ کر عمل کیا کریں۔ اسی کو تقلید کہتے ہیں۔ علامہ خطیبؒ بغدادی لکھتے ہیں۔

أَمَّا مَنْ يَسُوْغِلُ التَّقْلِيْدَ فَهُوَ الْعَامِي

الَّذِي لَا يَعْرِفُ طَرِيقَ الْأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ

فَيَجْزُلُ أَنْ يَقْلِدَ عَالِمًا وَيَعْمَلُ بِقَوْلِهِ

قَالَ اللَّهُ تَعَالَى فَأَسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ۔

وہ عامی شخص ہے جو احکام شرعیہ کے طریقے نہیں جانتا۔ پس اس کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی عالم کی تقلید کرے اور اس کے قول پر عمل کرے۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَاَسْأَلُوا اَهْلَ الذِّكْرِ

خطیبؒ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت عمر بن قیسؒ کا قول نقل کیا ہے کہ آیات بالا میں اہل الذکر سے مراد اہل علم ہیں۔

تقلید کا ثبوت حدیث شریفہ سے

۱) عَنْ حَذِيفَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنْ لَا أَدْرِي مَا بَقَايُ

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے

نہ احکام القرآن للجصاص ص ۲۶ ص ۲۶۲ الفقیہ والمتفقہ للخطیب بغدادی ج ۲ ص ۶۸ مطبوعہ دار الافتاء سعودیہ ریاض ۱۴۱۹ھ۔

فیکو، فاقند و بالذین من  
بعدہ، البکرو و عمرہ

معلوم نہیں میں کتنا عرصہ تمہارے درمیان رہوں  
گا۔ پس تم میرے بعد دو شخصوں کی اقتداء کرنا،  
ایک ابو بکرؓ دوسرے عمرؓ۔

ارواہ الترمذی وابن ماجہ و احمد

حدیث شریف میں لفظ اقتداء آیا ہے جو دینی امور میں کسی کی پیروی کے لئے  
استعمال ہوتا ہے۔ عربی لغت کے مشہور عالم ابن منظور لکھتے ہیں: الْقُدْوَةُ وَالْقَدْوَةُ  
مَا تَسَنَّتْ بِهِ، یعنی قدوة اس شخص کو کہتے ہیں جس کی سنت پر تم عمل کرو اور القدوة الاخرة  
قدوة کے معنی ہیں اسوة (یعنی نمونہ) قرآن کریم میں بھی یہ لفظ دینی امور میں انبیاء علیہم السلام  
اور صلحا کی پیروی کے لئے آیا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهِدَّاهُمْ  
اقتداء (سورہ النعام آیت ۹۰)

پس مندرجہ بالا حدیث شریف میں لفظ اقتداء استعمال کیا گیا ہے جو کہ دینی امور  
میں کسی کی پیروی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور یہاں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی  
اقتداء کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اسی کا نام تقلید ہے۔

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
نے ارشاد فرمایا۔

من افقی بخیر علم کان اثمة  
على من افقاه۔

اس حدیث شریف سے صاف ظاہر ہے کہ تقلید جائز ہے اور عالم کے فتویٰ  
پر دلیل کی تحقیق کے بغیر عمل جائز ہے، کیونکہ سارا گناہ بے علم کو ہوگا جو فتویٰ دے۔  
اگر فتویٰ کی تحقیق کے بغیر عمل جائز نہ ہوتا تو سوال کرنے والے کو بھی اس بات کا گناہ ہونا  
چاہیے تھا کہ اس نے فتویٰ کی صحت کی تحقیق کیوں نہیں کی۔ پس حدیث شریف سے واضح  
ہو گیا کہ جو شخص خود عالم نہ ہو اس کا فریضہ صرف اس قدر ہے کہ جو شخص اس کی معلومات

لہ مرقاۃ المفاتیح ج ۵ ص ۵۴۹ باب مناقب ابی بکرؓ و عمرؓ۔

کے مطابق قرآن و سنت کا علم رکھتا ہو مسئلہ پوچھ لے، اگر وہ غلط بتاتے تو گناہ عالم پر ہوگا پوچھنے والے پر نہیں۔

(۳) حضرت ابراہیم بن عبد الرحمن العذری سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمُ مِنْ كُلِّ خَلْفٍ عَدُوًّا  
يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِبِينَ وَ  
اِنْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ وَتَأْوِيلَ الْجَاهِلِينَ  
(رواہ البیہقی فی المدخل)

ہر آنے والی نسل کے ثقہ لوگ اس علم دین کے  
حامل ہوں گے جو اس سے غلو کرنے والوں کی  
تحریف کو باطل پرستوں کے جھوٹے دعووں کو  
اور باطلوں کی تاویلات کو دور کریں گے۔

اس حدیث شریف میں جاہلوں کی تاویلات کی مذمت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے  
کہ ان تاویلات کی تردید علماء کا فرض ہے اور تاویلات بھی وہی آدمی کر سکتا ہے جو علم دین  
اور عربی کی شد بدرکھتا ہو، لیکن ایسے شخص کو بھی حدیث میں "جاہل" قرار دیا گیا اس کی تاویل  
کی مذمت کی گئی، پس جو لوگ مجتہد نہ بصیرت نہیں رکھتے انہیں قرآن و حدیث کے صحیح  
مطلب کو سمجھنے کے لئے اہل علم کی طرف رجوع کرنا لازمی ہے اسی کو تعلید کہتے ہیں۔

صحابہ کے زمانے میں تعلید | صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں تعلید پر بکثرت  
عمل ہوتا رہا ہے جو صحابہ تحصیل علم میں زیادہ وقت  
نہیں لگا سکتے تھے وہ فقہاء صحابہ سے پوچھ پوچھ کر عمل کرتے تھے اور صحابہ کرام سے  
تعلید مطلق اور تعلید شخصی دونوں ثابت ہیں، ان روایات جن سے تعلید کا ثبوت ملتا ہے  
سے قبل تعلید مطلق اور تعلید شخصی کے فرق کو سمجھ لینا چاہیے۔

تعلید مطلق | اگر ایک مسئلہ میں ایک عالم کا مسلک لیا جائے اور دوسرے مسئلہ میں  
کسی دوسرے عالم کی رائے قبول کر لی جائے تو اس کو تعلید مطلق یا تعلید  
عام یا تعلید غیر شخصی کہیں گے۔

**تقلید شخصی** اگر تقلید کے لئے کسی ایک مجتہد عالم کو اختیار کیا جاتے اور ہر مسئلہ میں اسی کے فیصلہ کو لیا جاتے تو اسے تقلید شخصی کہتے ہیں۔  
پہلے تو صحابہؓ کے دور میں تقلید مطلق کی مثالیں آتی ہیں۔

(۱) عن ابن عباسؓ قال خطب عمر بن الخطاب الناس بالجباية وقال يا ايها الناس من اراد ان ليسل عن القرآن فليأت ابى بن كعب ومن اراد ان ليسل عن الفرائض فليأت زيد بن ثابت ومن اراد ان يسأل عن الفقه فليأت معاذ بن جبل ومن اراد ان يسأل عن المال فليأتني فان الله جعلني له واليا وقائما (رواه الطبرانی فی الاوسط)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے جابیه کے مقام پر خطبہ دیا اور فرمایا اے لوگو! جو شخص قرآن کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہو وہ ابی بن کعبؓ کے پاس جاتے جو میراث کے احکام کے بارے میں پوچھنا چاہے وہ زید بن ثابتؓ کے پاس جاتے اور جو شخص فقہ کے بارے میں پوچھنا چاہے وہ معاذ بن جبلؓ کے پاس جاتے اور جو شخص مال کے بارے میں سوال کرنا چاہے وہ میرے پاس آجائے اس لئے کہ اللہ نے مجھے اس کا والی اور قیام کنہ بنایا ہے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی اس تقریر میں لوگوں کو تفسیر، فرائض اور فقہ کی معلومات حاصل کرنے کے لئے ماہر اور ممتاز صحابہؓ کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کی کہ لوگ ان کے بتاتے ہوئے مسائل پر عمل کریں، یہی تقلید ہے۔

(۲) عن عبد الرحمن قال سألت محمد بن سيرين عن دخول الحمام فقال كان عمر بن الخطاب يكرهه۔  
عبد الرحمنؓ فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن سيرينؓ سے پوچھا کہ غسل کے لئے حمام میں داخل ہونا جائز ہے انہوں نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ اسے مکروہ کہتے تھے۔  
دیکھتے یہاں محمد بن سيرينؓ نے صرف اتنا کہا کہ حضرت عمرؓ اسے مکروہ کہتے تھے۔ اس کی کوئی دلیل نہیں بتاتی۔

صحابہ کرامؓ میں سے بھی جو حضرات خود کو اہل اجتہاد یا اہل استنباط نہیں سمجھتے تھے وہ فقہاء صحابہؓ سے پوچھتے وقت دلائل کی تحقیق نہیں فرماتے تھے، بلکہ اعتماد کر کے مسائل

پر عمل کرتے تھے۔

(۳) عن سلیمان بن یسار ان ابا ایوب  
الانصاری خرج حاجا حتى اذا كان  
بالنازية من طريق مكة اضل راحله  
وانه قدم على عمر بن الخطاب يوم النحر  
وذكر ذلك له فقال عمر بن الخطاب  
اصنع ما يصنع المعتصم، ثم قد عللت  
فاذا ادركك الحج قابلا فاحجج  
واهد ما استيسر من الهدى۔

حج کا نماز آئے تو دوبارہ حج کرو اور جو قربانی میسر ہو ذبح کرو۔

اس مثال میں بھی نہ حضرت ابو ایوبؓ نے مسئلے کی دلیل پوچھی نہ حضرت عمر رضی اللہ  
عنه نے بتائی، انہوں نے فقط حضرت عمرؓ کے علم و فہم پر یقین کر کے عمل فرمایا، اسی کو  
تقلید کہتے ہیں۔

(۴) عن مصعب بن سعد كان ابي  
اذ صلي في المسجد فجوز واقواله كوع  
والسجود والصلوة قلت يا ابتاه اذا  
صليت في المسجد جوزت واذا صليت  
في البيت اطمت؟ قال يا بخت انا ائمة  
ليقتدى بنا (رواه الطبراني في الكبير ورجال  
رجال الصحيح)

حضرت مصعب بن سعدؓ فرماتے ہیں کہ میرے والد سعد  
بن ابی وقاصؓ جب مسجد میں نماز پڑھتے تو رکوع اور  
سجدہ تو پورا کر لیتے مگر اختصار سے کام لیتے اور جب  
گھر میں نماز پڑھتے تو رکوع سجدہ اور نماز کے دوسرے  
ارکان اطویل فرماتے۔ میں نے عرض کیا ابا جان آپ  
جب مسجد میں نماز پڑھتے ہیں تو اختصار سے کام  
لیتے ہیں اور جب گھر میں پڑھتے ہیں تو اطویل نماز

پڑھتے ہیں، حضرت سعدؓ نے جواب دیا کہ بیٹے ہم (لوگوں کے) امام ہیں، لوگ ہماری اقتداء کرتے ہیں (یعنی  
لوگ ہمیں طویل نماز پڑھتے دیکھیں گے تو اتنی لمبی نماز پڑھنا ضروری سمجھیں گے اور جاوے گا اس کی پابندی

لہ موطا امام مالک ص ۴۹، اپری من فات الحج، مجمع الزوائد للبیہقی ج ۱ ص ۱۸۲، باب الاقضاء بالسلط۔

شروع کر دیں گے۔

پس ثابت ہوا کہ عام لوگ بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کو دیکھ کر ان کی تقلید کرتے تھے اس لئے وہ اپنے عمل میں اتنی باریک باتوں کا خیال رکھتے تھے۔

(۵) ان عمر بن الخطابؓ راوی علی طلحہ بن عبید اللہ ثوباً مصبوغاً و هو محرم فقال عمرؓ ما هذا الثوب المصبوغ یا طلحہ؟ فقال طلحہ بن عبید اللہ یا امیر المؤمنین انما هو مدر، فقال عمرؓ انکو ایہا الرہط ائمتہ یقتدی بکوالناس فلوان رجلاً جاہلاً راوی هذا الثوب، لقال ان طلحہ بن عبید اللہ قد کان یلبس الثیاب المصبغة فی الاحرام فلا تلبسوا ایہا الرہط شیئاً من هذه الثیاب المصبغة۔  
پہنا جاتے ہیں چنانچہ وہ خوشبو والے رنگین کپڑے بھی پہننے لگیں گے، لہذا آپ حضرات اس قسم کے رنگے ہوئے کپڑے نہ پہنا کریں۔

(۶) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن مسعودؓ کو کوفہ بھیجا اور اہل کوفہ کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا۔

انی قد بعثت الیکم بعمار بن یاسر امیراً وعبد اللہ بن مسعود معلماً و وزیراً و هما من النجباء من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اہل بدر میں نے تمہارے پاس عمار بن یاسرؓ کو امیر بنا کر اور عبد اللہ بن مسعودؓ کو معلم اور وزیر بنا کر بھیجا ہے اور یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شریف صحابہؓ ہیں سے میں اور اہل بدر سے ہیں

فأقصد وأبهما وأسمعو من قولهما۔

(۷) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قضا کے اصول بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

فمن عرض له منك قضاء بعد اليوم

فليقض بما في كتاب الله. فان جاءه امر

ليس في كتاب الله فليقض بما قضى به

نبي صلى الله عليه وسلم فان جاءه امر

ليس في كتاب الله ولا قضى به نبي

صلى الله عليه وسلم فليقض بما قضى

به الصالحون، فان جاءه امر ليس في

كتاب ولا قضى به نبي صلى الله عليه

وسلم ولا قضى به الصالحون فليجتهد رأيه

ابی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہو اور صالحین نے، تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث کی تشریح میں صالحین کا

اتباع ضروری ہے یہی تقلید کا مقصد و مطلب ہے، پھر یہ حدیث قاضی اور عالم کو ہدایت

کرتی ہے کہ وہ اپنی اجتہادی رائے پر صالحین اسلاف کے فیصلے کی طرف رجوع کرے،

یہ چند مثالیں سرسری طور پر بیان کر دی گئی ہیں ورنہ کتب آثار ایسے واقعات

سے بھری پڑی ہیں۔ اس کے علاوہ صحابہؓ کے زمانے میں شخصی تقلید کی مثالیں بھی ہیں،

صحابہؓ کے زمانے میں تقلید شخصی

۱۱) صحیح بخاری میں حضرت عکرمہ رضی اللہ

عنہ سے روایت ہے۔

بعض اہل مدینہ نے حضرت ابن عباسؓ سے ایسی

عورت کے بارے میں سوال کیا جو طوافِ فرض

کے بعد عاتقہ ہو گئی ہو کہ وہ طواف و دُاع کے

ان اهل المدينة سألوا ابن عباس

رضي الله عنهما من امرأة طافت ثمر

حاضنت، قال ليهو تنفر قالوا لا ناخذ

بقولک وند۶ قول زیدؑ۔  
 اس سے ساقط ہو جائے گا؟ اور بغیر طواف کئے واپس آنا جائز ہو گا؟ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ طواف  
 وداع کے بغیر جا سکتی ہے۔ اہل مدینہ نے کہا کہ ہم آپ کے قول پر زید بن ثابتؓ کے قول کو چھوڑ کر  
 عمل نہیں کریں گے۔

یہی واقعہ مسند البودادہ میں منقول ہے اس میں اہل مدینہ کے یہ الفاظ منقول ہیں  
 اے ابن عباسؓ جس معاملے میں آپ زید بن ثابتؓ کی مخالفت کر رہے ہیں اس میں ہم  
 آپ کی اتباع نہیں کریں گے۔ اس پر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ (مدینہ پہنچ کر) ام سلمہؓ  
 سے پوچھ لینا کہ جو جواب میں نے دیا ہے وہ درست ہے۔  
 اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ اہل مدینہ زید بن ثابتؓ کی تقلید شخصی کرتے تھے اور  
 انہیں کے قول کو حجت سمجھتے تھے۔ اور ابن عباسؓ نے اہل مدینہ کو ہرگز یہ نہیں کہا کہ تم  
 لوگ ایک شخص کو تقلید کے لئے مقرر کر کے شرک اور گناہ کے مرتکب ہو رہے ہو۔  
 چنانچہ جب ان لوگوں نے ام سلمہؓ سے پوچھا اور زید بن ثابتؓ سے عرض کیا تو زید بن  
 ثابتؓ نے حدیث کی تحقیق کر کے اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیا اور اس کی اطلاع ابن عباسؓ  
 کو بھی دی جیسے مسلم، نسائی اور بیہقی وغیرہ کی روایات میں وضاحت آتی ہے۔  
 اگر اس حدیث پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر اہل مدینہ مقلد ہوتے تو ام سلمہؓ سے  
 تحقیق کیونکر کرتے۔ یہ بات دراصل اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ کسی مجتہد کی تقلید کے  
 بعد احادیث کی تحقیق حرام ہو جاتی ہے۔ حالانکہ تقلید کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ جو شخص  
 قرآن و سنت کا مطلب سمجھے، ظاہری تعارض کو دور کرنے اور ناخ و منسوخ کا فیصلہ کرنے  
 کی قابلیت خود میں نہیں پاتا وہ کسی مجتہد عالم سے تفصیلی دلائل کا مطالبہ کئے بغیر اس  
 کے علم پر مجبور نہ کر کے اس کے فتویٰ پر عمل کر لیتا ہے۔ قرآن و حدیث کا مطالعہ اور تحقیق  
 تقلید کے بعد بند نہیں ہو جاتا اس کا ثبوت وہ تفسیریں اور شرحیں ہیں جو مقلدین نے  
 لکھی ہیں۔



اتباع کریں آپ نے ان کو قرآن و سنت، قیاس و اجتہاد کے مطابق فتویٰ دینے کی اجازت بھی دے دی اس کا تو یہی مطلب ہے کہ آپ نے اہل میں کو تقلید شخصی کا پابند نہ دیا۔

حضرت معاذؓ معلم و مفتی کے طور پر یمن گئے تھے، صرف ایک حکمران کے طور پر نہیں شہوت میں حدیث شریف دیکھتے تھے صحیح بخاری کی روایت ہے۔

عن الہ مسود بن یزید قال انا معاذ بن جبل باليمن معلما ومیرا فلما عن رجل توفی وترك ابنته واخته فاعطی الہ بنته النصف والہ تحت النصف۔  
حضرت اسود بن یزید فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبلؓ ہمارے پاس یمن آئے وہ ہمارے امیر بھی تھے اور معلم بھی تھے ہم نے ان سے یہ مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص نے وفات کے بعد اپنی بیٹی اور بہن چھوڑی ہے ان کو کیا میراث ملے گی تو حضرت

معاذؓ نے بیٹی کو نصف اور بہن کو نصف میراث دی۔  
یہاں اگرچہ معاذؓ نے فتویٰ دے کر اس کی دلیل بھی نہیں بتائی، لیکن ان کا فیصلہ تقلیداً قبول کیا گیا۔

اسی طرح مسند احمد اور معجم طبرانی میں روایت ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ یمن تشریف لاتے تو خولان کی ایک عورت پاس آئی اور سلام کے بعد کہنے لگی کہ اے شخص تمہیں کس نے بھیجا ہے، حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے عورت نے کہا کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے اور آپ اللہ کے رسول کے ایلی ہیں تو اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیامبر کیا آپ مجھے دین کی باتیں نہیں بتائیں گے؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، مجھ سے جو چاہو، پوچھو۔ پس حضرت معاذؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر اور ان کے نمائندے کی حیثیت سے احکام دین بتایا کرتے تھے، اسی حدیث میں حضرت معاذؓ نے عورت کو خاوند کے حقوق بتائے، لیکن نہ کوئی آیت اور نہ کوئی حدیث سنائی، بلکہ اصول اسلام کے مطابق

صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۹، کنز الدقائق باب فی ثبوت البیانات فی صحیح الزوائد ج ۴ ص ۳۰۱، ۳۰۲، باب فی الزروع علی المرقۃ۔

جواب دیا۔ اور لوگ اُن کی تقلید کرتے تھے، صرف اہل یمن نہیں بلکہ دوسرے صحابہ بھی اُن کی تقلید کرتے تھے۔ چنانچہ ابو مسلم خولانیؒ کی روایت میں ہے کہ اہل دمشق کی ایک مسجد میں ایک علقہ میں ادھیڑ عمر کے صحابہ کرامؓ موجود تھے، درمیان میں ایک جوان سُرمگیں آنکھوں والے اور چمکدار دانت والے صحابی تھے، جب صحابہ میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا تو وہ فیصلہ اسی جوان صحابی سے کراتے، خولانیؒ نے اپنے ہم نشین سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ معاذ بن جبلؓ ہیں۔

یہ چند مثالیں تقلید شخصی کی نظیر ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقلید کی دونوں قسموں (تقلید شخصی اور غیر شخصی) پر صحابہ کرامؓ کے عہد مبارک میں عمل ہوتا رہا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ جو شخص قرآن، سنت سے براہِ راست احکام نکالنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو اصل کے اعتبار سے اس کے لئے تقلید کی دونوں قسمیں جائز اور درست ہیں، چنانچہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔

اور تقلید کی مذمت میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان کا اطلاق اس شخص پر نہیں ہوتا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کے قول کو حجت نہیں مانتا، اور جس کا اعتقاد یہ ہے کہ طلال صرف وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے طلال کر دیا اور حرام صرف وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام کر دیا، لیکن چونکہ اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کا علم نہیں ہے نہ وہ آپ کے کلام میں سے متعارض احادیث کی تطبیق کے طریقے سے واقف ہے اور نہ آپ کے کلام سے استنباط احکام کے طریقے جانتا ہے، اس لئے وہ کسی ہدایت یافتہ عالم کی اس بناء پر اتباع کر لیتا ہے کہ یہ عالم اپنے علم و فتویٰ کے منظر اپنے اقوال میں صائب و درست ہو گا۔ اور ظاہری طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا متبع ہو گا۔ چنانچہ اگر اس کا یہ گمان غلط ثابت ہو جائے تو وہ کسی جدال و اصرار کے بغیر اس کی تقلید سے دستبردار ہو جائے گا تو اس قسم کی تقلید سے کوئی کیسے انکار کر سکتا ہے، جب کہ فتویٰ پوچھنے اور فتویٰ دینے کا سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے چلا آتا ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں کہ انسان ہمیشہ ایک ہی شخص سے فتوے پوچھا

کمرے (جسے تقلید شخصی کہتے ہیں) یا کبھی ایک شخص سے اور کبھی دوسرے شخص سے  
 پوچھا کرے (جسے تقلید مطلق کہتے ہیں) جب کہ اس میں مذکورہ بالا شرائط جمع ہوں۔  
 پس فی الحقیقت تقلید شخصی ہو یا مطلق اصلاً جائز ہے۔  
**تقلید شخصی کی وجہ** | اب علما و فقہاء نے لوگوں کو صرف تقلید شخصی پر عمل کرنے کے  
 لئے کیوں فتویٰ دیا؟

فقہائے کرام نے محسوس کیا کہ لوگوں میں دیانت کا معیار روز بروز گھٹ رہا ہے  
 احتیاط اور تقویٰ اٹھتے جا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر تقلید مطلق کا دروازہ کھلا رہا  
 تو بہت سے لوگ جان بوجہ کراہت سے غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہو  
 جائیں گے۔ مثلاً ایک شخص کا سردی کے موسم میں خون نکل آیا تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک  
 اس کا وضو ٹوٹ گیا اور امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں ٹوٹا۔ وہ اپنی سستی کی وجہ سے  
 اس وقت امام شافعیؒ کی تقلید کر کے بلا وضو نماز پڑھ لے گا۔ پھر اگر اس نے کسی عورت  
 کو چھو لیا تو امام شافعیؒ کے نزدیک اس کا وضو جا تا رہا، لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک برقرار  
 ہے۔ اب اس کی تن آسانی اس کو ابو حنیفہؒ کی تقلید پر ڈالے گی۔ غرض جس امام کے قول میں  
 اسے فائدہ اور آرام نظر آئے گا اسے لے لے گا۔ اور جہاں کسی کے قول میں نقصان یا فتنہ  
 نفس کی قربانی دکھائی دے اسے چھوڑ دے گا جس سے احکام شرعیہ نفسانی خواہشات  
 کے ماتحتوں میں کھلنا بن کر رہ جائیں گے۔ یہ چیز بلا اختلاف حرام ہے۔ اسی چیز کی خرابیوں  
 کو واضح کرتے ہوئے امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں۔

امام احمد وغیرہ نے تصریح فرمائی ہے کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ محض  
 اپنی خواہشات نفس کے زیر اثر ایک چیز کو پہلے حرام یا واجب سمجھے اور پھر اسی کو جائز یا  
 حرام قرار دے دے۔ مثلاً وہ خود کسی کا پڑوسی ہو اور شفعہ کا دعویٰ کرنا چاہتا ہو تو امام  
 ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق، یہ مذہب اختیار کر لے کہ شفعہ کا حق پڑوسی کو ہوتا ہے  
 پھر جب کوئی دوسرا شخص پڑوس کی وجہ سے اس پر شفعہ کا دعویٰ کرے تو امام شافعیؒ

کے مذہب کے مطابق یہ قول اختیار کر لے کہ شفعہ کا حق پڑوسی کو نہیں ہے یا مثلاً ایک شخص کسی مرنے والے کا بھائی ہو اور میت کا دادا بھی موجود ہو تو یہ مذہب اختیار کر لے کہ بھائی میراث میں دادا کے شریک ہوتے ہیں اور جب خود دادا بنے اور اس کا پوتا اپنے بھائی چھوڑ کر مر جائے تو یہ مذہب اختیار کر لے کہ دادا کی موجودگی میں بھائی وارث نہیں ہوں گے۔

صحابہؓ اور تابعینؓ کے زمانے میں چونکہ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کا غلبہ تھا اس لئے اس وقت تقلیدِ مطلق میں کوئی برائی نہیں سمجھی گئی۔ اب چونکہ دیانت ختم اور نفسانیت کا غلبہ ہے اس لئے علماء نے انتظامی مصلحت کی بنا پر یہ فتویٰ دیا کہ اب صرف تقلیدِ شخصی جائز ہے اور آزاد تقلید (یعنی تقلیدِ مطلق) کا طریقہ ترک کر دینا چاہیے اگر ہر شخص کو اختیار ہو کہ جس مسئلہ میں چاہے جس مجتہد کی تقلید کر لے تو مذکورہ بالا مثالوں کی طرح ایسے اقوال کا ایک مجموعہ تیار ہو جائے گا جو کہ شیطان اور نفس کا مذہب ہوگا دین کا خواہشات کے تابع ہونا کسی کے ہاں جائز نہیں ہے بلکہ فقہائے کرام تو اتنے محتاط تھے کہ وہ اپنے امام کے غیر مشورہ اقوال پر بھی فتویٰ نہیں دیتے تھے کہ لوگوں میں تقویٰ کی کمی ہے اور مختلف مذاہب سے آسانیاں تلاش کر کے ان پر عمل کی خواہش رکھتے ہیں۔ علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں۔

اور تمام شہروں میں تقلید ان ائمہ اربعہ میں محصور ہو گئی۔ دوسرے ائمہ کے مقلدین ختم ہو گئے اور لوگوں نے ان ائمہ سے اختلاف کا دروازہ بند کر دیا جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ علوم کی اصطلاحات پیچیدہ ہو کر پھیل گئی تھیں۔ اور اس کی وجہ سے اجتہاد کے مرتبے تک پہنچنا سخت مشکل ہو گیا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ اجتہادِ اہلوں کے قبضہ میں نہ چلا جائے اور ایسے لوگ اسے استعمال نہ کرنے لگیں جن کی راستے اور دین پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا علماء نے اجتہاد سے عاجز کا اعلان کر دیا اور لوگوں کو ان ائمہ اربعہ کی تقلید شخصی کی طرف لوٹا دیا اور اس بات

کو ممنوع کر دیا کہ ان ائمہ کی بدل بدل کر تقلید کی جائے، کیونکہ یہ طریقہ دین کے کھلونا بن جانے کا سبب ہو جاتا۔

اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

”بلاشبہ یہ چار مذاہب جو مدون ہو کر تحریری شکل میں موجود ہیں، ان کی تقلید کے جائز ہونے کا تمام امت کا اجماع ہے اور اس میں جو مصلحتیں ہیں وہ پوشیدہ نہیں بالخصوص اس زمانے میں جب کہ ہمتیں پست ہو چکی ہیں، خواہش پرستی لوگوں کی گٹھی میں پڑ گئی ہے اور ہر ایک صاحب راستے اپنی راستے پر گھنٹہ کرنے لگا ہے۔“

**تقلید شخصی کی ایک بڑی مثال**

غنیؒ نے باجماع صحابہؓ قرآن کے سات لغات یا سات حروف میں سے صرف ایک حرف کو مخصوص کیا، اگرچہ ساتوں حروف قرآن ہی کے تھے اور جبریل امین کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق نازل ہوئے مگر جب قرآن مجید عجم میں پھیلا اور مختلف لغات میں پڑھنے سے تحریف قرآن کا خطرہ محسوس کیا گیا تو باجماع صحابہؓ مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا کہ صرف ایک ہی لغت یا حرف میں قرآن لکھا اور پڑھا جائے۔ انہوں نے اسی ایک حرف کے مطابق بہت سے نسخے لکھوا کر اطراف عالم میں بھجوائے اور آج تک پوری امت اسی کی پابند ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی دوسرے حروف حق نہیں تھے بلکہ انتظام دین اور حفاظت قرآن کی خاطر ایک لغت کو اختیار کیا گیا۔ اسی طرح ائمہ مجتہدین سب حق ہیں، اور تقلید شخصی بدعت نہیں کیونکہ عثمانؓ کا واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر امت کو کسی معاملہ میں کئی امور کا اختیار

۱۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷ مطبوعہ مکتبہ تجاریہ کبریٰ مصر کتاب بسلر باب ۲ فصل ۲۔

۲۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۴ باب حکایہ اہل الناس قبل المائۃ الرابۃ ولعبدہ۔

۳۔ اس مسئلہ کی پوری تحقیق حضرت مولانا تقی عثمانی مدظلہ کی کتاب علوم القرآن میں ملے گی۔

۴۔ تفسیر معارف القرآن ص ۳۳۵ ج ۵ مع تفسیر لیسیر۔

ملا ہو تو زمانے کے فساد کے پیش نظر ان میں سے کسی ایک طریقے کو اختیار کر کے باقی طریقوں کو چھوڑ سکتی ہے اور تقلید شخصی کے معاملہ میں اس سے کچھ زیادہ نہیں ہوا۔

اب سوال یہ کہ مجتہدین تو بہت سے گزرے ہیں | **ائمہ اربعہ کی خصوصیت** مثلاً سفیان ثوری، امام اوزاعی، عبد اللہ بن مبارک،

اسحاق بن راہویہ، امام بخاری، ابن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ، حسن بن صالح وغیرہ وغیرہ پھر ان چار اماموں کی کیا خصوصیت ہے، کسی بھی مجتہد کو تقلید کے لئے مقرر کر سکتے ہیں بات دراصل یہ ہے کہ ان حضرات کی تقلید نہ کرنے کی وجہ ایک مجبوری ہے

اور وہ یہ کہ ان کے مذاہب مدقون شکل میں محفوظ نہ رہ سکے۔ اگر ان حضرات کے مذاہب بھی ائمہ اربعہ کے مذاہب کی طرح مدقون و مرتب ہوتے تو بلاشبہ ان میں سے کسی ایک کو تقلید کے لئے اختیار کیا جاسکتا تھا۔ لیکن نہ تو ان حضرات کے مذاہب کی مفصل کتابیں مدقون ہیں نہ ان کے مذاہب کے علماء پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کی تقلید ناممکن بن گئی ہے۔ اگرچہ صحیح اعتقاد یہی ہے کہ یہ سب حضرات ائمہ ہدایت پر ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر طویل بحثیں کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) شریعت کو سمجھنے کے لئے اسلاف پر اعتماد کئے بغیر چارہ نہیں، لیکن سلف کے اقوال پر اعتماد اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب کہ وہ صحیح اور مشہور کتابوں میں مدقون ہوں یا صحیح سند کے ساتھ ہم تک پہنچے ہوں۔ نیز بعد کے علماء نے ان کی تشریح و توضیح کی خدمت کی ہو، اگر ان اقوال میں کئی معانی کا احتمال ہو تو ان پر بحث کر کے راجح معنی کو معین و مقرر کیا گیا ہو، بعض مرتبہ کسی فقیہ کا قول بظاہر عام ہوتا ہے لیکن اس سے کوئی خاص صورت مراد ہوتی ہے اسی لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس مذہب کے علماء نے ایسی صورتوں کو واضح کر دیا ہو اور اس کے احکام کی علتیں بھی بتادی ہوں جب تک کسی مجتہد کے مذہب کے بارے میں ایسا کام نہ ہوا ہو اس پر اہتمام و کراہت درست نہیں اور یہ صفات ہمارے زمانے میں مذاہب اربعہ کے سوا کسی مذہب

میں نہیں پائی جاتیں۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اَتَّبِعُوا السَّوَادَ لَا عَظَمَ۔ یعنی سوادِ اعظم (علماء کی جماعت کثیر کی پیروی کرو)

جب ان چار مذاہب کے سوا دوسرے برحق مذہب نالود ہو گئے تو اب انہی چار مذاہب کا اتباع سوادِ اعظم ہے۔

(۳) اگر مذاہب اربعہ سے باہر بھی کسی مجتہد کے قول پر فتویٰ دینے کی اجازت ہو جائے تو خواہشات نفس سے مغلوب علماء شواہد اپنے کسی بھی فتویٰ کو سلف کے کسی مشہور عالم کی طرف منسوب کر دیں گے کہ یہ بات فلاں امام کے فلاں قول سے ثابت ہے جس امام کے اقوال کی تشریح میں علماء حق کی ایک کثیر تعداد مصروف رہتی ہے اس کے مذہب پر عمل کرنے میں تو خطرہ نہیں لیکن جہاں یہ بات نہ ہو بلکہ کسی مجتہد کے اکادکا اقوال ملتے ہو یا وہاں گمراہی کا سخت اندیشہ ہے دیکھو کہ لوگ اس مجتہد کی بات کو غلط معنی پہنا کر اس سے من مانے نتائج نکال لیں گے۔

**ایک عجیب اعتراض کا مدلل جواب** | بعض حضرات نے اس بات پر کہ تقلید

ہے پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ”پاکستان میں اکثریت حضرات احناف کی ہے اور جتنے رقص و سرود کے کلب موجود ہیں ان کے منتظم خفی حضرات ہیں اگر تقلید شخصی ہو اور شیوا کا علاج ہے تو آج ہو اور پرنیو کے یہ عمل جا بجا کیوں موجود ہیں؟“

اس کے جواب میں ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی کسلی نافرمانی کا عزم کر لیا ہے اور گناہ کو گناہ سمجھنے کے باوجود خواہش پرستی کی وجہ سے اس کا مرتکب ہو رہا ہے اس کا علاج نہ تقلید میں ہے اور نہ ترک تقلید میں۔ یہاں یہ خواہش پرستی زیر بحث نہیں بلکہ یہاں گفتگو اس سنگین خواہش پرستی کی ہو رہی ہے جس نے آج سودا شراب، قمار بے پردگی اور دنیا پر

کے منکرات کو شرعی طور پر قرآن و سنت سے حلال ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا ہے۔ آج پورا عالم اسلام اس تہجد اور اباحت پسندی کی لپیٹ میں ہے جس نے اجتہاد اور آزادی فکر کے نام پر دین کو ختم کرنے کی قسم کھاتی ہوتی ہے۔ یہ لوگ قرآن و حدیث کے حوالوں سے مضامین لکھتے ہیں، اور حرام و ناجائز کو حلال اور جائز ثابت کرنے کے لئے علمی ادارے قائم کر رکھے ہیں، یہ سب حضرات تقلید شخصی کو حرام قرار دے کر ہی آگے بڑھے ہیں۔ ان کا پہلا ادارہ اس تقلید پر ہوا ہے جس نے اس قسم کے اجتہادات کا راستہ روک رکھا تھا اور ان کو سب سے زیادہ مدد داسی پروپیگنڈے سے ملی ہے کہ ائمہ کی تقلید حرام اور شرک ہے اور اسلام نے تقلید کی بجائے آزادی فکر کا درس دیا ہے ان صاحبوں نے ہمارے ان اسلاف کی دور بین نگاہوں کی پوری پوری تصدیق کر دی ہے جنہوں نے نفس پرستی کے سد باب کے لئے تقلید شخصی کو لازم کیا تھا۔ جب تک عالم اسلام میں تقلید شخصی کا رواج تھا اس وقت تک دین کے قطعی احکام اور مسلم مسائل کبھی ملحدین کی تحریف کا نشانہ نہیں بنے تھے لیکن جب سے یہ پروپیگنڈہ شروع ہوا ہے کہ تقلید حرام و شرک ہے تو اجتہاد کے نام سے ہر شخص نے قرآن سنت پر مشق ستم شروع کی ہے اور اس پروپیگنڈے کے بعد سے لے کر آج تک جتنے گمراہ اور ملحد فرقے سامنے آئے ہیں، ان میں سے اکثر نے اپنی مشق کا آغاز اس خود رانی اور ترک تقلید سے کیا ہے جتنی کہ یہ بات غیر مقلد علماء کو بھی محسوس ہوتی ہے، چنانچہ مشہور غیر مقلد عالم جناب مولانا قاضی عبدالواحد صاحب خانپوریؒ اس خود رانی پر غصہ ہو کر تحریر کرتے ہیں: پس اس زمانے کے جھوٹے اہل حدیث تبذیرین مخالف سلف صالحین جو حقیقت ماہا۔ الرسول سے جاہل ہیں وہ صفت میں وارث اور علیحدہ ہوئے ہیں۔ شیعہ و روافض کے یعنی جس طرح شیعہ پہلے زمانوں میں باب و دہلیز کفر و نفاق کے تھے اور مدخل (دروازہ) ملاحدہ اور زنادقہ کے تھے اسلام کی طرف اسی طرح یہ جاہل بدعتی اہل حدیث اس زمانے میں باب اور دہلیز اور مدخل ہیں، ملاحدہ اور زنادقہ منافقین کے مثل اہل تشیع کے الی ان قال، مقصود یہ کہ رافضیوں میں ملاحدہ تشیع ظاہر کر کے حضرت

علی اور حسنین رضی اللہ عنہم کو ظلو کے ساتھ تعریف کر کے، سلف کو ظالم کہہ کر کالی دے دیں اور پھر جس قدر الحاد و زندقہ پھیلاتیں کچھ پرواہ نہیں، اسی طرح ان جہال بدعتی کا ذب اہل حدیثوں میں ایک دفعہ رفع یدین کرے، تقلید کا رد کرے اور سلف کی ہمتک کرے مثلاً امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کی جن کی امامت فی الفقہ اجماع امت سے ثابت ہے، اور پھر جس قدر کفر اعتقادی اور الحاد اور زندقیت ان میں پھیلا دے بڑی غوثی سے قبول کرتے ہیں، اور ایک ذرہ چین چین بھی نہیں ہوتے، اگرچہ علماء اور فقہاء اہل سنت ہزار دفعہ ان کو متنبہ کریں ہرگز نہیں سنتے۔ سبحان اللہ تعالیٰ ما شبہ اللیلۃ بالبارحۃ اور سر (راز) اس کا یہ کہ وہ مذہب و عقائد اہل سنت والجماعت سے نکل کر اتباع سلف سے مستنکف (یعنی سلف کو حقیر سمجھ کر ان کی اتباع سے روگردانی کرنے والے) و متکبر ہو گئے ہیں۔ فافہم و تدبیر الی ان قال: پھر ملاحدہ مرزائیہ قادیانیہ نکلے تو انہوں نے بھی انہی کے باب اور دہلیز اور مدخل سے داخل ہونا اختیار کیا۔ اور جماعات کثیرہ کو ایمان سے مرتد اور منافق بنایا، اور جب زنادقہ چکڑ الویہ نکلے تو بھی انہی کے دہلیز و دروازہ سے داخل ہوئے اور ایک خلق کو اُن سے مرتد بنایا اور جب یہ .... خاتمہ الخلدین نکلا تو بھی انہی جہال المحدث کے باب اور دہلیز سے داخل ہو کر کیا جو کچھ کیا یعنی پہلے اس نے سید متین اور حسن حصین اسلام کہ اجماع امت مرحومہ اور اتباع سلف صالحین سبے کہ خیر القرون ہیں اس کو توڑا، پھر اسلام میں کفر و نفاق کو داخل کیا اور تحریف کلام الہی و قرآن مجید کی، مذاہب ملاحدہ زنادقہ کی طرح ایسی کی کر سیو دیوں سے بھی بڑھ گیا اور الحاد و جہمیہ اور تحریف اور کفریات فلاسفہ دہریہ کو اسلام میں بذریعہ مکروہ فریب اور تحریف کے داخل کیا الباقی بلفظ کتاب التوحید و السنۃ فی رد اہل الحاد و البدعتہ ص ۱۲۶۲، ۱۲۶۳

اسی طرح مشہور غیر مقلد عالم مولانا محمد حسین بنالوئی اپنے پچیس سالہ تجربے کے بعد فرماتے ہیں کہ پچیس برس کے تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق (ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں)، اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں، کفر و ارتداد کے اسباب اور بھی بکثرت موجود ہیں، مگر

دینداروں کے بے دین ہو جانے کے لئے بے علمی کے ساتھ ترکِ تقلید بڑا بھاری سبب ہے۔ گروہِ اہلحدیث میں جو بے علم یا کم علم ہو کر ترکِ مطلقِ تقلید کے مدعی ہیں وہ ان نتائج سے ڈریں۔ اس گروہ کے عوام آزاد اور خود مختار ہو جاتے ہیں (اشاعت السنۃ جلد اول، تقلید کے درجات) تقلید کی حقیقت اور تقلیدِ شخصی کا ضروری ہونا تو ثابت ہو چکا۔ اب ایک ضروری بات یہ ہے کہ فقہاء نے تقلید کرنے والوں کے کچھ درجات کی تشریح کی ہے۔

(۱) پہلا درجہ عوام کی تقلید کا ہے، عربی زبان نہ جاننے والے، اسلامی علوم سے بالکل ناواقف، خواہ دوسرے علوم و فنون میں بہت ماہر اور تعلیم یافتہ ہوں۔  
(۲) ایسے لوگ جو عربی جانتے ہوں اور عربی کتابیں پڑھ سکتے ہوں لیکن تفسیرِ حدیث و فقہ وغیرہ علوم باقاعدہ اساتذہ سے نہ پڑھے ہوں۔

(۳) ایسے حضرات جو رسمی طور پر اسلامی علوم سے فارغ التحصیل ہوں لیکن علومِ دین کے اصولوں میں اچھی استعداد اور بصیرت سے عاری ہوں۔

یہ سب لوگ عوام میں داخل ہیں، اس قسم کے لوگوں کے لئے تقلیدِ محض کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ براہِ راست کتاب و سنت کو نہیں سمجھتے اور نہ احکام کے دلائل میں تطبیق و ترجیح کا فیصلہ کر سکتے ہیں تو وہ کسی امام کا دامن ضرور پکڑیں گے۔

اب دوسرا درجہ متبحر عالم کی تقلید کا ہے۔ ایسا آدمی جو کہ درجہ اجتہاد تک نہ پہنچا ہو اگرچہ اسلامی علوم کو ماہر اساتذہ سے حاصل کر کے عرضہ دراز تک ان کی درس و تدریس اور تصنیف کی خدمت میں فقہاء کے زیرِ نگرانی مشغول رہا ہو، اس قسم کا عالم مذہب کے دلائل سے بھی واقف ہوتا ہے اور بحیثیتِ مشقی اپنے مذہب کے مختلف اقوال میں سے اپنے زمانے اور عرف کے مطابق کسی ایک قول کو اختیار کرنے یا مذہب کی تشریح کرنے کا اہل ہوتا ہے۔

(۴) تیسرا درجہ مجتہد فی المذہب کی تقلید ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو استدلال اور استنباط کے بنیادی اصولوں میں کسی مجتہدِ مطلق کے پیرو ہوتے ہیں۔ لیکن جزوی

مسائل کو براہ راست قرآن و سنت اور آثارِ صحابہؓ سے اخذ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں ایسے حضرات اپنے امام سے فروعی احکام میں اختلاف رکھ سکتے ہیں لیکن اصولاً وہ مقلد ہی ہوتے ہیں، مثلاً فقہ حنفی میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ، فقہ شافعی میں امام مزنیؒ اور امام ابو ثورؒ، فقہ مالکی میں ابن القاسمؒ اور فقہ حنبلی میں ابراہیم الحارثیؒ وغیرہ۔

(د) آخری درجہ مجتہد مطلق کا ہے۔ وہ شخص جس میں تمام شرائط اجتہاد پائی جاتی ہوں وہ اپنے علم و فہم کے ذریعے اصول استدلال بھی خود قرآن و سنت سے اخذ کرنے پر قادر ہو اور ان اصول کے تحت تمام احکام شریعت کو قرآن کریم سے مستنبط بھی کر سکتا ہو جیسے امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ وغیرہ۔ یہ حضرات اگرچہ اصول و فروع دونوں میں مجتہد ہوتے ہیں لیکن ایک طرح کی تقلید ان کو بھی کرنی پڑتی ہے جس مسائل میں قرآن و سنت میں کوئی تصریح نہیں ہوتی وہاں یہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ قیاس اور خالصۃً اپنی رائے کی بجائے صحابہؓ یا تابعینؒ کے کسی قول کی تقلید کریں۔

بہر کیف جس طرح عام آدمی اپنے ملک کا قانون براہ راست نہیں سمجھ سکتا اور کسی ماہر قانون کا مشورہ لیتا ہے اسی طرح عام لوگوں کو اپنے امام کی تقلید ضروری اگرچہ وہ بظاہر کہیں کسی حدیث کو فقہ سے متعارض پائیں کیونکہ وہ احادیث کی تطبیق کو نہیں سمجھتے

**تقلید جامد کی مذمت** | ایک ضروری بات یہ ہے کہ شریعت کے احکام میں خود درائی اور تقلید کی مخالفت قبیح ہے اسی طرح تقلید میں جمود اور مبالغہ بھی بُرا ہے اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً ائمہ مجتہدین کو رد و انکار، شائع یا انبیاء علیہم السلام کی طرح محضوم سمجھنا۔

لے بعض علماء کے نزدیک امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ و امام زفر رحمہم اللہ تعالیٰ اجتہاد مطلق کے منصب پر فائز ہیں، انہوں نے اصول میں بھی اپنے استاد سے اختلاف کیا، چونکہ قواعد اور اصول بہ نسبت فروع و جزئیات کے قلیل ہیں، اس لئے اصول میں اختلاف اتنا نمایاں نہ ہو سکا جتنا کہ فروع میں ہوا تقریباً ان حضرات کا اختلاف حضرت امامؒ سے ایسا ہے جیسا کہ خود امامؒ کا اختلاف اپنے استاد حضرت حمادؒ یا اس کا استاد حضرت ابراہیم نخعیؒ سے ہے جیسا کہ بعض اہل تحقیق نے ذکر کیا۔

(۲) کسی صحیح حدیث پر صرف اس لئے عمل نہ کرنا کہ اس بارے میں ہمارے امام سے کوئی حکم ثابت نہیں۔

(۳) کسی معتبر عالم کو یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ امام کا قول صحیح حدیث کے خلاف ہے اور حدیث کے مقابل کوئی دلیل نہیں، پھر بھی حدیث کو قابل عمل نہ سمجھنا یہ بھی تقلید جامدہ میں شامل ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ امام کا قول حدیث کے خلاف ہے اور اس پر اس سے بڑھ کر قوی دلیل موجود نہیں بڑا دشوار امر ہے اور یہی منزلۃ الاقدام میں سے ہے خصوصاً آج کل جب کہ نفسانی خواہشات کا زور ہے اور اکثر لوگ دین سے متعلق چند اردو کے رسالے پڑھ کر یا زیادہ سے زیادہ قرآن و حدیث کے چھپے ہوئے ترجمے دیکھ کر اپنے آپ کو اس بات کا حق دار سمجھنے لگ گئے اور مساتل میں مجتہدانہ انداز میں رائے زنی کر کے اس صحیح حدیث کے مصداق بن گئے ہیں کہ "صلو واخلو" وہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے علماء کو اہم کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس کے لئے بھی چند معقول شرائط مقرر کی ہیں تاکہ دین نفس پرستوں کے ہاتھوں بھلونا بن کر نہ رہ جائے وہ شرائط یہ ہیں،

(۱) وہ عالم ایسا شخص ہو جو اگرچہ رتبہ اجتہاد تک نہیں پہنچا ہو لیکن اسلامی علوم کو باقاعدہ ماہر اساتذہ سے حاصل کرنے کے بعد علوم کی تدریس و تصنیف کی خدمت میں اکابر علماء کی زیر نگرانی عرصہ دراز تک مشغول رہا ہو، تفسیر، حدیث، فقہ ان کے اصول سے مستحضر ہوں اور کسی کی تحقیق میں اسلاف کے افادات سے بخوبی فائدہ اٹھا سکتا ہو اور ان کے طرز تصنیف و استدلال سے مزاج شناس ہونے کی بناء پر ان کی صحیح مراد تک

لے مثلاً تشہد میں اشہدان لا الہ الا اللہ کہتے ہیں شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنا بہت سی احادیث سے ثابت ہے لیکن بعض لوگوں نے اس سنت سے محض اس بناء پر انکار کر دیا کہ امام ابو حنیفہؒ سے اس کے بارے میں کوئی قول منقول نہیں یہ بعض لوگوں کے زعم کے مطابق لکھا گیا اور نہ اس مسئلے میں امام اعظم کا قول موجود ہے دیکھئے (رفع التردد فی عقد الصالح عند التشہد للعلما مبراہین عابدین رحمۃ اللہ)

پہنچ سکتا ہو۔

(ب) جس حدیث کی بناء پر وہ امام کا قول ترک کر رہا ہو اس کے بارے میں یہ اطمینان ہو کہ وہ علماء حدیث کے نزدیک صحیح ہے۔ کیونکہ بعض اوقات کسی حدیث کی تصحیح میں مجتہدین کا اختلاف ہوتا ہے جو حضرات اسے صحیح سمجھتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں اور جو حضرات اسے ضعیف سمجھتے ہیں اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر مجتہد نے اس حدیث کو چھوڑا تو ضعیف قرار دے کر چھوڑا ہے۔

(ج) اس حدیث کے معارض کوئی آیت قرآنی یا کوئی دوسری حدیث موجود نہ ہو۔  
(د) اس حدیث کا مطلب بالکل صاف اور واضح ہو اور اس کا کوئی دوسرا اطمینان بخش مطلب نہ نکل سکتا ہو کیونکہ بسا اوقات ایک حدیث میں کئی معنی کا احتمال ہوتا ہے۔ مجتہد اپنی بصیرت اجتہاد سے اس کے ایک معنی کو متعین کر دیتا ہے اور اس کے مذہب کو حدیث کے مخالف نہیں کہا جاسکتا۔  
(ه) پانچویں بات یہ بھی ضروری ہے کہ اس طرح حدیث کی بناء پر جو قول اختیار کیا جائے وہ ائمہ اربعہ کے اجماع کے خلاف نہ ہو۔

(۴) واضح احادیث کو توڑ مروڑ کر اپنے مذہب کے مطابق بنانے کے لئے ایسی عجیب و غریب تاویلات کرنا جس پر اپنے دل میں بھی شک شبہ ہو۔

(۵) یہ سمجھنا کہ صرف میرے امام کا مسلک حق ہے اور دوسرے مذاہب نعوذ باللہ باطل ہیں یہ بھی تقلید جامد یا تقلید میں غلو ہے۔

(۶) بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں ائمہ کے درمیان صرف افضل اور غیر افضل کا اختلاف ہے، حلال و حرام کا اختلاف نہیں مثلاً آمین آہستہ کی جائز یا زور سے رکوع کے وقت ہاتھ اٹھانے جائیں یا نہیں، ہاتھ سینے پر باندھے جائیں یا ناف پر لے لیا عالم مذہب کے مختلف اقوال میں سے اپنے زمانے عرف کے مطابق ایک قول کو اختیار کرے یا مذہب کی تشریح کرنے کا اہل ہوتا ہے نیز جن مسائل کی تصریح کتب مذہب میں نہیں ہے ان کا جواب مذہب کے اصول و قواعد سے نکالنے کا بوز بھی اس کو حاصل ہے۔

یہ سب طریقے جائز ہیں اختلاف محض افضلیت میں ہے، ان اختلافات کو طلالِ حرام کی حد تک پہنچا کر امت میں انتشار پیدا کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

۲، جہاں ائمہ میں جائز و ناجائز کا اختلاف ہے وہاں بھی اختلاف کو علمی حدود کی حد تک رکھنا ضروری ہے اسے جنگ و جدل کا ذریعہ بنانا، ایک دوسرے کے خلاف بدزبانی، عیب جوئی اور بدگمانی کسی امام کے مذہب میں جائز نہیں۔

**مفتدین کی خدمت میں گزارش** مسئلہ تقلید پر جو کچھ نقل کیا گیا اس کا مقصد صرف امت مسلمہ کی اکثریت کا

نقطہ نظر واضح کرنا تھا، بعض حضرات جب توحید و شرک پر کوئی کتاب لکھنے بیٹھتے ہیں تو بعض فروعی مسائل جیسے توسل اور تقلید ائمہ متبوعین وغیرہ میں اختلاف کو کفر اور اسلام کا اختلاف بنا کر اچھے خاصے مسلمانوں کو کفار اور مشرکین کی صف میں لاکھڑا کر دیتے ہیں، بہر حال اگر کسی کو اس نقطہ نظر سے اختلاف ہو تو وہ اپنے موقف پر قائم رہے لیکن ائمہ مجتہدین پر شریعت سازی یا مقلدین پر کفر و شرک کے الزامات عائد کرنا نہایت ہی خطرناک طرز عمل ہے جس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ مسلمانوں کی شان و شوکت اور محبت و عظمت کو ہمیشہ آپس کی خانہ جنگی نے تباہ کیا ہے اور فروعی مسائل پر لڑائیوں سے ہمیشہ اسلام دشمن لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے، مفتدین و غیر مقلدین کے لئے مشہور اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خاں کی یہ تحریر مشعلِ راہ ہے۔

ایک منت خدا کی مجھ پر یہ ہے کہ میں فقط جماعتِ اہل سنت کو فرقہ ناجبر جانتا ہوں، حنفی ہوں یا شافعی، مالکی ہوں یا حنبلی، یا ظاہری یا اہلحدیث، یا اہل سلوک اور سنی کے حق میں، ان میں سے گمان بد نہیں رکھتا، اگرچہ مجھ کو یہ بات معلوم ہے کہ ہر گروہ کے اندر ان میں سے کچھ مسائل خلافِ دلائل بھی ہیں اور بعض موافقِ نصوص، بعض فتاویٰ ان کے صحیح اور بعض ضعیف یا مردود ہیں، اس لئے حکم اکثر کو ہے نہ اقل کو، اور ائمہ سلف سے جو عمل بعض احادیث میں متروک ہو گیا ہے اس کے بغیر عذر میں جو کتاب جالب المنفعة میں لکھے گئے ہیں، ائمہ سلف پر طعن مخالفت سنت کا کرنا انصاف کا خون بہانا ہے

۱۲ احادیث کے اخذ و رکبے بارے میں شیخ الاسلام ابن قیمیہ کا رسالہ دفع الملام بھی قابلِ دید ہے ۱۲

ہاں جو مقلد ان کے بعد وضوح دلیل کتاب وسنت کے تقلید راستے بحث پر جامد  
ہیں ان کو غلطی سمجھتا ہوں لیکن گمراہ بحث نہیں جانتا، نہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے  
سے انکار کرتا ہوں نہ معاذ اللہ ان کو کافر کہوں۔

مسائل و عبادات و معاملات میں اختلاف اہل علم مکفر نہیں ہوتا ہے فایۃ  
ما فی الباب یہ ہے کہ خطا فی الاجتهاد یا خطا فی الفہم ہوتی ہے جس کو علماء پہچانتے  
ہیں۔ اللہ سے امید کرتا ہوں کہ اگر قائل و فاعل اس خطا کا اپنے قصد میں شخص  
غیر متعصب تھا اور کسی وجہ قوی سے شبہ میں گرفتار ہو گیا تو وہ خطا اس کی معاف  
ہو جاوے۔ اور اگر جمہور اس خطا پر عمداً براہ اتفاق و شقاق خدا اور رسول کے سے تو  
محل نہایت کا اندیشہ ہے لیکن کسی مسلمان راجی و مخالف کی نسبت ایسی بدگمانی کرنا کچھ  
ضروری نہیں ہے۔ سخن حکم بالظواہر واللہ اعلم بالسراہر۔

# باب ششم

## مشرک کی مذمت

## شُرک کی مذمت

انسان فطری طور پر فقیر و محتاج ہے اور زندگی کی ہر شکل میں فطرۃً ایک اللہ کی طرف مائل اور متوجہ ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے نفع و نقصان پر اسباب و عوامل کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ اس لئے انسان اسباب و اشیاء کو نفع و ضرر کا مالک حقیقی سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب اس کی توجہ اور میلان مخلوق کی طرف مکمل اور تمام جاتا ہے تو اسی کو اپنا رب مان لیتا ہے۔ اس کو مستقل طور پر نافع اور ضرر رساں سمجھ کر اپنی حاجات پوری کرنے کے لئے اس مخلوق سے مدد طلب کرتا ہے اور یہی چیز اس کو غیر اللہ کے آگے سجدہ ریز کر دیتی ہے۔ پھر غیر اللہ سے محبت اور غیر اللہ کی عبادت اس کی زندگی کا مقصد بن جاتی ہے۔

اگرچہ ایسا انسان بعض اوقات زبان سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت کا اعتراف کرتا ہے لیکن اس کا دل کبھی ایک اللہ کے ذکر اس کی حمد و ثناء اسے مالک اور متصرف ماننے سے خوش نہیں ہوتا۔ جب تک کہ اس کے ساتھ دوسرے جھوٹے معبودوں کے مالک اور متصرف ہونے کا ذکر نہ کیا جاتے۔ جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ مشرکین کی یہ حالت بیان کرتے ہیں۔

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ  
وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ (زمرا آیت ۲۵)

جب صرف ایک اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے رکوع بلا شُرکتِ غیرے تمام کائنات کا مخیر مالک اور متصرف ہے تو ان لوگوں کے دل متعجب ہو جاتے ہیں اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر

کیا جاتا ہے تب وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں۔

مشرکین کی ایک عام صفت | الغرض مشرکین کے سب گروہوں میں یہ بات مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے کہ مخلوق میں سے

جس شے کی بھی پرستش یا اطاعت کرتے ہیں دراصل اس چیز کو نفع و نقصان پہنچانے والی خیال کر کے ہی اس کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ عمل ایک عظیم جرم ہی نہیں بلکہ خالق کائنات کے خلاف بغاوت بھی ہے۔ اللہ کی فرماں روائی اور اس کے ملک میں کسی کو شریک کرنا، اس کی بادشاہی میں کسی کو مستقل طور پر متصرف ماننا، درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کو احکم الحاکمین اور رب العالمین نہ ماننے کے برابر ہے۔ دنیا کے مجازی حکمران سخت سے سخت جرم کو معاف کر دیتے ہیں لیکن باغیوں کے ساتھ نرمی نہیں کرتے جب ان عارضی حکام کی حکومت سے انکار کرنا اتنا بڑا جرم ہے تو پھر خالق کائنات اور مالکِ حقیقی کے باغیوں کا انجام کیا ہوگا؟ سوچ اور عبرت کا مقام ہے کیونکہ کفر و شرک کی حالت میں مرنے والے ہرگز نہیں بخشے جائیں گے۔ ان کی سزا دائمی ہوگی۔ البتہ کفر و شرک کے سوا دوسرے گناہ چھوٹے ہوں یا بڑے، سب قابلِ معافی ہیں اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے کچھ عذاب دے کر یا بلا عذاب اس کے سارے گناہ بخش دے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس (جرمِ عظیم) کو شریک بٹھرایا جاتے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے اس کے سوا (جرمِ چاہے جتنے ہوں) اور جس نے شریک بٹھرایا کسی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ  
وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ  
وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا  
بُعِيدًا (النساء آیت ۱۱۶)

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے۔

کیا گمان کرتے ہیں کفار کہ وہ بنالیں گے میرے بندوں کو میرے سوا کارساز بے شک ہم نے جہنم کو کفار کی ممانی کے لئے تیار کر رکھا ہے۔

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ يَتَّخِذُوا  
عِبَادِي مِنْ دُونِي أَوْلِيَاءَ إِنَّا أَعْتَدْنَا  
جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا (سورة الکہف آیت ۱۳)

جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی مخلوق کے سامنے جھکتا ہے اللہ جل شانہ کی بے نیاز ذات کی طرف سے اس پر حقیقی نصرت و برکت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں

اور یہ شخص کل قیامت کے دن بے کسی، شرمندگی اور رسوائی کی حالت میں ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَوْ تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ  
مَذْمُومًا مَفْحُودًا (بنی اسرائیل آیت ۲۲)  
دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

فَتَلْقَىٰ فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا مَذْمُورًا۔  
(بنی اسرائیل رکوع نمبر ۱۶)

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنی قوم اور عوام الناس کو کتنی نصیحتیں کی ہوں گی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے صرف ان اقوال کو بیان فرمایا ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کو فرماتے، کیونکہ باپ اپنے بیٹے کو جو نصیحت کرتا ہے وہ سراسر سچائی اور خلوص ہوتی ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يُعِظُهُ  
يَبْنِيُّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ  
لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (سورہ لقمان آیت ۱۳)

اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا اے میرے (چھوٹے) بیٹے کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرا، شرک بہت بھاری نا انصافی ہے۔ اس سے بڑھ کر نا انصافی کیا ہوگی کہ عاجز مخلوق کو خالق مختار کا درجہ دیا جائے اور اپنی جان پر اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہوگا کہ اشرف المخلوقات ہو کر عاجز مخلوق کے سامنے سر بسجود ہو جائے۔

جب انصاری نے پولس کی تعلیمات کے زیر اثر عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور خیر قرار دیا تو قرآن مجید میں ان کے عقیدہ کی تردید یوں نازل ہوئی۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ  
ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيحُ لِبَنِيِّ إِسْرَءِيلَ  
اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ إِنَّهُ مَن  
يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ

بے شک کافر ہوئے جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ تو مسیح ابن مریم ہے حالانکہ مسیح نے خود یہ کہا کہ اے بنی اسرائیل بندگی کرو تم اللہ کی جو میرا اور تمہارا رب ہے بے شک جس نے شرک ٹھہرا اللہ کے ساتھ، حرام کی اس

الْجَنَّةَ وَمَا أَوْفَى النَّارَ وَمَا لِلظَّالِمِينَ  
مِنَ النَّصَابِ (المائدہ آیت ۷۲)

پہر اللہ نے جنت اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے تو  
کوئی نہیں بے انصافیوں کا مدد کرنے والا۔

**منشک کا انجام** اور جو بد بخت اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا کار ساز اور  
حاجت روائے ہیں اور ان سے یہ امید وابستہ کئے جوتے  
ہیں کہ جب ان پر کوئی آفت آئے گی تو وہ (جھوٹے معبود) انہیں بچالیں گے۔ ایسے  
لوگوں کی مثال کو اللہ تعالیٰ نے کس خوبی سے بیان فرمایا ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ  
أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ إِذَا أَخَذَتْ  
بَنِيَّاهُ وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ  
الْعَنْكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ  
(سورۃ العنکبوت آیت ۲۶)

ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اور  
حمایتی بناتے ہیں مکڑی جیسی ہے کہ بنایا اس  
نے جالے کا گھر اور دم سب جانتے ہو کہ سب گھر  
میں کمزور ترین گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے۔ کاش  
ان کو سمجھ ہوتی۔

ان کی توقعات مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ وہ تو ہوا کے جھونکے  
کو بھی برداشت نہیں کر سکتا چہ جائیکہ باد و باران یا طوفان سے ان کی حفاظت کرے  
پس جو بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو بچانے والا اور محافظ سمجھے گا اور اللہ تعالیٰ سے  
تعلق توڑ کر غیروں کے ساتھ تعلق جوڑے گا یا ان پر بھروسہ کرے گا۔ ان کی مثال اسی  
نادان مکڑی کی سی ہے جو اپنے جالے کے تاروں پر بھروسہ کرتی ہے اور امیدوں  
کے محلات تعمیر کرنا چاہتی ہے۔

بلاشبہ خالق کائنات کو چھوڑ کر کسی اور کو معبود بنالینا اور اسے اپنا کار ساز  
سمجھنا انتہائی بد بختی اور حماقت ہے۔ کائنات میں موجود مخلوقات اور مصنوعات  
میں جب کوئی عاقل غور و فکر کرتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ عالم کا پیدا کرنے والا باقی رکھنے  
والا اور اس میں ہر قسم کے تصرفات کرنے والا صرف ایک اللہ ہی ہے۔ اس کے  
دستِ قدرت میں سارے آسمان و زمین ہیں۔ ہر چیز فرشتے، سورج و چاند اور جن و  
انس سب اپنی ذات اور کمالات میں ہر دم اسی کے محتاج اور دستِ نگر ہیں۔ پس عباد

کے لائق بھی، بجز اس کے کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ تمام انبیاء علیہم السلام اور ادیان سماویہ توحید کی صحت اور شرک کے غلط اور باطل ہونے پر متفق ہیں۔ اب بھی ان تحریف شدہ کتب یعنی تورات، انجیل زبور اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے صحائف میں ایسے جملے بکثرت ملتے ہیں جن سے انبیاء علیہم السلام کا ایک اللہ کی بندگی اور عبادت کرنا اور اپنی اقوام اور امتوں کو ایک اللہ کی عبادت اور اسی پر مہروسہ کرنے کی دعوت دینا ثابت ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے اپنے اقوال اور اعمال سے واضح کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے حکم کے مقابلہ میں کسی اور کی بات کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ ہر نبی کو بذریعہ وحی بتایا گیا کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کی عبادت بھی کرے تو اس کی تمام نیکیاں ضائع ہو جائیں گی، اور شرک کا انجام حیران و خسران کے سوا کچھ نہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ (المونون آیت ۱۱)

جو کوئی پکارے اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو جس کی اس کے پاس کوئی سند نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے، بے شک کامیاب نہیں ہوں گے انکار کرنے والے۔

اور سورہ النعام میں فرماتے ہیں۔

ذَلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ عِبَادَهُ لَئِيْلَآ أَشْرَكُوا مَعَ مَا أُشْرِكُوا لَئِيْلَآ يَكْفُرُوا عَنْهُمْ سَخِرَ سَخِرَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ

یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے اس پر چلتا ہے جس کو چاہے اپنے بندوں میں سے اور اگر وہ شرک کرتے تو ضرور ضائع ہو جاتے (ان سے وہ اعمال جو کچھ انہوں نے کیا تھا۔

سورۃ النعام آیت ۸۸

اسی طرح سورۃ زمر میں ارشاد ہے کہ۔

وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ

بے شک وحی کی گئی ہے تجھ کو اور جو تجھ سے پہلے تھے کہ اگر (بغیر من مال) تو نے بھی شرک مان لیا

وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ بَلِ اللّٰهُ فَاعْبُدُوْهُ  
 كُنْ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ  
 حَقَّ قَدْرٍ ۝ وَالْاَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ  
 يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۝ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيٰتٌ  
 بِيَمِيْنِهِ ۝ سُبْحٰنَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝  
 (الزمر آیات ۶۵ تا ۷۷)

توضیح ہو باتیں گے تیرے اعمال اور تم بھی نقصان  
 اٹھالے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ بلکہ اللہ ہی  
 کی عبادت کرو اور ہو جاؤ شکر کرنے والوں میں سے  
 اور نہیں پہچانی انہوں نے اللہ  
 کی قدر جیسے کہ حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا اور  
 اس کی شان تو ایسی عظیم ہے کہ زمین ساری اس کی

مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور سارے آسمان پلٹے ہوئے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ سے۔ وہ  
 پاک ہے ہر عیب سے اور بہت بالاتر (اوپر) ہے اس سے جو کہ اس کا شریک بتلاتے ہیں۔

**حدیث شریف میں شرک کی مذمت** | اگرچہ شرک کی نفی اور مذمت میں  
 بہت سی احادیث ہیں لیکن یہاں صرف  
 تین احادیث پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔  
 یا رسول اللہ ای الذنب اکبر عند اللہ؟  
 قال ان تدعوا للہ مذاداً و هو خلقک  
 الحدیث متفق علیہ مشکوٰۃ باب الکبائر

(۲) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک نقل  
 کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اجتنبوا السبع الموبقات قالوا یا  
 ماہن یا رسول اللہ؟ قال الشّرک  
 باللہ، والسحر، وقتل النفس التي  
 حرم اللہ الا بالحق، واکل الربوا واکل  
 مال الیتیم، والتولیٰ یوم الزحف  
 کرسات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو بھائیو  
 یعنی اللہ عنہم نے عرض کیا اے رسول اللہ کیا ہیں؟  
 فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، ناحق  
 قتل کرنا، سود کھانا اور خیم کا مال کھانا اور رڑائی  
 کے دن پیٹھ پھیر کر (جنگ سے) جگانا اور ایماندار

وقذف المحضات المؤمنات الفاحشات منهن (۱) پاکدامن بے خبر عورتوں پر تمت لگانا۔  
(۳) اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس باتوں کے ساتھ وصیت کی ہے۔

قال لا تشربن بالليل شربة واحدة وإن قيلت  
او حُرِّقَتْ۔ الحديث (رواه احمد مشكوراً)  
فرمایا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اگرچہ  
تجھے قتل کر دیا جائے یا تو جلا دیا جائے۔

مشرک کا نہ عقائد کے اثرات | حقیقت یہ ہے کہ مشرک کا نہ عقائد ایسے کشیف اور دبیز  
پردے ہیں جو ہمیشہ صاحب عقیدہ اور اصل حقیقت

کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں، اور مشرک حقائق کے دریافت کرنے سے محروم  
ہو جاتا ہے۔ جب ایک شخص کوئی غلط عقیدہ مان لیتا ہے تو اس کی عقل اور فکر اس  
عقیدہ پر جمی رہتی ہے، اور اس کے افکار کی ترقی اور جہد و جہد رک جاتی ہے، پھر وہ  
بہت سے خرافات کو مان لیتا ہے اور حقیقی کمالات سے دور، ذلت اور پستی کے  
گڑھے میں گر جاتا ہے۔ اس کی ساری زندگی وحشت، اداہم اور خوف و ہراس کی نذر ہو  
جاتی ہے، حیوانات کی معمولی سی حرکت اور پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ سے اس پر ہیبت  
طاری ہو جاتی ہے، غلط تصورات کی بدولت وہ دنیوی زندگی میں خوشحالی کے کافی  
وسائل سے محروم ہو جاتا ہے، اور آخرت میں بھی دائمی عذاب اور پریشانی میں گرفتار  
رہے گا۔

صحیح راستہ | اس لئے ہر شخص (خواہ انس ہو یا جن) پر فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی  
ذات و صفات میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرے، اسی ذات

کو خالق کائنات، رب العالمین مانے، وہی ہمارا پیدا کرنے والا، ہمارے مصائب و مشکلات  
کو دور کرنے والا، ہماری حاجتوں کو پورا کرنے والا ہے، ہماری عزت و ذلت، مرنا جینا،  
اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، وہی علیم وخبیر، عالم الغیب والشاہدۃ اور کائنات کی تمام  
حقیقتوں کو جاننے والا ہے، وہی ذات ہے جس کے علم نے کائنات کے ہر ذرے کا  
اعاطہ کیا ہوا ہے، کائنات کی ہر چیز کے ظاہر و باطن ہر آن دیکھنے اور جاننے والا ہے، کائنات

سکا کوئی ذرہ مخلوقات کا مل و قول کوئی سوچ، و سوسہ اور راز کی چیز اس سے پوشیدہ نہیں، اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰی عَلَیْهِ شَيْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمٰوٰتِ بے شک اللہ تعالیٰ اسے کوئی چیز پوشیدہ نہیں خواہ وہ زمین میں ہو یا آسمان میں، (آل عمران آیت ۱۵)۔

نیز ہم پر یہ بھی فرض ہے کہ تمام مخلوق خواہ انس یا جن، فرشتہ ہو یا نبی مرسل ہجالی ہو یا ولی، بادشاہ ہو یا فقیر، حاکم ہو یا محکوم، جاندار ہو یا بے جان سب کلاس کے محتاج و غلام مان لیں ہر طرف سے کٹ کر صرف ایک اللہ تعالیٰ کے وفادار اور شکر گزار بندے بنیں اس کی عظمت اور جلالت کو سمجھیں، اس کے ہر حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیں، اور اپنی عبادات کو ہر قسم کی مشرکانہ آمیزش سے پاک کر کے دل و جان سے اس کی عبادت کریں اور اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کریں۔

بندے پر فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تقرب حاصل کرنے کے لئے یا سفارشی بنانے کے لئے بھی کسی مخلوق کی عبادت نہ کرے اور نہ ہی عبادت کی شکل و صورت اختیار کرے، کفار و مشرکین کا یہی طریقہ تھا، وہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کی پرستش کرتے اور حجب انہیں نوکا جانا تو حجاب میں کتنے کربے شک بڑا خدا تو ایک ہی ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کئے ہیں، لیکن ہم ان چھوٹے خداؤں کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ ہم خدا سے واحد کے قریب ہو جائیں، اور کبھی کتنے کربے احسان اور رب ہماری عبادت سے خوش ہو کر بڑے خدا کے حضور میں ہمارنی سفارش کریں گے اور ہماری عبادتیں اور دعائیں وہاں تک پہنچا دیں گے، قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلْيَعْبُدُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ  
وَلَا يَضُرُّهُمْ وَيَقْرَءُوْنَ هُوَ لَا يَسْمَعُوْنَ  
عِنْدَ اللّٰهِ سُبْحٰنَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔

اور یہ مشرک عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی جو عبادت نہ کرنے کی صورت میں نہ نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ عبادت کرنے کی صورت میں نفع دے سکتی ہیں اور کتنے ہیں یہ

(سورہ یونس آیت ۱۱۸)

(معبود تو ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے نزدیک) (اس لئے ہم ان کی عبادت کرتے ہیں)

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْنَ اَخْلَصَ اَوَّلِيْنَ  
اَتَّخَذَ وَا مِنْ دُونِهٖ اَوْلِيَاءَ مَا لَنَعْبُدُ  
اِلٰهَ لِيُقَرِّبُنَا اِلَى اللّٰهِ ذَلٰلَتًا اِنَّ اللّٰهَ  
يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ  
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ  
كٰفًا (سورہ الزمر آیت ۳)

اس کو جو ہو جھوٹا حق نہ مانے والا۔

ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ مشرکین جن کی عبادت، ان کو خالق و مالک حقیقی سمجھ کر نہیں کرتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کو خالق و مالک حقیقی اور کائنات میں متصرف مانتے تھے۔ لیکن قرب الہی، دعاؤں اور عبادات کو اللہ تک پہنچانے کے لئے اصنام اور بزرگ، ہستیوں کی موتیوں کی پوجا کرتے تھے۔ اسی لئے مشرکین ٹھہراتے گئے اور توحید خالص سے محروم ہو کر دائمی خسارے میں پڑ گئے۔

البتہ دعا کی درخواست کے لئے علماء کرام اور صالحین کی خدمت میں حاضر ہونا اس سے بالکل جدا ہے۔ کیونکہ جب کوئی مسلمان کسی اللہ والے صالح آدمی سے دعا کی درخواست کرتا ہے تو اس کی عبادت نہیں کرتا۔ اور مسلمان سے دعا کی درخواست کرنا قرآن و سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے جیسا کہ توسل کے باب میں مفصل گزر چکا ہے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام، اولیاء اور صلحا سے محبت رکھنا اور ان کی تعظیم و احترام کرنا اس ضمن میں شمار نہیں اور نہ ہی یہ غیر اللہ کی عبادت ہے بلکہ ہم کو ان مشرکوں سے محبت اور ان کی تعظیم و تحظیم کا حکم ہے کہ اس کے بغیر ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔

**مشرک خفی** کوئی عبادت یا دینی کام یا نیک عمل اس لئے کرنا تاکہ لوگوں کے دل میں لے یعنی اگر کوئی نیک عمل لوگوں کو دکھانے کے لئے اس لئے کرتا ہے کہ وہ اسی طرح کا عمل کریں تو اس میں مضائقہ نہیں لیکن ایسا کرنے سے اکثر لوگ بالآخر ایسے ریا میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اپنی ریاکاری کا ہم بھی نہیں ہوتا۔

خبردار اللہ ہی کے لئے (مشرک و ریا سے) خالص بندگی ہے اور جن لوگوں نے بنائے ہیں اس کے سوا اور عبادتی اور کتے ہیں ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے مگر محض اس لئے کہ یہ ہم کو اللہ کا مقرب بنا دیں۔ بے شک اللہ فیصلہ کر دے گا ان میں جس چیز میں وہ جھگڑ رہے ہیں البتہ اللہ ہدایت نہیں دیتا

انسان کی وقعت اور قدر و منزلت پیدا ہو جاتے، شرک خفی اور ریا کھلتا ہے اس کی گنتی قسمیں ہیں۔

۱۔ کوئی شخص نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہو نہ اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور نہ ہی آخرت پر، لیکن لوگوں کو باور کراتے کہ وہ مسلمان ہے اور بظاہر دینی اعمال بھی کرتا رہے، یہ اصل ایمان میں ریا ہے اُسے نفاق کہتے ہیں اور اُس کے کرنے والے کو منافق، یہ جلی اور عظیم شرک سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور اس کا ٹھکانہ دھڑ میں دوسرے مشرکین و کفار سے زیادہ سخت اور اس کا ٹھکانہ سب سے نیچے انتہائی خراب اور بُرا ہے۔

نفاق کی بھی کئی قسمیں ہیں، اول یہ کہ اندر سے اسلام کا بالکل منکر ہے لیکن مسلمانوں میں افتراق و انتشار پھیلانے اور فتنہ برپا کرنے کے لئے خود کو مسلمان ظاہر کرے اور ظاہری فرمانبرداری جیسے نماز وغیرہ ادا کرے، دوم یہ کہ اندر سے تو صاف منکر ہے لیکن مسلمانوں سے اپنے مفادات حاصل کرنے کے لئے ایمان و اسلام کا اظہار کرے اگرچہ فتنہ انگیزی کا خیال نہ ہو، سوم یہ کہ دل سے اسلام کا صاف منکر تو نہ ہو لیکن اسلام کے برحق ہونے پر کامل اطمینان بھی نہ ہو بلکہ کفر و ایمان میں متردد اور متذبذب ہو۔ لیکن صرف مسلمانوں کی جماعت میں رہنے کی وجہ سے بظاہر اسلام کا نام لیا ہو، جب دنیا اور شہوات کے غلبہ نے اس کو ایسا نکمابنا دیا ہو کہ دنیا کی خاطر وہ اسلام اور مسلمانوں کی بربادی اور دین کے مذاق اڑانے کو مباح عمل کی طرح برداشت کر لیتا ہو اور ایسے حالات میں بھی جہاد سے جی چراتا ہو جب کہ اسلام اور مسلمانوں کو اس کی سخت ضرورت ہو، قرآن مجید نے مختلف مقامات پر ان مختلف قسم کے منافقین کی نشاندہی کی ہے اور ایک جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ  
يَسْعَىٰ نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ  
لَبِّشُوا الْيَوْمَ جَنَّتَ تَجْرِي مِنْ  
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَلِيدٌ مِنْ فِيْهَا ذَلِكَ

یعنی اس (قیامت کے) دن جب کہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا ان سے کہا جائے گا آج بشارت ہے تمہارے لئے ایسی جنوں

هُوَ الْعَظِيمُ يَوْمَ يَقُولُ الْمَافِقُونَ  
وَالْمُنْفِقُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُوا  
نَفْسًا مِنْ نَورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا  
وَرَأَى كُوفًا لَتَمَسُوا نَورًا فَضُرِبَ  
بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَ بَابٌ بَاطِنٌ فِيهِ  
الرَّحْمَةُ وَظَاهِرٌ مِنْهُ الْعَذَابُ  
يَا دُونَهُمْ أَلَمْ يَكُنْ مَعَكُمْ قَالُوا  
بَلَىٰ وَلَكِنَّكُمْ فَتَنْتُمُ الْفُسْكَوۥ وَتَرْتَضَوۥ  
وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانَةُ حَتَّىٰ  
جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُمْ بِاللَّهِ الْغُرُورُ  
فَالْيَوْمَ لَا يُوَفِّدُكُمْ فِئْتِيَّةٌ  
وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مَآ وَكُمُ النَّارُ  
هِيَ مَوْلَاكُمْ وَبُئْسَ الْمَصِيرُ

(سورۃ الحجۃ آیت ۱۲ تا ۱۵)

کی جن کے نیچے نہری بہر رہی ہوں گی میں وہ  
ہمیشہ رہیں گے یہی ہے بڑی کامیابی اس روز  
منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ خود  
سے کہیں گے ذرا ہماری طرف دیکھو اگر ہم تمہارے  
نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں مگر ان سے کہا جائے گا  
کہ نیچے کی طرف لوٹ جاؤ اور وہاں نور تلاش کرو  
پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے  
گی جس میں ایک دروازہ ہوگا اس کے اندر رحمت  
ہوگی اور باہر کی جانب عذاب ہوگا منافق اہل ایمان  
کو پکاریں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے ہمنویں  
جواب دیں گے ہاں مگر تم نے اپنے آپ کو فتنوں  
میں ڈال دیا ہماری تباہی کا انتظار کرتے رہے  
نہیں میں پڑے رہے اور دھوکہ میں ڈال دیا تمہیں  
عجوبی توقعات یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آپہنچا اور

دھوکا دیتا رہا تمہیں اللہ کے بارے میں وہ بڑا دغا باز شیطان پس آج نہ تم سے کوئی قدر قبول کیا جائے گا  
اور نہ ان لوگوں سے جنہوں نے کھلا کھلا کفر کیا تھا تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے وہی تمہاری خبر گیری کرنے والا  
ہے اور یہ بدترین انجام ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

إِنَّ الْمَافِقِينَ فِي الدَّرَجَاتِ الْأَسْفَلِ  
مِنَ النَّارِ وَلَنْ يَجْعَلَ لَهُمْ نُصِيرًا

(النساء آیت ۱۳۵)

یقین ہاں کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے  
درجے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار  
نہ پاؤ گے۔

(۲) ریاکی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان تو ہے لیکن عبادات اور  
دوسرے خیر کے کام لوگوں کو دکھلاوے اور نام و منوہ کے لئے کرے مثلاً لوگوں کے  
سامنے نماز پڑھنا زکوٰۃ دینا لیکن اگر پاس کوئی دیکھنے والا نہیں ہے تو نہ نماز ہے اور نہ

زکوٰۃ۔ یہ بھی نہایت خطرناک ہے اور ایمان میں خلل کی علامت ہے۔

(۳) ریاء کی تیسری قسم یہ ہے کہ فرائض میں تو ریاء نہ ہو لیکن اگر کوئی پاس ہو تو نفل نمازوں، صدقات اور دیگر مستحبات کا اہتمام ہو لیکن اگر کوئی نہ دیکھے تو نہ نوافل ہوتے ہیں نہ مستحبات۔ یہ ریاء بھی بہت خطرناک ہے۔

(۴) چوتھی قسم یہ کہ تنہائی میں اتنی عبادت یا کار خیر نہیں کرتا جتنی لوگوں کی موجودگی میں کرتا ہے۔ ایسی عبادت پر بھی شدید عذاب کا اندیشہ ہے۔

(۵) پانچویں قسم کی ریاء یہ ہے کہ جو عبادت اور نیک عمل لوگوں کے سامنے کرتا ہے وہی ان کی غیر موجودگی اور تنہائی میں بھی کرتا ہے لیکن لوگوں کے سامنے زیادہ نشاط، مسرت اور حسن ادا سے کرتا ہے۔ مثلاً کوئی ہمیشہ تہجد پڑھتا ہو لیکن مکان کے سامنے زیادہ نشاط اور خوبصورت طریقے سے پڑھے اس میں بھی ریاء ہے۔ اگرچہ پہلی اقسام سے کم۔

۱۶۔ چھٹی قسم ریاء کی وہ ہے جس میں کسی کی موجودگی یا غیر موجودگی کی پروا تو نہ ہو لیکن یہ چسکا لگا ہوا ہو کہ کسی طرح لوگوں کو میرے نیک اعمال اور باطنی حالات کی خبر ہو جائے اور مختلف طریقوں سے اس کا اظہار کرتا ہو۔

۱۷۔ ہریا کی ساتویں قسم یہ ہے کہ کسی نیک عمل کو محض اس لئے ترک کر دے کہ لوگ اسے ریاکاری کا طعنہ دیں گے یا اپنی خفیہ مجلسوں یا اپنے خیال میں اسے ریاکار سمجھیں گے۔ یہ بھی ریاء کی ایک بہت خطرناک قسم ہے کیونکہ یہ شخص بے علی کے ساتھ لوگوں کے سامنے اپنے اخلاص اور بزرگی کا ثبوت میا کرنا چاہتا ہے جب کہ دوسرے ریاکار عمل کر کے اپنی نیکو کاری وغیرہ کی شہرت چاہتے ہیں۔ شرک، خنہ اور ریاء کی کچھ قسمیں ہیں جو بہت باریک ہیں لیکن قابل ممانعت۔

معاذ اللہ اگر کار خیر میں رضا اور خوشنودی تو اللہ کی مقصود ہو اور جب کوئی دیکھنے والا ہو تو نشاط اور حسن ادائیگی بھی نہ ہو مگر طبیعت خوش ہو جائے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مساف فرمائے اور اس عمل کو قبول فرمائے بلکہ اگر اس کو خوشی صرف اس بنا پر ہو کہ الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کو ظاہر فرمایا اور ہمارے بڑے اعمال اور گناہوں کو پوشیدہ کئے رکھا کیونکہ نیک کا اظہار کرنا اور گناہوں پرستاری کرنا اقیامت کی رطقی سے بچاؤ کی علامت ہے۔ اس قسم کی خوشی میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ ماضی، ماضی و مستقبل

جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ ازالۃ الخفا میں معتقل بن یسار سے روایت نقل کرتے ہیں کہ وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا ابے ابو بکر! شرک تم میں چھوٹی کے پاؤں کی آواز سے بھی زیادہ چھپا ہوا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ کیا شرک اس کے علاوہ اور بھی کچھ ہے کہ کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی مبعود بنائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ البتہ شرک چھوٹی کے پاؤں کی آواز سے بھی زیادہ چھپا ہوا ہے۔ کیا میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں جو تم کو گمراہ کرے تو اس (شرک) کا قلیل اور کثیر سب جانا رہے (یعنی معاف ہو جاتے) فرمایا کہو۔

اللہم افرغ ذیك ان اشرك بك وانا اعلم واستغفرک  
لما لا اعلم (ازالۃ الخفا ص ۱۳۰ ۲۵)

**شرک خفی اور ریا کی مذمت** | جو شخص ریا کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین نہیں

تھو یہ لوگ تو ایسے ہیں جو اعمال کرتے اور اپنے اندر کچھ کیفیات محسوس کرتے ہیں اور ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ہمارے اعمال اور اندرونی کیفیات کا اظہار ہو تاکہ لوگوں میں ان کی شہرت ہو لیکن یعنی لوگ ایسے بھی ہیں جو محض ظاہری حالت اور کیفیت بڑے لوگوں کی طرح بنالیتے ہیں اور ایسے اعمال کا اظہار کرتے ہیں جو انہوں نے کئے نہیں ہیں مثلاً کسی نے نفل روزے نہیں رکھے لیکن ہڈیوں کو خشک رکھے یا کتا ہے کہ میرا روزہ ہے یا تہجد نہیں پڑھا مگر ایسی حالت بنالیتا ہے یا ایسے الفاظ اور اشارے کرتا ہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ بڑا سمجھ گزار ہے یا صوفیا کی چند باتیں سیکھ کر انہیں دہراتا ہو تاکہ لوگ اس کو بڑا صوفی اور تصوف کا مالک سمجھیں یا چند روایات و حکایات سیکھ لے اور انہیں صرف اس لئے بیان کرتا ہے کہ لوگوں پر یہ ثابت کر دے کہ بڑا عالم ہے یا کوئی نیکان اور رونی صورت بنائے تاکہ لوگ سمجھیں کہ اس کو دین کا بہت بڑا نعم ہے وغیرہ وغیرہ تو یہ ایسی شدید قسم کی ریا اور مکاری ہے جو کسی بھی باحیہ انسان سے اس کا صدور ممکن نہیں۔ یہاں یہ خیال رہے کہ یہ چیزیں دوسروں میں تلاش کریں کیونکہ یہ نفل نماز، روزہ، تہجد، ذکر، اللہ تبارک و تعالیٰ کو یاد کرنا اور یاد رکھنا اور دین کا نعم وغیرہ تو بہت اہم امور ہیں لیکن صرف ریا کی وجہ سے ریا اور شرک خفی بن جاتے ہیں اس لئے دوسروں کے بارے میں تو خیال پس میں رہے کہ وہ اس کو اچھی نیت سے کر رہے ہیں اور اس کی یہ کیفیت یقینی ہے۔ البتہ اپنے بارے میں ہر وقت ہر گمان رہے اپنی جان کا محاسبہ کرے اور اپنی نیت کو خالص تر بنانے کی کوشش کریں اور ریا کے خوف سے کسی عمل کو بھی نہ چھوڑیں یہ بھی شیطان کا دھوکہ ہے۔

رکھتا اگرچہ وہ بظاہر اللہ تعالیٰ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آخرت کو مانے اور ایمان کا دعویٰ کرے۔ یا تو اس شخص کا دل یقین سے خالی ہے یا پھر اس کا یقین مخلوق پر ہے اور مخلوق سے اس کو جتنے اجر کی توقع ہے اتنی امید اللہ تعالیٰ سے نہیں یا وہ اللہ تعالیٰ اور مخلوق دونوں سے اجر و داد حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کا یہ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین بہت کمزور ہے۔

قرآن و حدیث میں ریا کی بہت مذمت کی گئی ہے اور اس پر بہت سخت وعید آئی ہیں، جیسا کہ شہادین اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

من صلیٰ یُرائی فقد اشترک۔ جس نے ریا کی نیت سے نماز پڑھی اس نے شرک کیا۔

ومن صام یُرائی فقد اشترک ومن نصدق یُرائی فقد اشترک۔ اور جس نے ریا کے ارادہ سے روزہ رکھا اس نے شرک کیا۔ اور جس نے ریا کی نیت سے صدقہ دیا اس نے شرک کیا۔ (رواہ احمد مشکوٰۃ باب الریا السمۃ)

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا المہاجر مدنی قدس کمرہ ریا پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

جو عبادت بھی ہو خالص اللہ جل شانہ کی رضا کے واسطے ہو، اس میں کوئی فاسد غرض ریا، شہرت، وجاہت وغیرہ سرگز نہ ہونا چاہیے کہ اس میں نیکی برباد گناہ لازم ہو جاتا ہے۔ احادیث میں بہت کثرت ہے اس پر وعیدیں اور تنبیہیں وارد ہوتی ہیں، ایک حدیث قدسی میں حق سبحانہ و تقدس کا ارشاد وارد ہوا ہے کہ میں سب شریحوں میں سب سے زیادہ بے پرواہ ہوں، جو شخص کسی عبادت میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کر دیتا ہے میں اس عبادت کرنے والے کو اس کے دبتے ہوئے، شریک کے ساتھ چھوڑ دیتا ہوں (مشکوٰۃ) یعنی وہ اپنا بدلہ اور ثواب اس شریک سے جا کر لے لے مجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ایک منادی اعلان کرے گا کہ جس شخص نے اپنے کسی عمل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا ہے وہ اس شریک سے اپنا ثواب مانگ لے، اللہ جل شانہ، شرکت سے بے نیاز ہے (مشکوٰۃ)۔

حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور ہمارے پاس تشریف لاتے تو ہم لوگ دجال کا تذکرہ کر رہے تھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں جس کا میں تم پر دجال سے بھی زیادہ خوف کرتا ہوں، ہم نے عرض کیا کہ ضرور بتائیں، حضور نے فرمایا کہ وہ شرک خفی ہے، مثلاً ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے داخل اس سے شروع کی ہے، کوئی شخص اس کی نماز کو دیکھنے لگے، وہ آدمی کے دیکھنے کی وجہ سے اپنی نماز لمبی کر دے۔

ایک دوسرے صحابی حضور کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ مجھے تم پر سب سے زیادہ خوف چھوٹے شرک کا ہے، صحابہؓ نے عرض کیا، چھوٹا بشرک کیا ہے؟ حضور نے فرمایا، یہاں ہے ایک حدیث میں اس کے بعد یہ بھی ہے کہ جس دن حق تعالیٰ شانہ، بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ عطا فرمائیں گے، ان لوگوں سے یہ ارشاد ہو گا کہ جن کو دکانے کے لئے گئے تھے، دیکھو ان کے پاس تمہارے اعمال کا بدلہ ہے یا نہیں (مشکوٰۃ)۔

قرآن پاک میں بھی حق تعالیٰ شانہ کا پاک ارشاد ہے فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَادِقًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا، اگست، جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے اور ان کا محبوب و مقرب بننا چاہے، تو نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں بعضے (دینی) مواقع میں اللہ جل شانہ کی رضا کے واسطے کھڑا ہوتا ہوں مگر میرا دل ہاتھ ہے کہ میری اس کوشش کو لوگ دیکھیں، حضور نے اس کا کوئی جواب مرحمت نہیں فرمایا، حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہو گئی۔

حضرت مجاہدؓ کہتے ہیں کہ ایک صاحب نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

میں عرض کیا کہ میں صدقہ کرتا ہوں اور صرف اللہ جل شانہ کی رضا مقصود ہوتی ہے مگر دل یہ چاہتا ہے کہ لوگ مجھے اچھا کہیں۔ اس پر یہ آیت شریفہ نازل ہوئی۔

ایک حدیث قدسی میں ہے حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے عمل میں میرے ساتھ کسی دوسرے شخص کو شریک کرتا ہے تو میں اس عمل کو سارے ہی کو چھوڑ دیتا ہوں۔ میں صرف اسی عمل کو قبول کرتا ہوں جو خاص میرے لئے ہو۔ اس کے بعد حضورؐ نے یہ آیت شریفہ تلاوت فرمائی۔ ایک اور حدیث میں ہے اللہ جل شانہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے ساتھی کے ساتھ بہترین تقسیم کرنے والا ہوں جو شخص اپنی عبادت میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو سا بھی کر دے میں اپنا حصہ بھی اس سا بھی کو دے دیتا ہوں۔ ایک حدیث میں ہے کہ جہنم میں ایک وادی ایسی ہے جس سے جہنم خود بھی چار سو مرتبہ روزانہ پناہ مانگتی ہے، وہ ریاکار قاریوں کے واسطے ہے۔

ایک اور حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آیا ہے کہ جُبْتُ الْحَزْنَ سے پناہ مانگا کر (یعنی غم کے کنوئیں سے جو جہنم میں ہے) صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس میں کون لوگ رہیں گے حضورؐ نے فرمایا کہ جو اپنے اعمال میں ریاکاری کرتے ہیں۔ ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ یہ آیت شریفہ قرآن پاک میں سب سے آخر میں نازل ہوئی (درمختور قرآن پاک میں دوسری جگہ ارشاد ہے یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْلِغُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْذَمِّ كَالَّذِي مُنْفِقٌ مَّا لَكَ رِئَاءَ النَّاسِ) (البقرہ ۲۶۵)۔

اے ایمان والو! تم احسان جتا کر یا نینا پہنچا کر اپنی تبرات کو برباد مت کرو جس طرح وہ شخص (برباد) کرتا ہے جو اپنا مال لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے خرچ کرتا ہے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور قیامت کے دن پر اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک چکنا پتھر ہو جس پر کچھ مٹی آگئی ہو (اور اس مٹی میں کچھ سبزہ وغیرہ جم گیا ہو) پھر اس پتھر پر زور کی باتش پڑ جائے سو وہ اس کو بالکل صاف کر دے گی (اسی طرح ان احسان رکھنے والوں) انہی دینے والوں اور ریاکاروں کا خرچ کرنا بھی صاف اڑ جائے گا اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی (یعنی یہ جو نیکیاں کی تھیں، صدقات دیئے تھے یہ سب ضائع جائیں گے)

اس کے علاوہ اور بھی کئی بکر قرآن پاک میں ریا کی مذمت فرماتی ہے ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے بن لوگوں کا فیصلہ ہوگا ان میں ایک تو شہید ہوگا اس کو بلایا جائے گا اور بلانے کے بعد دنیا میں جو اللہ جل شانہ کے انعامات اس پر ہوتے تھے وہ اس کو یاد دلانے جائیں گے، اس کے بعد اس سے مطالبہ ہوگا کہ اللہ جل شانہ کی ان نعمتوں میں رہ کر تو نے کیا نیک عمل کیا۔ وہ عرض کرے گا کہ میں نے تیری رضا جوئی میں جہاد کیا حتیٰ کہ شہید ہو گیا اور تجھ پر قربان ہو گیا، ارشاد ہوگا کہ یہ جھوٹ ہے تو نے جہاد اس لئے کیا تھا کہ لوگ بڑا بہادر بنائیں گے، وہ تجھے بہت بڑا بہادر بتا چکے ہیں جو غرض عمل کی تھی وہ پوری ہو گئی ہے، اس کے بعد اس کو جہنم میں پھینک دینے کا حکم کیا جائے گا اور تعمیل حکم میں اس کو منہ کے بل کھینچ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

دوسرا شخص ایک عالم ہوگا جس کو بلا کر اللہ جل شانہ کے انعامات اور احسانات جتا کر اس سے بھی دریافت کیا جائے گا کہ اللہ جل شانہ کی ان نعمتوں میں تو نے کیا عمل کیا وہ کہے گا کہ میں نے علم سیکھا اور لوگوں کو سکھایا، تیری رضا جوئی میں قرآن پاک پڑھا، ارشاد ہوگا، یہ سب جھوٹ ہے، یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا تھا کہ لوگ کہیں گے کہ فلاں شخص بڑا عالم، بڑا قاری ہے، سو لوگوں نے کہہ دیا ہے (اور جو مقصد اس محنت سے نتجاء حاصل ہو چکا ہے، اس کے بعد اس کو بھی جہنم میں پھینکنے کا حکم کیا جائے گا اور تعمیل حکم میں منہ کے بل کھینچ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

تیسرا شخص ایک سخی ہوگا جس پر اللہ جل شانہ نے دنیا میں بڑی وسعت فرما رکھی تھی ہر قسم کے مال سے اس کو نوازا تھا۔ اس کو بلایا جائے گا اور جو انعامات اللہ جل شانہ نے اس پر دنیا میں فرمائے تھے وہ جتا کر سوال کیا جائے گا کہ ان انعامات میں تیری کیا کارگزاری ہے۔ وہ عرض کرے گا کہ میں نے خیر کا کوئی موقع جس میں خرچ کرنا آپ کو پسند ہوایا نہیں چھوڑا جس میں آپ کی خوشنودی کے لئے خرچ نہ کیا ہو، ارشاد ہوگا یہ جھوٹ ہے تو نے محض اس لئے خرچ کیا کہ لوگ کہیں گے بڑا سخی شخص ہے سو کہا جا چکا ہے اس کے بعد اس کو بھی جہنم میں پھینکنے کا حکم ہوگا اور تعمیل حکم میں منہ کے بل کھینچ کر جہنم میں پھینک

دیا جائے گا (مشکوٰۃ بروایہ مسلم) اس حدیث میں اور اسی طرح اور احادیث میں جہاں ایک شخص کا ذکر آتا ہے اس سے ایک قسم آدمیوں کی مراد ہوتی ہے یہ مطلب نہیں کہ یہ معاملہ صرف تین آدمیوں کے ساتھ کیا جائے گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تینوں قسم کے آدمیوں سے یہ مطالبہ ہوگا اور مثال کے طور پر ہر قسم میں سے ایک ایک آدمی کا ذکر کر دیا۔

ان کے علاوہ اور بھی احادیث میں کثرت سے اس پر تنبیہ کی گئی ہے اور بہت زیادہ اہمیت سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ خالص اللہ جل شانہ کے لئے کیا جائے اور قبلاً بھی اہتمام ہو سکے اس کا کیا جائے کہ اس میں ریا اور نمود و شہرت اور دکھاوے کا شائبہ بھی نہ آنے پائے، مگر اس جگہ شیطان کے ایک بڑے مکر سے بے فکر نہ ہونا چاہیے، دشمن جب قوی ہوتا ہے وہ مختلف انواع سے اپنی دشمنی نکالا کرتا ہے، یہ بہت مرتبہ آدمی کو اس وسوسہ کی بدولت کہ اخلاص تو ہے ہی نہیں اہم ترین عبادتوں سے روک دیا کرتا ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ شیطان اول تو نیک کام سے روکا کرتا ہے اور ایسے خیالات دل میں ڈالا کرتا ہے جس سے اس کام کے کرنے کا ارادہ اسی پیدا نہ ہو، لیکن جب آدمی اپنی ہمت سے اس کا مقابلہ کرتا ہے اور اس کے روکنے پر عمل نہیں کرتا تو وہ کہا کرتا ہے تجھ میں اخلاص تو ہے ہی نہیں، یہ تیری عبادت، محنت، بیکار ہے، جب اخلاص ہی نہیں پھر ایسی عبادت کرنے سے کیا فائدہ؟ اور اس قسم کے وسوسے پیدا کر کے نیک کام سے روک دیا کرتا ہے اور جب آدمی رُک جاتا ہے تو اس کی غرض پوری ہو جاتی ہے (احیاء) اس لئے اس خیال سے نیک کام کرنے سے رُکنا نہیں چاہیے کہ اخلاص تو ہے ہی نہیں، بلکہ نیک کام کرنے میں اخلاص کی کوشش کرتے رہنا چاہیے اور اس کی دعا کرتا رہے کہ حق تعالیٰ شانہ محض اپنے لطف سے دشگیری فرمائے تاکہ نہ تو دین کا مشغلہ ضائع ہو، نہ برباد ہو۔ وَمَا ذَلِكْ عَمَلُ اللَّهِ بِئِزْزٍ مُبِينٍ۔

باب ہفتم

محبتِ مطلوبہ

## محبت

۱۔ شرابِ روح پرور ہے محبت رب یزدان کی

اللہ رب العزت نے انسان میں ایک مادہ محبت کا ایسا رکھ دیا ہے جس نے اسے ذوقِ پیش سے آشنا کر دیا ہے، اسی کی برکت سے زندگی کا سوز و ساز ہے اور ہر دم ایک نیا محشر پاتا ہے، اسی کی وجہ سے دل مضطرب و مایوس ہے، خود تڑپتا اور رول کو تڑپاتا ہے اور اس کے نالہ مائے غم آسمان کی بجلیوں سے کھیلنے ہیں۔

محبت کا یہ مادہ انسان کو محبوب کے حصول اور رضا کے لئے جان کی بازی لگانے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کی محبت جس چیز سے وابستہ ہو جاتے یہ اس کا غلام و بندہ بن کے رہ جاتا ہے۔ یہی محبت اس کے تمام امراض، پریشانیوں اور تکلیفوں کا سبب بھی بن جاتی اور علاج بھی، اگر محبت دنیا سے فانی سے ہو تو انسان آشفۃ حال، آگ بگولہ بن کر دنیا کے حصول کے لئے محنت و مشقت کرتا ہے، دور دراز ممالک دریافت کرتا ہے، دولت و عزت و شہرت حاصل کرنے کے لئے خون پسینہ ایک کر دیتا ہے، اور کبھی حسنِ فانی کا پروانہ بن کر اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لیتا ہے۔

محبت اگر اس تغیر پذیر دنیا سے بے ثبات سے ہوگی تو انسان ناکام و نامراد ہو گا، لیکن اگر یہی محبت جمالِ لازوال سے، اور اس کا سوز و گداز حسنِ ازلی وابدی خالق کائنات رب العالمین کے لئے ہو، اس کی وفا اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہو جائے تو اللہ کی کتاب اور سنتِ رسول سے ان کی رضا اور احکام کو معلوم کر کے دنیا میں ایمان و عمل سے اُجالا کر دے۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت انسان کی ساری پرکندگی اور پریشانی کا حل ہے۔ یہ وہ آبِ حیات ہے جو اس کو بقائے دوام عطا کرتی ہے اور اس کے لئے دنیا و آخرت میں سرمایہ فلاح و نجات ہے۔

جس طرح مومن کے لئے اللہ تعالیٰ کی محبت ضروری ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ اَللّٰہِ۔ اسی طرح شہداء اللہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی ضروری ہے۔  
اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے۔

یعنی پس جو لوگ اس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاتے اور اس کی محبت و تعظیم کے ساتھ، حمایت کی اور مخالفین کے مقابلہ میں اس کی مدد کی اور تابع ہوئے اس نور (قرآن مجید) کے جو ان کے ساتھ بھیجا

فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَلَنَّهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔  
(الاعراف آیت ۱۵۷)

گیا ہے وہی لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے۔  
تَعَزَّزُوا وَتَوَقَّزُوا۔

یعنی تم ان کی محبت و تعظیم کے ساتھ، مدد کرو اور دل سے ان کی تعظیم کرو۔

معلوم ہوا کہ مکمل کامیابی اور فلاح پانے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سچے دل سے ایمان لاتے، ان کی تکریم و تعظیم میں کوئی کمی نہ کرے، ان کے دین کی نصرت اور اس کی تائید کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہو اور قرآن کریم کے ارشاد پر عمل کرنے کے لئے دل و جان سے آمادہ ہو۔ حضرت مولانا مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ”یہاں فلاح پانے کے لئے چار شرطیں ذکر کی گئی ہیں، اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان، دوسرے آپ کی تعظیم و تکریم، تیسرے آپ کی امداد، چوتھے قرآن کریم کا اتباع۔“

تعظیم و تکریم کے لئے اس جگہ عزروہ لایا گیا ہے۔ یہ تعزیر سے مشتق ہے تعزیر کے اصل معنی اشقیات کے ساتھ منع کرنے، حفاظت کرنے کے ہیں، عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے عزروہ کے معنی تعظیم و تکریم کرنے کے بتلائے ہیں، اور مہر دے کہا ہے اور جو ایمان والے ہیں ان کو اللہ سے سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔

کہ اعلیٰ درجہ کی تعظیم کو تعزیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔  
آگے لکھتے ہیں۔

”عزروہ و نصروہ۔“ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا الیا اتباع مقصود نہیں جیسے دنیا کے حکام کا اتباع جبراً و قہراً اگر ناپڑے، بلکہ وہ اتباع مقصود ہے جو عظمت و محبت کا نتیجہ ہو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت دل میں اتنی ہو کہ اس کی وجہ سے آپ کے احکام کے اتباع پر مجبور ہو۔ کیونکہ امت کو اپنے رسول سے مختلف قسم کے تعلقات ہوتے ہیں، ایک یہ کہ وہ امیر و حاکم ہے اور امت محکوم و رعیت، دوسرے یہ کہ رسول محبوب ہے اور پوری امت ان کی محب۔ ایک یہ کہ رسول اپنے کمالات علمی، عملی، اخلاقی کی بنا پر صاحب عظمت ہے اور ساری امت ان کے مقابلے میں پست و عاجز۔ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں سب شانیں درجہ کمال میں پائی جاتی ہیں، اس لئے امت پر لازم ہے کہ ہر شان کا حق ادا کریں، بحیثیت رسول کے ان پر ایمان لائیں۔ بحیثیت امیر و حاکم کے ان کے احکام کی پیروی کریں، بحیثیت محبوب ہونے کے ان کے ساتھ گہری محبت رکھیں اور بحیثیت کمالات نبوت ان کی تعظیم و تکریم سجالائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع تو امت پر فرض ہونا ہی چاہیے تھی کیونکہ انبیاء کے بھیجنے کا مقصد ہی اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا، لیکن حق تعالیٰ نے ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صرف اس پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ امت پر آپ کی تعظیم و توقیر اور احترام و ادب کو بھی لازمی قرار دیا ہے اور قرآن کریم میں جا بجا اس کے آداب سکھاتے گئے ہیں اس آیت میں ”عزروہ و نصروہ“ کے الفاظ سے اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے اور ایک دوسری آیت میں بھی ”و تعزروہ و توقروہ“ آیا ہے

(معارف القرآن ج ۴ ص ۸۷)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے والمانہ محبت کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا۔

النَّبِيِّ أُولَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ  
النَّفْسِ هَفْ

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایمان والوں کی جانوں  
سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ وہ محبت اور تعلق بیان فرما رہے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم  
کو مؤمنین سے ہے کہ تمہارے ساتھ ہمدردی و خیر خواہی اور تربیت و غیرہ میں آپ  
صلی اللہ علیہ وسلم تم پر تمہارے نفوس سے بھی زیادہ مہربان ہیں، حضور کا لطف و کرم اور  
تمہاری دنیا و آخرت کی کامیابی اور خیر خواہی کا جو خیال آپ رکھتے ہیں وہ خود تمہارے نفوس  
بھی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ  
علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَا مِنْ مُّؤْمِنٍ اِلَّا وَ اَنَا اُولَى النَّاسِ  
بِهٖ فِى الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ اَقْرَبُ وَاِلَّا  
بَشَّرْتُ النَّبِيَّ اُولَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ  
النَّفْسِ هَفْ وَ الْحَدِثُ بخاری جلد ۱۲

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے ساتھ ایسا گہرا تعلق ہے اور ہم میں سے ہر ایک  
پر ساری دنیا سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں تو پھر اس کا لازمی اثر اور حق یہ ہونا چاہیے  
کہ ہر مومن کو آپ سے محبت تمام مخلوقات اور اپنی جان سے بھی زیادہ ہو، آپ کی تحکیم  
و تعظیم بھی سب سے زیادہ کرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بھی تمام مخلوقات اور نفس  
کی ساری خواہشات پر مقدم رکھے اور سب سے زیادہ واجب التعمیل سمجھے جیسا کہ اللہ  
تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ  
وَ اَخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَ غَشِيْرَتُكُمْ  
وَ اَمْوَالٌ اَقْتَرَفْتُمْ وَاَنْتُمْ حَاژَةٌ  
تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسْكُوْتٌ وَ

آپ کہہ دیجئے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی  
اور تمہاری بیویاں اور تمہاری بلروری اور وہ  
مال جو تم نے کماتے ہیں اور وہ کاروبار جس کے بند  
ہونے کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ مکانات جن کو تم

تَرَضَوْهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ  
وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ  
فَمَن تَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ  
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ  
(سورۃ التوبہ آیت ۲۴)

پسند کرتے ہو، تم کو زیادہ پیار سے ہیں اللہ سے  
اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں لڑنے  
سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا  
حکم (مسز) اور اللہ ہدایت نہیں دیتا مفسدان  
لوگوں کو۔

اپنی اولاد، ماں باپ، بھائی اور اپنی بیوی وغیرہ سے محبت اور تعلق انسانی فطرت  
کا تقاضا ہے اسی طرح کاروبار، مال اور مکانات وغیرہ کے ساتھ انسان کا لگاؤ  
اس لئے ہے کہ وہ آرام و چین، عزت و راحت سے زندگی گزارنے میں ان کا محتاج ہے  
اسلام دین فطرت ہونے کی وجہ سے انسان کے فطرتی تقاضوں اور ضرورتوں کا صحیح اور  
مناسب خیال رکھتا ہے اور ہمیں ان اشیاء کے نہ حاصل کرنے یا ان کی طرف کامل  
بے توجہی کا حکم نہیں کرتا۔ بلکہ صرف ان کی محبت میں کھوجانے سے منع کرتا ہے تاکہ یہ چیزیں  
اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر غالب نہ آجائیں اور احکام شریعت  
پر عمل کرنے کے خلاف رکاوٹ نہ بن جائیں۔ جہاد و ہجرت جیسے عظیم اعمال کے لئے  
مانع نہ ہو جائیں۔

اگرچہ ان آیات میں ان لوگوں سے خطاب ہے جنہوں نے ہجرت و جہاد فرض  
ہونے کے وقت ان اشیاء کے لگاؤ اور محبت سے مغلوب ہو کر ہجرت و جہاد نہ کیا  
لیکن آیات شریفہ کے الفاظ عموم کے ساتھ تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ  
اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس درجہ کی محبت لازم ہے جس پر کوئی دوسری  
محبت اور تعلق غالب نہ آئے جیسا کہ صحیح حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حضور صلی اللہ  
علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا گیا ہے۔

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک رپوں میں  
نہیں ہوگا جب تک میں اس کو اپنی اولاد، والدین اور  
تمام لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہوں۔

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ  
إِلَيْهِ مِنْ وَلَدِهِ وَوَالِدِهِ وَالنَّاسِ  
اجمعین (بخاری و مسلم کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۲۷)

اسی طرح بہت سی صحیح احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب تک ایک امتی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دنیا کی ہر چیز حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی زیادہ نہ ہو، اس وقت تک اس کو ایمان کی حقیقت اور لذت نہیں حاصل ہو سکتی۔

**محبت کے اسباب** | یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ محبت کرنے کے چند اسباب ہوتے ہیں، پہلا سبب قربت ہے۔ اس میں محبت کا سبب صرف قرب ہوتا ہے کسی خارجی چیز جیسے حسن و کمال کی مزید ضرورت نہیں پیش آتی، بلکہ جہاں جتنا قرب ہوتا ہے وہاں اتنی ہی زیادہ محبت ہوتی ہے جیسے والدین کی محبت اولاد سے، دوسرے اقرباء سے زیادہ ہوتی ہے اسے طبعی محبت کہتے ہیں۔ محبت کا دوسرا بڑا سبب احسان ہے، یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ سچے محسن سے محبت ہو ہی جاتی ہے۔ تیسرا سبب حسن و جمال ہے، کیونکہ حسن صورت، حسن سیرت اور آواز کا حسن یہ سب اپنے اندر کشش رکھتے ہیں۔ محبت کا چوتھا سبب کمال ہو سکتا ہے، کسی میں غیرت، شجاعت، دانائی وغیرہ کے کمالات ہوں تو انہیں دیکھ کر یاسن کر صاحب کمال سے محبت ہو جاتی ہے۔

بعض اوقات محبت کا منشاء صرف عقلی ہوتا ہے اگرچہ طبعی طور پر آدمی کو اہمیت اور گہرا ہٹ محسوس کرے، بیمار کو تلخ دوا، آپریشن یا انجکشن وغیرہ سے تکلیف و گہرا ہٹ ہوتی ہے مگر غفلت اس کو صحت یابی کا ذریعہ سمجھتا ہے اور یہ دوائیں وغیرہ اس کی محبوب و مطلوب بن جاتی ہیں۔

**حضور سے اختیاری محبت** | چونکہ محبت طبعی ایک اضطراری اور غیر اختیاری چیز ہے اور اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی طاقت اور اختیار سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت سے مراد حب عقلی ہے یعنی یہ بات سوچ سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرے کہ ہر مومن پر اللہ تعالیٰ کی محبت لازم ہے اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اتباع ضروری ہے، لہذا اگر کسی شخص کے دل میں طبعی دنیاوی تعلقات ہوں

لیکن وہ ان سے اتنا مغلوب نہ ہو کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کی پرواہ نہ کرے تو وہ بھی آیات مذکورہ کی وعید سے خارج ہے اور اللہ و رسول کی محبت کو غالب رکھنے والا ہے جیسے دوا کی تلخی یا آپریشن سے طبعاً گہرا ہٹ قابل ملامت نہیں۔ اسی طرح اگر کسی کو مال و اولاد کی محبت کی وجہ سے شریعت کے کسی حکم کے بجالانے میں غیر اختیاری تکلیف محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اس تکلیف کو برداشت کر کے وہ اس حکم کی تعمیل کرتا ہے تو وہ قابل ملامت نہیں۔

عقلی محبت اختیاری ہوتی ہے لیکن اس پر قناعت کر لینا درست نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی محبت ابتداء میں اختیاری اور عقلی ہوتی ہے لیکن اس میں اس قدر ترقی ہوتی چاہیے کہ یہ محبت طبعیت پر غالب آجائے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی تعمیل میں وہ لذت محسوس ہو جو ہر تکلیف کو راحت اور ہر تلخی کو شیریں بنادے۔ یہی محبت کا اعلیٰ مقام ہے اور اسی درجہ کی محبت کی ترغیب دی گئی ہے جیسے صحیحین کی ایک حدیث میں ہے: حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔

ثَلَاثٌ مَنْ كُنْ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةً  
الْإِيمَانُ أَنْ يَكُونَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ  
أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا - الْحَدِيثُ

یعنی جس میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کی مشاق  
پائے گا ایک یہ کہ اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے  
رسول کی محبت سب چیزوں (مخلوق) سے  
زیادہ ہو۔

اس حدیث شریف میں حلاوت ایمان سے مقصود محبت کا یہی درجہ ہے جو انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو اور بڑی سے بڑی مشقت، حتیٰ کہ اپنی جان کی قربانی تک کو لذت بنادے۔ اور ہر قسم کی محبت چاہے طبعی ہو یا عقلی پر اس (تعمیل احکام) کو ترجیح دے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی اس پر شاہد ہے۔ چند واقعات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کی محبت | بنی دنیار کی ایک مسلمان خاتون کے والد، بھائی اور خاوند غزوہ احد میں شریک ہوئے تھے۔ جب اس کو ہر ایک کے متعلق یہ خبر ملتی کہ وہ شہید ہو گیا ہے تو وہ ان اللہ وانا الیہ راجعون پڑھتی اور بے قراری سے دریافت کرتی رہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس حال میں ہیں، لوگوں نے بتایا کہ آپ بالکل صحیح و سالم ہیں اس پر بھی اطمینان نہ ہوا اور کہنے لگی مجھے بتاؤ تاکہ دیکھ کر یقین کر لوں، جب اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تو فرماتے لگیں کہ آپ کے ہوتے ہوئے تمام مصیبتیں بیچ میں (سیرت ابن ہشام)

(۲) حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنی محبت تھی آپ نے فرمایا کہ خدائے پاک کی قسم حضور ہم لوگوں کے نزدیک اپنے مالوں سے اور اپنی اولادوں سے اور اپنی ماؤں سے اور سخت پیاس کی حالت میں ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب تھے (شفار حکایت صحابہ)

(۳) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے مولیٰ کيسانؓ فرماتے ہیں کہ حضرت سلمانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لاتے، دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس ایک طشت ہے اور یہ جو کچھ اس میں ہے اسے پی رہے ہیں، اتنے میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ حضورؐ کی خدمت میں آئے، آپ نے ان سے پوچھا کہ وہ کام کر آتے؟ حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا جی ہاں! حضرت سلمانؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ! کیا کام؟ آپ نے فرمایا کہ میں نے ان کو اپنے پچھنے کے خون کا غسل دیا تھا تاکہ جو کچھ اس میں ہے یہ اسے ہادیں، حضرت سلمانؓ نے فرمایا قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بیجا ہے اسے تو یہ پی گئے۔ آپ نے پوچھا کیا تم اسے پی گئے؟ انہوں نے کہا جی ہاں! آپ نے فرمایا کیوں؟ انہوں نے عرض کیا مجھے یہ بات پسند آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خون مبارک میرے پیٹ میں ہو۔ یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن زبیرؓ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا تجھے لوگوں سے نقصان پہنچے گا اور لوگوں کو تجھ سے



کہ ہمارے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال (مبارک) ہیں، ہم نے انہیں انس رضی اللہ عنہ سے یاد کیا کہ انہیں انس کے گھر والوں کے پاس سے پایا ہے، تو عبید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر ان بالوں میں سے ایک بال بھی مجھے مل جاتے تو (ساری دنیا سے اور جوں دنیا میں ہے اس سے وہ مجھ کو زیادہ پیارا ہو گا) بخاری شریف کتاب الوضوء ج ۱ ص ۹۶

(۸) ایک صحابیؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ مجھے اپنی بیوی، اپنی اولاد اور اپنی جان و مال سے بھی زیادہ پیارے ہیں، اور میرا یہ حال ہے کہ میں اپنے گھر میں ہوتا ہوں اور حضورؐ مجھے یاد آ جاتے ہیں تو اس وقت تک مجھے صبر اور قہر نہیں آتا جب تک حاضر خدمت ہو کر دیکھ نہ لوں، ایک نظر دیکھ نہ لوں اور جب میں اپنے مرنے کا اور حضورؐ کی وفات کا خیال کرتا ہوں تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وفات کے بعد حضورؐ تو جنت میں پہنچ کر انبیاء عظیم السلام کے بلند مقام پر پہنچا دیتے جاتیں گے اور میں اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جنت میں گیا بھی تو میری رسائی اس عالی مقام تک تو نہیں ہو سکے گی تو مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میں آپ کے دیدار سے محروم ہو جاؤں گا، رسول اللہؐ نے ان کی اس بات کا جواب اپنی طرف سے نہیں دیا، یہاں تک کہ سورہ النساء کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا (ن آیت ۶۹ رکوع ۹)

اور جو شخص اللہ اور رسول کا کنا مان لے گا تو ایسے لوگ بھی ان (حضرات) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور رفیقین۔

(۹) صحیح حدیث میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے قیامت کے لئے کیا تیار کر رکھا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میرے ساتھ اس کے سوا کچھ نہیں کہ

میں اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت رکھتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم (قیامت میں) اسی کے ساتھ ہو گے جس سے محبت رکھتے ہو، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم اسلام کے بعد کبھی کسی چیز پر ایسے خوش نہیں ہوئے جتنا کہ حضور کے اس فرمان سے خوش ہوئے (کیونکہ صحابہؓ کو آپ سے والہانہ محبت تھی) اس کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اللہ سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ابو بکرؓ و عمرؓ سے محبت رکھتا ہوں، اور مجھے امید ہے کہ میں اپنی اس محبت کی وجہ سے ان کے ساتھ ہوں گا، اگرچہ میں نے ان حضرات جیسے بہت زیادہ اعمال نہیں کئے ہیں (بخاری باب الاحکام و مسلم کتاب البر والصلة والفظل)

(۱۰) ان فرض صحابہ کرامؓ کو آپ کے ساتھ جو والہانہ محبت تھی اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعودؓ لکھتی جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، قریش کے سفیر کی حیثیت سے حضور کے سامنے ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طویل گفتگو کرتے رہے، اور نظریں بچا کر صحابہ کرامؓ کے حالات معلوم کرتے رہے واپس جا کر کنا رقریش کے سامنے صحابہ کرامؓ کی فحبت اور تعلق کو ان الفاظ میں بیان کیا۔ ”اے قریش میں بڑے بڑے بادشاہوں کے یہاں گیا ہوں، فیصر و کسریٰ اور بنجاشی کے درباروں کو بھی دیکھا ہے اور ان کے آداب بھی دیکھے ہیں، خدا کی قسم میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کی جماعت اس کی ایسی تعظیم کرتی ہو جیسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت ان کی تعظیم کرتی ہے، جب وہ وضو کرتے ہیں تو صحابہ کرامؓ آپ کے پیچے ہوتے پانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں، اور اگر وہ تھوکتے ہیں تو لپک کر لے لیتے ہیں۔ اور جس کے ہاتھ پر پڑ جاتے اس کو بدن اور منہ پر مل لیتا ہے، اور جب ان کو کسی بات کا حکم فرماتے ہیں تو وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے سامنے بولتے ہیں تو بہت نیچی آواز سے، ادب کی وجہ سے ان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے، اگر ان کے سر یا داڑھی کا کوئی بال گرتا ہے تو اس کو تبر کا اٹھا لیتے ہیں، غرض میں نے کسی جماعت کو اپنے آقا کے ساتھ اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی محمد

صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت ان کے ساتھ کرتی ہے۔ تو جس قوم کو اپنے سردار سے اتنی محبت ہو اس پر غالب آنا ناممکن ہے (ماخوذ از صحیح بخاری و شیخ ابن ہشام ص ۲۲۸) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہی ایمان و دین کی روح ہے لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہے گا اس کے لئے

### اہمیت اور اس کے ثمرات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی محبت لازمی اور ضروری ہے کہ وہ ایسے جائز اسباب اختیار کرنے جس سے محبت میں ترقی ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو فیوض و برکات آپ کے ذریعے پہنچائے ہیں اس لئے جو کوئی بھی آپ کو چھوڑ کر اللہ سے محبت کا اظہار کرے وہ بالکل غیر معتبر اور جھوٹا ہے صحابہ کرام کی زندگیوں کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی عظیم قربانیوں اور اعمال کا اصل محرک یہی جذبہ تھا۔ اللہ اور رسول کی محبت ان کی والہانہ زندگی کا سبب تھا۔ محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جو دل میں بس جانے کے بعد محبوب کو ہر چیز پر غالب کر دیتی ہے۔ پھر نہ مال و جان کی پرواہ ہوتی ہے نہ ننگ و ناموس کی اور نہ ہی تکلیف و مشقت کا اندیشہ رہتا ہے الغرض کسی دوسری چیز کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ جب انسان کے دل میں یہ جذبہ محبت جوش مارتا ہے تو پھر شریعت پر پابندی نہایت آسان ہو جاتی ہے اور دینی تکالیف میں راحت محسوس ہوتی ہے اور جذبہ محبت کی آگ دل میں بھڑک اٹھے تو انسان محبوب کے احکام کی تعمیل اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اور یہی حالت درحقیقت سچے موجد کی ہے توحید اور محبت کوئی حکایت کی چیز نہیں بلکہ یہ ایک کیفیت ہے۔ موجد اور محب ایسا ایسا ہوتا ہے کہ اس کی نگاہ مستقل طور پر سوائے محبوب کے کسی اور چیز نہیں جمتی۔ تاہم اس بات کی شاہد ہے کہ جب تک مسلمانوں کے قلوب میں محبت بھڑکتی رہی ان کا سر دنیا کی کسی طاقت کے سامنے اور کسی در پر نہ جھک سکا۔

حضور کے ادب و احترام کا حکم اور حقیقت اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی اطاعت کا حق ادا ہی تب ہو سکتا ہے جب دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت ہو، ورنہ بغیر محبت کے اطاعت ریا اور نفاق ہوتا ہے۔ شریعتِ مطہرہ میں اسی لئے تعظیم و محبت کو فرض کیا گیا ہے اور جو ذرا بھی توہین کریگا فیضِ رسالت سے ابدالاً بابت تک محروم رہے گا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زور سے بولنے اور ان کی آواز پر آواز بلند کرنے کی ممانعت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا  
أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا  
تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ  
لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ  
لَا تَشْعُرُونَ (سورہ الحجرات آیت ۲)

اے ایمان والو! بلند نہ کیا کرو اپنی آوازوں کو نبی  
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اور نہ ان کے ساتھ  
زور سے بات کیا کرو جس طرح اونچی آواز سے تم ایک  
دوسرے سے باتیں کرتے ہو کیسے ایسا نہ ہو کہ  
بے ادبی کی وجہ سے تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں  
اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

اس آیت شریفہ کے اول مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، جن کا ایشیاء اور قرآنیاں  
بے مثال ہیں، جن کی عبادات خشوع و خضوع میں رنگی ہوتی ہیں، جو ہر معاملہ میں اور ہر  
وقت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی ڈھونڈنے والے تھے۔ انھیں  
کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آواز اونچی کی تو یہ بھی ایسی  
بے ادبی اور گستاخی ہوگی کہ تمہارے سارے اعمال برباد ہو جائیں گے اور تمہیں خبر  
بھی نہ ہوگی۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں، اس آیت کے نزول سے  
صحابہ کرام کا یہ حال ہو گیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ قسم ہے  
کہ اب مرتے دم تک آپ سے اس طرح بولوں گا جس طرح کوئی کسی سے سرگوشی کرتا ہو  
اور مشور من البیتقی، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس قدر آہستہ بولنے لگے کہ بعض اوقات  
دوبارہ پوچھنا پڑتا تھا (کنز فی الصحاح) اور حضرت ثابت بن قیس قدرتی طور پر بہت بلند

آواز تھے۔ یہ آیت سن کر بہت ڈر گئے اور روئے اور اپنی آواز کو گھٹایا (بیان القرآن از در مشور) چند سطر آگے لکھتے ہیں۔

اس جگہ کلیات شرعیہ اور اصول مسلمہ کے اعتبار سے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ ضبط اعمال یعنی اعمال صالحہ ضائع کر دینے والی چیز تو باتفاق اہل سنت والجماعت، صرف کفر ہے کسی ایک معصیت اور گناہ سے دوسرے اعمال صالحہ ضائع نہیں ہوتے اور یہاں خطاب مومنین اور صحابہ کرامؓ کو ہے اور لفظ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ ہے جس سے اس فعل کا کفر ہونا ثابت ہوتا ہے تو ضبط اعمال کیسے ہوا۔ دوسرے یہ کہ جس طرح ایمان ایک فعل اختیاری ہے جب تک کوئی شخص اپنے قصد سے کفر کو اختیار نہ کرے وہ کافر نہیں ہو سکتا اور یہاں آیت کے آخر میں یہ تصریح ہے کہ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ یعنی تمہیں خبر بھی نہ ہو تو ضبط اعمال جو خالص کفر کی سزا ہے وہ کیسے جاری ہوتی۔

سیدی حضرت حکیم الامت نے بیان القرآن میں اس کی توجیہ ایسی بیان فرمائی ہے جس سے یہ اشکالات و سوالات ختم ہو جاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ مسلمانو تم رسول اللہؐ کی آواز سے اپنی آواز بند کر کے محابا جہر کرنے سے بچو کیونکہ ایسا کرنے میں خطرہ ہے کہ تمہارے اعمال ضبط اور ضائع ہو جائیں اور وہ خطرہ اس لئے ہے کہ رسول سے پیش قدمی یا ان کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کر کے غالب کرنا ایک ایسا امر ہے جس سے رسول کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہونے کا بھی احتمال ہے جو سبب ہے ایذا سے رسول کا، اگرچہ صحابہ کرامؓ سے یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ بالقصد کوئی ایسا کام کریں جو آپؐ کی ایذا کا سبب ہے، لیکن اعمال و افعال جیسے تقدم اور رفع صوت اگرچہ بقصد ایذا ہوں، پھر ان سے ایذا کا احتمال ہے اس لئے ان کو مطلقاً ممنوع اور معصیت قرار دیا ہے اور بعض معصیتوں کا خاصا یہ ہوتا ہے کہ اس کے کرنے والے سے توبہ اور اعمال صالحہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے اور وہ گناہوں میں منہمک ہو کر انجام کا کفر تک پہنچ جاتا ہے جو سبب ہے ضبط اعمال کا (معارف القرآن ج ۱۰ ص ۱۸۷)

اور ایک آیت میں اس کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بچارتے وقت ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے عام آدمیوں کی طرح آواز نہ دیا کریں۔

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ  
كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ

تم لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے کو ایسا نہ بنا لو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔

(سورہ النور آیت ۶۳)

اور اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا  
وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ  
عَذَابٌ أَلِيمٌ

اے ایمان والو! تم (لفظ) راعنا نہ کہا کرو، اور انظرنا نہ کہا کرو اور راعنا صلی اللہ علیہ وسلم کی بات تو ہم سے سنو اور کافروں کیلئے دردناک عذاب ہے۔  
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اگر آپ کے کسی ارشاد مبارک کو کبھی اچھی طرح نہ سمجھ پاتے تو عرض کرتے یا رسول اللہ راعنا، معنی ہماری رعایت فرمائیے گا، کیونکہ ہم پوری طرح نہیں سمجھ سکے ہیں، دوبارہ سمجھا دیجئے لیکن چونکہ یہودی زبان یعنی عبرانی میں یہی لفظ ایسے معنی رکھتا ہے جس میں گستاخی اور بے ادبی پائی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا کہ ایسے الفاظ سے احتراز کریں جس میں گستاخی کا ادنیٰ شائبہ تک ہو، اور ہر ایسے راستے کو بند کر دیا ہے جس طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت کا رشتہ کمزور ہو سکتا ہو، مثلاً آپ کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے عقد کرنے کو قرآن کریم میں ناجائز قرار دیا کہ ایسی صورت میں دل میں وہ عظمت و لحاظ اور ادب و احترام باقی نہیں رہ سکتا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ضروری ہے۔

صحابہ سے محبت | اسی طرح قرآن کریم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اوصاف اور مناقب کو نہایت حکیمانہ انداز میں اسی مقصد کے لئے پیش کیا گیا ہے کہ حضور کے ساتھ محبت و تعظیم میں اضافہ ہو۔  
کیونکہ کسی ڈاکٹر یا حکیم کی قابلیت کا اندازہ اس کے سپرد کئے ہوئے مریضوں کی حالت

سے لگایا جاتا ہے اور استاذ کا کمال اس کے شاگردوں کی خوبیوں سے پچایا جاتا ہے۔ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات اور اوصاف اور ان کی تربیت کا صحیح رنگ بھی ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ  
أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ  
تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ  
فَضْلَ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ  
فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۗ اللَّهُ  
سُورَةُ الْفَتْحِ آيَةُ ۲۸

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو ان کے صحبت یافتہ ہیں (وہ) کفار کے مقابلہ میں سخت ہیں آپس میں رحم رکھ رہے ہیں (اے مخاطب) تو ان کو دیکھو گا کبھی رکوع کرتے ہوئے کبھی سجدہ کرتے ہوئے اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے طلب گار ہیں ان کے ایمان اور عبادت کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے آشکارا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ  
أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالُهُمْ  
يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا  
وَيَنْصَرُّونَ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ أُولَٰئِكَ  
هُمُ الصِّدِّقُونَ ۚ

(یعنی مال فقی میں حق) ان حاجت مند مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں سے اور مالوں سے جدا کر دیئے گئے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کے طالب ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔

وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ  
مِنْ قَبْلِهِمْ يَجْعَلُونَ مِنْ حَاجِجٍ  
إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ  
حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَى  
أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ  
وَمَنْ يُؤْثِرْ عَلَى نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ  
هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۚ سُوْرَةُ الْحَشْرِ آيَةُ ۹

اور ان لوگوں کا حق ہے، جو دارالاسلام اور ایمان میں ان کے قبل قرار پچھڑے ہوئے ہیں جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو کچھ دیا جاتا ہے اس (انصار) اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتے اور اپنے اور پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ (خود) ان پر فاقہ ہی ہو اور جو شخص بخل سے محفوظ رکھا گیا ہے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُوفٌ رَحِيمٌ ۝۱۰

اور ان لوگوں کا (حق ہے) جو ان کے بعد آئے  
یعنی مہاجرین اور انصار کے بعد جو دعا کرتے ہیں  
کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو بخش دے اور ہمارے  
ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور  
ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ  
نہ ہونے دیجئے۔ اے ہمارے رب آپ بڑے شفیق و رحیم ہیں۔

مہاجرین و انصار صحابہ کرامؓ کے مناقب اور اوصاف بیان کرتے ہوئے حضرت  
مفتی محمد شفیعؒ آخر میں فرماتے ہیں۔

اس مقام میں حق تعالیٰ شانہ نے پوری امت محمدیہ کے تین طبقے کئے۔ مہاجرین  
و انصار اور باقی تمام امت۔ مہاجرین و انصار کے خاص اوصاف اور فضائل بھی اس جگہ  
ذکر فرماتے مگر باقی امت کے فضائل و کمالات اور اوصاف میں سے صرف ایک چیز  
یہ بتلانی کہ وہ صحابہ کرامؓ کی سبقت ایمانی اور ایمان کے ہم تک پہنچانے کا ذریعہ ہونے کو  
پہچانے اور سب کے لئے دعائے مغفرت کریں اور اپنے لئے یہ دعا کریں کہ ہمارے  
دلوں میں کسی مسلمان سے کینہ و نفرت نہ رہے اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے بعد  
آنے والے جتنے مسلمان ہیں ان کا ایمان و اسلام قبول ہونے اور نجات پانے کے لئے  
یہ شرط ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ کی عظمت و محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہوں اور ان کے  
لئے دعا کرتے ہوں جس میں یہ شرط نہیں پائی جاتی وہ مسلمان کہلانے کے قابل نہیں،  
اسی لئے حضرت مصعب بن سعدؓ نے فرمایا کہ امت کے تمام مسلمان تین درجوں میں  
ہیں جن میں سے دو درجے تو گزر چکے (یعنی مہاجرین و انصار) اب صرف ایک درجہ باقی  
رہ گیا۔ یعنی وہ جو صحابہ کرامؓ سے محبت رکھیں ان کی عظمت پہچانیں، اب اگر تمہیں امت  
میں کوئی جگہ حاصل کرنی ہے تو اسی تیسرے درجہ میں داخل ہو جاؤ۔ حضرت حسینؓ سے کسی  
نے حضرت عثمانؓ کے بارے میں سوال کیا جب کہ ان کی شہادت کا واقعہ پیش آچکا تھا  
تو انہوں نے سوال کرنے والے سے پوچھا کہ تم مہاجرین میں سے ہو؟ اس نے انکار کیا

پھر پوچھا انصار میں سے ہو؟ اس نے اس کا بھی انکار کیا تو فرمایا پس اب تم میری آیت وَالَّذِينَ جَاءُوا مِن بَعْدِهِمْ لَنَنصُرُهُمْ كَمَا نَصَرْنَاكَ اَلَمْ تَرَ اَنَّكَ كُنْتَ مَسْكُوتًا فَهِيَ تَكُنِّیْ (اگر تم عثمان غنیؓ کی شان میں شک و شبہ پیدا کرنا چاہتے ہو تو اس درجہ سے بھی نکل جاؤ گے۔

قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ صحابہ کرامؓ کی محبت ہم پر واجب ہے حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ جو شخص کسی صحابیؓ کو بُرا کہے یا اس کے متعلق برائی کا اعتقاد رکھے اس کا مسلمانوں کے مال میں کوئی حصہ نہیں۔ پھر اسی آیت سے استدلال فرمایا اور چونکہ مال فقہ میں حصہ ہر مسلمان کا ہے تو جس کا حصہ اس میں نہ رہا اس کا اسلام و ایمان ہی مشکوک ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استغفار اور دعا کرنے کا حکم دیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ان کے آپس میں جنگ و جدال کے فتنے بھی پیدا ہوں گے اس لئے کسی مسلمان کو مشاجرات صحابہ کی وجہ سے اُن میں سے کسی سے بدگمان ہونا جائز نہیں، حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ یہ اُمت اس وقت تک ہلاک نہیں ہوگی جب تک اس کے پچھلے لوگ انگلوں پر لعنت و ملامت نہ کریں گے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جب تم کسی کو دیکھو کہ کسی صحابیؓ کو بُرا کہتا ہے تو اُس سے کہو کہ جو تم میں زیادہ بُرا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت۔ یہ ظاہر ہے زیادہ بُرے صحابہؓ تو ہونے لگے تھے یہی ہو گا جو اُن کی بُرائی کر رہا ہے خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو بُرا کہنا سبب لعنت ہے۔

عوام بن حوشبؒ نے فرمایا کہ میں نے اس اُمت کے پہلے لوگوں کو اس بات پر مستقیم اور مضبوط پایا ہے کہ وہ لوگوں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ صحابہ کرامؓ کے فضائل اور محاسن بیان کیا کہ وہ لوگوں کے دلوں میں اُن کی محبت پیدا ہو اور مشاجرات اور اختلافات جو ان کے درمیان پیش آئے ہیں ان کا ذکر نہ کیا کہ جس سے اُن کی جرات بڑھے (اور وہ بے ادب ہو جائیں) (یہ سب روایات تفسیر قرطبیؒ سے لی گئی

ہیں۔ (معارف القرآن صفحہ ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱)

**صحابہ سے محبت کی وجہ** | بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پاک و مقدس جماعت امت کے عام افراد کی طرح انہیں، بلکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام امت کے درمیان محکم اور مضبوط واسطہ ہیں، ان کی حیثیت حضور کے نمائندوں کی ہے اور اسی لئے عام امت سے جدا ایک خاص امتیازی نشان رکھتے ہیں، ان کی تقدیس اور تعمیل پر ہمارے قرآن کریم، سنت نبویؐ اور دین کے تمام عقائد و احکامات کا دار و مدار ہے، وہ رسالت کے اولین مبلغ ہیں جن کے ذریعے دین حق پوری امت کو پہنچا۔

قرآن مجید میں رحمۃ للعالمین کے تلامذہ یعنی صحابہ کرام کی پاک سیرت اور بے مثال کردار کی مدح اور ستائش بہت کثرت اور تبحر کے ساتھ بیان کی گئی ہے، انہیں رضائے الہی اور جنت کی بشارتیں دی گئی ہیں اور امت کو ان کے ادب و احترام اور ان کی اقتداء کا حکم بھی دیا گیا ہے، اور ان میں سے کسی کو بُرا کہنے پر سخت وعید بھی فرمائی ہے، ان کی محبت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان سے بغض کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض قرار دیا ہے۔

**صحابہ کے بارے میں حضور کی تاکید** | حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول

اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوہم من بعدی غرضاً فمن اجتہدہم فبجتی اجتہدہم ومن البغضہم فببغضی البغضہم۔ (حدیث اردۃ الترمذی)

اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو میرے صحابہ کے معاملہ میں میرے بعد ان کو اتقید و تشیع کا انشاء نہ بنا جس شخص نے ان سے محبت کی تو میری محبت کی وجہ سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو میرے ساتھ بغض کی وجہ سے بغض رکھا۔

اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ جس نے ان کو ایذا پہنچائی اُس نے مجھے ایذا پہنچائی

اور جس نے مجھے ایذا پہنچائی اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچائی اور جو اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچانا چاہے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو عذاب میں گرفتار کر دے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا تَسْبُوا أَصْحَابِي فَلَا يَأْخُذُكُمْ  
مِثْلُ مَثَلِ أَحَدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مِثْلَ  
أَحَدِهِمْ وَلَا نَصْفَهُ۔  
میرے اصحاب کو بُرا مت کہو۔ اگر تم لوگوں میں سے کوئی احد سہار کے برابر سونا صدقہ کرے تو صحابہ میں سے کسی ایک کے ایک مد کے برابر ثواب کو نہیں پہنچ سکتا ہے نہ آدھے مد کے برابر۔

اور ترمذی کی روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ کو بُرا کہتے ہیں تو تم کو اللہ کی لعنت ہو تمہارے اس شر پر یعنی تمہاری اس شر کی بات پر،

**مقام صحابہ رضی اللہ عنہم** | صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تقدس اور عدالت اور ان کے ساتھ محبت، ان کی تعظیم و تکریم یقینی طور پر ثابت ہے جس شخص کی زندگی مجموعی طور پر اچھی اور پاکیزہ ہو اس پر کسی گناہ کبیرہ کا الزام عقل اور فطرت کی رُو سے بھی اس وقت تک درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ وہ مضبوط اور قطعی دلائل سے ثابت نہ ہو۔ اور صحابہ کرام کا مقام تو بہت ہی بلند ہے۔ ان حضرات کا تقدس اور عدالت قرآن و سنت متواترہ اور اجماع اُمت سے ثابت ہے پس تاریخ کی جھوٹی بے سند اور ضعیف روایات کی یہاں کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اسی لئے علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ جو لوگ صحابہ کرام سے بغض یا اُن میں سے بعض کے ساتھ بغض رکھے یا اُن کو بُرا بھلا کہے، ایسے لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ایسے لوگوں کا قرآن پر ایمان سے کیا واسطہ جو اُن لوگوں کو بُرا بھلا کہتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے راضی ہونے کا اعلان کیا ہے۔

صحابہ کرام پر تنقید و اعتراض کرنا دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی نزہت

پر اعتراض کرنا ہے، کیونکہ پھر تو یہ دوسو سو پیدا ہو سکتا ہے کہ (نحوہ باللہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تزکیہ صحیح اور کامل نہ تھی، ورنہ جن حضرات نے اپنی جانیں آپ کے سپرد کی تھیں اور جن کی غویہوں پر خود قرآن مجید اور حضور شاہد ہیں، ان حضرات میں روحانی بیماریاں، بددیانتی اور خود غرضی کیسے آئیں۔

الغرض صحابہ کرام کے بارے میں پوری امت کا اجماعی عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے زیادہ مقدس اور پاکیزہ ہستیاں یہی ہیں، ان کا ہر فرد اتنا بلند کردار اور نفسانیت سے اس قدر دور تھا کہ انسانیت کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، اور تمام صحابہ کرام کی تعظیم و تکریم، ان سے محبت رکھنا، ان کی مدح کرنا واجب ہے، اگر کسی سے بظاہر کوئی لغزش ہوئی بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما کر ان کے جنتی ہونے کا اعلان کر دیا ہے، اور ان کے باہمی اختلافات میں کون حق پر تھا اور کس سے کس وقت کیا غلطی سرزد ہوتی تھی، سو اس قسم کے سوالات کا واضح جواب قرآن کے الفاظ سے لیا جاتے گا۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ  
وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَنْهَا  
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَعْمَلُونَ  
یہ ایک امت تھی کہ جو گزر گئی ان کے اعمال ان کے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے اور تم سے نہ پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا عمل کیا تھا۔

لہذا ہر مسلمان کافر میں ہے کہ صحابہ کرام کی عظیم الشان جماعت کے بارے میں اپنی زبان یا قلم سے کوئی ایسا حرف نہ نکالے جس سے کسی صحابی کی شہادت یا کسر شان ہوتی ہو، اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو کوئی بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کا دروازہ کھولتا ہے وہ دین اسلام کی بنیادوں کو کھودتا ہے اور وہ کبھی اسلام کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔

اللہ حضور، صحابہ اور اسلاف سے محبت  
الغرض اللہ جل شانہ کی ذات عالی ہی اللہ محبت کی مستحق ہے  
کیونکہ محبت جن وجوہات کی بنا پر ہوا کرتی ہے وہ بدرجہ اتم ان میں جمع ہیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس لئے نہایت ضروری ہے کہ آپ کی محبت ہی اللہ تعالیٰ کی

محبت اور اس کی اطاعت کا ذریعہ ہے۔ آپ ہی اقرب الناس الی اللہ یعنی سب انسانوں سے زیادہ اللہ سے قریب ہیں۔ اس کے بعد تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم کے ساتھ محبت نہایت ضروری ہے۔

گویا یہ محبت کی ایک زنجیر ہوتی جس کی کڑیاں یعنی سلف صالحین کی محبت، صحابہ کی محبت، نبی کریم کی محبت اور اللہ کی محبت ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں جس طرح کہ علمی سلسلہ کی زنجیر ہے کہ قرآن و سنت کا علم صحابہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہؓ سے تابعین کو منتقل ہوا اور پھر ان سے ان کے تلامذہ یعنی تبع تابعین کو قرآن و سنت کے حاملین کا یہ سلسلہ الحمد للہ آج تک جاری ہے۔

سلف صالحین سے محبت رکھنا ان کے نقش قدم پر چلنا ہی ہماری کامیابی و فلاح کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ کسی شخص سے محض اللہ تعالیٰ کے لئے محبت و تعلق رکھنا اللہ پاک کی عظمت کا حق ادا کرنا ہے اور اس کا شمار بھی عبادات میں سے ہے۔ حدیث شریفہ میں آتا ہے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس بندہ نے بھی اللہ پاک کے لئے کسی دوسرے بندہ سے محبت کی اس نے اپنے رب کی عظمت و توقیر کی۔ (مسند احمد، مشکوٰۃ)

اللہ پاک سے محبت کے لئے اس کے محبوبین کی محبت ایک ناگزیر واسطے کی حیثیت رکھتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ سے محبت کا ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان سے محبت کا ذریعہ صحابہ کرام ہیں، اسی طرح صحابہ کرام سے محبت کا واسطہ سلف صالحین ہیں۔ مجنوں جو لیلیٰ کے عشق میں مست تھا، لیلیٰ کی گلی کے کتے کو محبت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ کتے سے محبت تو ہرگز مقصود نہ تھی لیکن یہ لیلیٰ کے ساتھ محبت ہی کا اثر تھا جب وہ لیلیٰ کے گھر جاتا تو وہاں کا طواف کرنے لگتا، لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہو تو کہا۔

مَنْ عَلَى الدَّيَارِ دِيَارُ كَيْلَانَ  
وَأَقْبَلَ ذَا الْجَدَارِ وَذَا الْجَدَارِ  
میں گزرتا ہوں ان شہروں پر جو لیلیٰ کے شہر  
میں تو چہرے متا ہوں اس دیوار کو اور اس دیوار کو

وَمَا حُبُّ الدِّيَارِ شَفَعَنُ قَلْبِي      اور ان شہروں کی محبت نے میرے دل  
وَلَكِنْ حُبٌّ مِّنْ مَّسْكَنِ الدِّيَارِ      میں گھر نہیں کیا ہے مگر اس کی محبت نے  
جو ان شہروں میں رہ چکی ہے

محبوب لذاتہ یعنی اصل محبوب تو صرف ایک ہی ہے لیکن محبوب سے متعلق  
اشیاء کی محبت، اس کی محبت کی علامت اور دلیل ہوتی ہے اور اس کی محبت بڑھانے  
میں ممد و معاون ہوتی ہے، اسی طرح جو شخص اللہ سے محبت کرتا ہے وہ ضرور بالضرور  
حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھے گا اور جو حضور سے محبت کرتا ہے وہ یقیناً صحابہ  
تابعین، تبع تابعین اور سلف صالحین کو علی الترتیب محبوب رکھے گا، گویا سلف صالحین  
صحابہ کرام اور انہما میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کا عشق  
اور قرب حاصل کرنے کا ایک واسطہ اور اس کی محبت کی علامت ہے۔

اللہ تک پہنچنے کا دوسرا واسطہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی کتاب ہے یعنی اللہ جل شانہ  
نے ہمیں اپنا قرب حاصل کرنے کے لئے دو واسطے مقرر فرمادیئے ہیں جن کے ذریعے ہیں  
اللہ کی پسند اور ناپسند، اوامر اور نواہی کا علم ہو جاتا ہے، کتاب جو تمام انسانیت کے لئے  
قانون اور ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور دوسرے اپنے ایسے چنے ہوئے مقبول  
بندے جن کو نبی آدم ہی میں سے منتخب فرما کر اپنی پسند اور ناپسند کا عملی نمونہ اور کتاب  
کی عملی تفسیر بنا کر بھیجا۔

تجربہ گوواہ ہے کہ کوئی کتاب کتنی ہی آسان، مفصل اور جامع کیوں نہ ہو، انسان کی  
تعلیم و تربیت کے لئے کافی نہیں ہو سکتی، انسان کی تربیت اور اصلاح کرنے والا  
انسان ہی ہو سکتا ہے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی اصلاح اور تعلیم کے لئے دو چیزوں کا سلسلہ  
جاری رکھا، ایک کتاب اللہ اور دوسرے رجال اللہ (اللہ والے لوگ) جن میں انبیاء علیہم السلام  
ان کے نائبین، علماء و مشائخ سب داخل ہیں۔

دو شدید غلطیاں | رجال اللہ (اللہ والوں) کے بارے میں لوگ دو مذموم غلطیوں کا نشانہ

رہے ہیں یعنی افراط اور تفريط۔ دین میں اکثر فتنے اور فرقے بندیاں انہی دو غلطیوں کا نتیجہ ہیں۔ کہیں تو رجال اللہ کو اتنا بڑھا چڑھا دیا کہ نوبت رجال پرستی و بندوں کی عبادت تک پہنچ گئی، اور کہیں گھٹا دیا کہ حبیبنا کتاب اللہ یعنی صرف اللہ کی کتاب ہی ہمارے لئے کافی ہے کا اعلان کرنے لگے اور حبیبنا کتاب اللہ کی غلط تفسیر میں نبی کریمؐ اصحابؓ تابعین اور سلف صالحین کو بالکل نظر انداز کرنا اپنا طریقہ بنالیا۔

اصل اور صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ رجال اللہ سے ان کے شایان شان محبت رکھتے ہو کہ نہایت ضروری ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضورؐ ایسے شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جس کو ایک جماعت سے محبت ہے لیکن وہ ان کے ساتھ نہ ہو سکا؟ آپؐ نے فرمایا جو شخص جس سے محبت رکھتا ہے اسی کے ساتھ ہے یعنی آخرت میں اسی کے ساتھ ہو گا یا کر دیا جائے گا۔ سائل کا مقصد بظاہر یہ معلوم کرنا تھا کہ ایک شخص جو اہل تقویٰ کے کسی گروہ یا کسی مرد صالح و متقی سے محبت کرتا ہو لیکن عمل اور سیرت میں ان کے درجہ کا نہ ہو بلکہ نیچے ہو، اس کا انجام کیا ہو گا، تو نبی کریمؐ کے جواب کا حاصل اسی مناسبت سے آیا ہوا کہ یہ شخص عمل میں کم ہونے کے باوجود انہیں اللہ کے محبوب لوگوں کے ساتھ کر دیا جائے گا جن کے ساتھ اس کو محض اللہ کی خاطر اور دین کے تعلق سے محبت تھی، اسی مفہوم یعنی اَلْكَرْمُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ کر آدمی کا حشر قیامت میں اسی کے ساتھ ہو گا، جس سے وہ محبت رکھتا ہو، کو بہت سے صحابہ کرامؓ سے مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

لہذا ہمیں چاہیے کہ اپنی عاقبت کو کامیاب و شاندار بنانے کے لئے اللہ والوں سے محبت کا تعلق قائم کر کے قیامت میں ان کی معیشت حاصل کر لیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد ہے۔

من احب الله والبغض لله فقد استكمل الایمان۔  
جس کسی نے اللہ تعالیٰ کے لئے کسی سے محبت کی اور اللہ تعالیٰ (جی) کے لئے کسی سے دشمنی کی اس کا ایمان کامل ہے۔

**گمراہ فرقوں کی ابتدا** | پس دین میں تفریق و اختلاف کا منبع صالحین و صحابہؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے سے کٹ جانا ہے، خواہ اس سلسلے کی کسی ایک کڑی سے ہو۔

مسلمانوں میں اٹھنے والے تمام فتنے اسلام کا نعرہ لگا کر بلند ہوتے ہیں اور دین ہی کا لبادہ اوڑھ کر نمودار ہوتے ہیں۔ مثلاً خوارج نے سب سے پہلے حکومت الہیہ کا نعرہ لگا کر صحابہؓ سے جدائی اختیار کی۔ عقیدے کی گمراہی میں خود بھی مبتلا ہوتے اور عالم اسلام میں بھی خطرناک فتنہ برپا کیا۔ اسی طرح ماضی قریب میں ترقی اسلام اور ترقی السیلم کے نام سے یورپی علوم اور تہذیب کی ترویج و ترقی کے لئے جو تحریکیں علیین ان کے نتیجے میں دینی تربیت سے عاری ہونے کی وجہ سے ایسے لوگ پیدا ہوئے جو خوارج اور معجزات کا انکار کرنے لگے۔ اسی طرح مسلمانوں کو مختلف گمراہ تحریکوں میں بہلا اور بھٹلا کر الجھا دیا اور ان کو علماء سے متنفر کرنے اور اسلاف سے کاٹ دینے کا فساد شروع کیا۔ اس قسم کی سب گمراہ کن تحریکوں کی آواز تو اسلام ہی فشی لیکن روج اور مقصد اسلام سے عاری تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ناممجھ اور ناعاقبت اندیش لوگ دلفریب نعروں اور ظاہری چمک دمک سے دھوکا کھا کر راہ راست سے دور ہو گئے اور سمجھ دار لوگ حقیقت پہچان کر ایک طرف محفوظ رہے۔ دونوں طرف سے افراد کٹ کٹ کر ایک دوسرے کے مد مقابل جمع ہونے لگے اور یوں اُمتِ مسلمہ عرصہ تفرقہ بازی اور فتنہ و فساد کا شکار ہو گئی۔

وہ حضرات جن کے سامنے گمراہ افراد اور فرقوں کی تباہی موجود ہے خوب جانتے ہیں کہ سلف صالحین سے رابطہ کٹ جانے اور اعتماد اٹھ جانے کے بعد دین کو سمجھنے اور دین کی تشریح کرنے کے لئے کوئی حدود و حصار یا اصول و قواعد باقی نہیں رہتے۔ قرآن و سنت کی ایسی بے سرو پا اور لغو تفسیریں اور مضحکہ خیز تاویلیں سامنے آتی ہیں جو دین کی دھجیاں اڑانے کے مترادف ہوتی ہیں۔ یہی گمراہی کی بنیاد ہوتی ہے۔ پھر کہیں صحابہؓ پر جھوٹے الزامات لگا کر اور کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا انکار کر کے اپنی طرف

سے دین کی تفصیلات گھڑ لی جاتی ہیں اور نئے گمراہ فرقوں کی ابتداء ہوتی ہے۔ دوا  
ماضی کے بعض نام نہاد مفکرین اور مضمون نگار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے کے  
ساتھ لگے ہوتے سلف صحابین (جو کہ انقلابِ آفرین صلاحیتوں اور کارناموں کے  
عظیم الشان نمونے قائم کر چکے ہیں) پر ایک طویل المیاد فکری قحط اور ذہنی و عملی غفلت کا  
الزام عائد کرتے ہیں اور اپنے زہریلے خیالات کو انقلابِ اسلام اور ترقی دین کے نام  
سے پیش کرتے ہیں۔ گویا جو دین چودہ سو سال تک قائم و دائم جاری و ساری رہا، اس  
کو اسلاف میں سے کوئی ٹھیک طرح سے سمجھا ہی نہ تھا۔ اب اگر یہ حضرات پہلی صحیح دین  
سمجھا رہے ہیں۔ فی الحقیقت یہ لوگ صرف اپنی خواہشاتِ نفس کا اتباع کرنے والے ہیں۔

ان حضرات کا طریقہ کار یہ ہے کہ پہلے سے ہی ایک راستے قائم کر لیتے ہیں پھر  
اس کو ثابت کرنے کے لئے قرآنِ کریم کی آیات اور احادیثِ نبوی کے عجیب و غریب  
مطالب بنا کر پیش کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ حضرات ایسی آیات اور احادیث بھی نظر انداز  
کر دیتے ہیں جن سے ان کی بے بنیاد راستے کی مزین نفی ہوتی ہے۔ تو یہ لوگ قرآن مجید کی  
اس آیت کے مصداق بن کر خود پرستی اور شرک کے مرتکب ہوتے ہیں کہ:-

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ... کیا آپ نے اس شخص کو ملاحظہ فرمایا ہے جس نے  
اپنی خواہشِ نفسانی کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔

پس یہ لوگ اپنی خواہشات کو معبود بنا لیتے ہیں اور ان کا نفس ہی ان کے لئے  
قرآن بھی ہوتا ہے اور حدیث بھی۔ اور جو شخص حلال و حرام، جائز و ناجائز کی پرواہ نہ  
کرے۔ نفس کی پیروی میں اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال دے، وہ گویا اپنے نفس  
کو اپنا خدا بنا لیتا ہے۔ ائمہ اربعہ اور تمام امت کا اس پر اتفاق ہے کہ اتباعِ نبوی  
احکامِ دین میں قطعاً حرام ہے پس جو شخص اپنی نفسانی اغراض کو سامنے رکھ کر قرآن و  
حدیث میں اس کے لئے دلائل تلاش کرتا ہے وہ یقیناً متبعِ ہونی ہے۔ اگر اُسے  
اتفاق کوئی سند مل بھی جائے لیکن بہر حال معاملہ تو علیم و خبر اللہ کے سامنے ہی ہے جو  
دلوں کے مجسداور نمیتوں سے اچھی طرح واقف ہے

# اسلاف کی فضیلت | حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک ارشاد ہے کہ:-

خَيْرُ أُمَّتِي قَرْنِي، ثَقَالُ الذِّينِ  
يَلُونَهُمْ ثَقَالُ الذِّينِ يَلُونَهُمْ  
رواہ الاربعہ

میری امت کا بہترین دور میرا ہے پھر اس کے  
بعد وہ لوگ جو ان سے ملتے ہیں پھر اس کے بعد  
ان لوگوں کا ہے جو ان سے ملتے ہیں۔

یعنی تین دور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ، صحابہ کا دور اور پھر تابعین اور تبع تابعین کا دور بہترین ہیں۔ اب اگر یہ نام نہاد فلسفی اور انشائیہ پرداز یہ راستے قائم کرتے ہیں کہ  
(نوذ باللہ) حضور کے صحابہ اور سلف صالحین دین کو ٹھیک طرح نہیں سمجھے تھے تو  
پھر ان کی تمام فکری اور علمی کاوشیں مشکوک ہو جاتی ہیں اور دین کا سارا علمی ورثہ بے فائدہ  
اور بے معنی نظر آنے لگتا ہے۔ سلف پر الزامات ایسی عیاری سے پیش کئے جاتے  
ہیں کہ بظاہر کچھ اہم اور سنگین نظر نہیں آتے۔ لیکن اس کے اثرات دل و دماغ اور طرز  
فکر و عمل پر بہت گہرے اور دور رس ہو سکتے ہیں۔ آدمی یوں سوچنے لگتا ہے کہ اگر ہمارے  
اسلاف نے ماضی میں کچھ نہیں کیا تو مستقبل کے بارے میں ان سے کس فائدے کی توقع  
کی جاسکتی ہے، ان کے کارنامے بے قیمت اور ہم تک پہنچایا ہوا دین مشتبہ ہو جاتا۔  
دین کی اصل تعلیمات شک و شبہ سے بالاتر نہیں رہتیں۔ ان نام نہاد مفکرین کی نحوست  
سے مغزوہ پوست، ظاہر و باطن کے فلسفے وجود میں آتے ہیں اور صاف و سادہ، عملی  
دین ایک ناقابل فہم معما اور گورکھ دھند بن جاتا ہے اور دشمنان دین اور گمراہ لوگ اس  
سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور تفرقہ بازی کے لئے فضا ساز کار ہو جاتی ہے۔

لیکن رحمۃ للعالمین اور ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان فتنوں کے بارے میں  
پہلے ہی سے بتا دیا ہے کہ علامات قیامت میں سے یہ بھی ہے کہ اس امت کے پچھلے  
لوگ اگلوں کو بُرا کہنے لگیں (جامع ترمذی) اور ابن ماجہ نے بروایت محمد بن المنکدر حضرت  
جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اس امت  
کے پچھلے لوگ اگلوں پر لعنت کریں (اس وقت، جس کسی نے کوئی حدیث پھپھائی اور اگلوں

کی فضیلت نہ ظاہر کی، تو اس نے گویا اس (پوری) شریعت کو چھپایا جس کو اللہ جل شانہ نے آمارا ہے۔

گزشتہ صفحات میں محبت رسول اور محبت اسلاف کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا اس کا مقصد یہ نہیں کہ کسی کی محبت کے نام پر ایسے افعال و اعمال اختیار کئے جائیں جن میں مشرک یا شرک کا شائبہ ہو۔ یا حسب رسول کے نام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی صفت الہی، علم یا قدرت وغیرہ میں اللہ جل شانہ کے برابر کر دیں، یا اسی طرح دوسری مشرکانہ حرکتیں اختیار کریں، حالانکہ ان ساری چیزوں سے اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود منع فرمایا ہے صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تطرونی كما اطرت النصارى  
ابن مریہ فانما انا عبده فقولوا  
عبد اللہ ورسولہ۔  
مجھے صبر سے زیادہ نہ بڑھاؤ جیسے نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کو حد سے بڑھا دیا کہ اللہ کا بیٹا اور جز قرار دیا میں (صرف) اللہ کا بندہ ہوں، لہذا مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔

ہمیں اس سے منع کیا گیا ہے آپ کو اللہ کا جز و مانیں یا آپ کی صفات میں استفادہ مبالغہ کریں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے برابر سمجھنے لگیں۔ البتہ آپ اللہ تعالیٰ کے بعد تمام مخلوقات سے افضل ہیں۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر  
جیسا کہ صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن میں اولاد آدم کا سردار ہوں گا۔ میں پہلا شخص ہوں گا، جس کی قبر پھٹے گی اور پہلا شخص ہوں گا جس کی شفاعت قبول ہوگی۔

اسی طرح حسب رسول کی آڑ میں بُری بدعات کو اختیار کرنا بھی عشق کے جھوٹے دعویٰ کی دلیل ہے۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچی محبت ہو اور اس کی زندگی احکام الہی سے بغاوت اور معصیت کا منور ہو۔ شریعت

کے احکام کی خلاف ورزی کے باوجود اگر ہم خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والا سمجھیں تو ہم زبردست خود فریبی اور شیطانی دھوکے میں مبتلا ہیں حضرت رابعہ بصریؒ نے ایسے ہی مدعیانِ محبت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

لَعَصَى الْاَوَّلِ وَاَنْتَ تَزْعُمُ حُبَّهٖ  
هٰذَا الْعَمْرٰى فِى الْفَعَالِ بَدِيع  
لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَا طَعْتَهُ  
اِنَّ الْمَحْبِبَّ لَمَنْ يُّحِبُّ لِيُطِيعَ  
اے محبت کے جھوٹے مدعی تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے عقل اور قیاس کے لحاظ سے یہ بات بہت ہی عجیب ہے اگر تو دعویٰ محبت میں سچا ہوتا تو اس کی فرمانبرداری کرتا کیونکہ ہر محب اپنے محبوب کی بات کو دل و جان سے قبول کرتا ہے۔

محبت کی علامات میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال کا اتباع کیا جائے آپ کے احکامات کی پوری پوری تعمیل کی جائے اور جن کاموں سے منع فرمایا ہے ان سے بچا جائے اور ہر حالت میں خواہ خوشی ہو یا غم آپ کے طریقوں کی پیروی کریں جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ  
فَاتَّبِعُوْنِىْ يُّحِبِّكُمْ اللّٰهُ  
آپؐ فرمادیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

راکل عمران آیت ۳۱

یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام میں اس چیز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ امت مسلمہ کہیں شرک میں مبتلا نہ ہو جائے اور نصاریٰ وغیرہ کی طرح کسی کو درجہ الوہیت تک پہنچا کر اپنی دنیا و آخرت کو تباہ و برباد نہ کر ڈالے اور اسی لئے ایسے حرام اور ناجائز اسباب ختم کرنا بھی بہت ضروری ہے جس سے شرک کے لئے راہیں کھلتی ہیں۔

لیکن یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ کے صحابہؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ اور صلحائے امت سے محبت پر ایمان کا دار و مدار ہے اس لئے آپؐ اور آپ کے نامہین سلف صالحین کے ساتھ سچی محبت، ان کے ادب و احترام کو شرک کہنا یا ان حضرات کے اتباع میں جائز اور مباح افعال کو شرک سمجھنا یا غیر اللہ کی

عبادت شمار کرنا، امت مسلمہ پر بہت بڑا ظلم ہے۔

محبت بڑھانے کے جاتر اسباب سے منع کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے نائبین الیٰیوں منانہذا کی محبت اور عظمت کے جذبہ کو کمزور اور ختم کرنا ہے اور امت مسلمہ میں انتشار و نفاق پیدا کر کے امت کو پارہ پارہ کرنا ہے۔

عصر حاضر کے نام نہاد توحید کے علمبرداروں کی توحید کو اگر دیکھا جائے تو ان کی توحید اسی میں منحصر ہو کر رہ گئی ہے کہ دست بوسی، توسل، سماج موتی وغیرہ کا شد و مد سے انکار کیا جائے۔ اور ان مسائل کے قائل حضرات کو بدعتی یا مشرک قرار دیا جائے حالانکہ یہ اختلافی مسائل ایسے نہیں جن کے اقرار یا انکار پر کفر و ایمان کا دار و مدار ہو بلکہ دونوں طرف دلائل موجود ہیں جن میں سے بعض کا مفصل بیان پہلے گزر چکا، اس پر طرہ یہ کہ اسلاف کے آثار اور ان کی محبت کے جذبات کے مٹانے کو بڑے خوش توحید کا بول بالا کرنا سمجھتے ہیں اور شرک کے ذرائع اور اسباب کو ختم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسری طرف یہی نام نہاد موحدین، کفار و مشرکین جیسے روس و امریکہ کے آگے جھکنا، شاہوں کی تعریف میں اللہ تعالیٰ کی صفات کو مبسول جانا، عصیت اور قوم پرستی میں آکر دوسرے مسلمانوں کی تحقیر کرنا، القرض یہ موحد نفس پرستی، دولت پرستی، شاہ پرستی، قوم پرستی اور مادی قوت کے سامنے سرفرماندی میں مشرکین اقوام سے بازی لے گئے ہیں۔

دوسری طرف سچی محبت کو بدنام کرنے والے محبت کے داعی ہیں جن کے ہاں محبت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ دست بوسی، قیام، توسل اور سماج موتی وغیرہ کا اقرار کرنا ہے اور جو یہ نہ مانے وہ گمراہ، کافر اور گستاخ ہے۔ اس پر ظلم یہ کہ محبت و تعظیم کے پردے میں قبر پرستی، پیر پرستی اور ہر قسم کی بدعات اور خرافات کے رواج دینے کو اپنے خیال میں محبت بڑھانے کے اسباب سمجھتے ہیں۔ زبانی محبت کے یہ دعویدار دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع، ان کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری سے ایسے جی چراتے ہیں کہ منافقین و کفار کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔

ہر درد مند دل کو رونا میرا زلادے  
 بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگادے  
 آخر میں محبت کی اہمیت پر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا حکیمانہ  
 مضمون ملاحظہ فرمائیے۔

”جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا تعلق ہے وہاں اس پہلو  
 پر اور زیادہ زور دینے اور اس کا زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ کی ذات  
 گرامی کے ساتھ صرف ضابطے اور قانون کا تعلق کافی نہیں، روحانی اور جذباتی تعلق  
 اور ایسی گہری اور دائمی محبت مطلوب ہے جو جان و مال، اہل و عیال کی محبت پر فوقیت  
 لے جائے۔“  
 آگے فرماتے ہیں:-

”اس سلسلہ میں ان تمام مخالف اسباب، محرکات سے محفوظ اور محتاط رہنے کی  
 ضرورت ہے جو اس محبت کے ستونوں کو خشک یا اس کو کمزور کرتے ہیں، جذبات  
 احساسات محبت میں افسردگی، سختی پر عمل کرنے کے جذبہ میں کمزوری، اور آپ کو  
 دانائے سبیل، ختم الرسل، مولائے کل سمجھنے میں تردد اور سیرت، حدیث کے مطالعے  
 سے روگردانی اور بے توجہی کا سبب بنتے ہیں۔ سورہ احزاب، سورہ حجرات، سورہ فتح  
 وغیرہ قرآنی سورتوں کے غائر مطالعہ اور تشہد و نماز جنازہ میں درود و صلوٰۃ کی شمولیت پر  
 غور و فکر، قرآن میں درود کی ترغیب اور درود کی تفصیلات میں بکثرت وارد ہونے والی  
 احادیث کا راز سمجھنے کا یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں  
 ایک مسلمان سے اس سے کچھ زیادہ مطلوب ہے جس کو صرف قانونی اور ضابطہ کا تعلق  
 کہا جاتا ہے جو محض ظاہری اطاعت سے پورا ہو جاتا ہے، بلکہ وہ پاس ادب محبت  
 اور تشکر و امتنان کا جذبہ بھی مطلوب ہے جس کے سرچشمے دل کی گہرائیوں سے چھوٹتے  
 ہوں، جو رنگ و ریشہ میں سراپت کر گیا ہو، اس پر محبت احترام اور احترام آمیز محبت کو  
 قرآن نے تعزیر و توقیر کے لفظ سے ادا کیا ہے۔“

صحابہ کے چند واقعات کی طرف رہنمائی کر کے آگے فرماتے ہیں:-

"اس عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ان علمائے راسخین، مصلحین، مجددین، زعماء قانتین کو وافر ملا۔ جنہوں نے دین کی حقیقی روح کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا اور جن کے مقدر میں دین و ملت کے احیاء و تجدید کا اہم کارنامہ انجام دینا تھا، اس پاک محبت کے بغیر جو شرعی احکام و آداب کے تابع و اسوۂ صحابہ کے اتباع و تقلید کے ساتھ ہو، اسوۂ رسول کی کامل پیروی و اتباع، جادۂ شریعت پر استواری، نفس کا دباؤ تدارک محاسبہ اور عسر و یسر اور طبیعت کی آمادگی و گرانہی رنشد و مکر، میں خدا و رسول کی قربانیاں ممکن نہیں۔ یہی رکنیۃ النوع، نفسیاتی امراض کا علاج تزکیۃ نفس اور اصلاح اخلاق کا موثر ذریعہ ہے۔ محبت کی ایک لہر جس و فاشاک کو بہا لے جاتی ہے اور رنگ و ریشہ، جسم و جان میں اس طرح دوڑ جاتی اور جذب ہو جاتی ہے۔

شاخ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم  
مسلمان جو کبھی خدا و رسول کے عشق کی بدولت شعلہ جوالہ تھے اس کے بغیر چوب  
خشک اور سرد خاک تر بنے ہوئے ہیں۔ (البلاغ صفر المنظر ۱۴۰۵ھ)

باب، هشتم

تو حیدر

# توحید

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے  
آسان نہیں مٹانا نام و نشان ہمارا

**فطرتی عقیدہ** اللہ رب العزت کی توحید انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ ہر انسان پیدا آنشی طور پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور توحید کا قائل ہوتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مالک و منتصرف نہیں۔ اس لئے تقاضائے فطرت اور جبلت سے مجبور ہو کر بے شمار بتوں اور دیوتاؤں کو مسجود و معبود ماننے والے بھی سخت مشکلات اور مصائب میں اپنے آپ کو بے سہارا پا کر دل کی گہرائیوں سے صرف ایک خدا ہی کو پکارتے ہیں۔ لیکن تکالیف اور حوادث سے نجات پا کر پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

تاریخ کے ہر دور میں مشرکین بھی کسی نہ کسی نوعیت سے توحید کی شان و عظمت کو تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اعتقاد دی اور علی طور پر متعدد خداؤں کو ماننے کے باوجود فطرتی طور پر خالق کائنات اور بڑے خدا کو ایک ہی مانتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ یہ چھوٹے خدا اس کے قائم مقام ہیں یا اس کی صفات کے نمائندے ہیں۔ یا دنیا کے کاروبار کو اوروں میں تقسیم کر کے بڑا خدا آرام کرتا ہے یا پھر چھوٹے خداؤں کو بڑے خدا کے اجزا قرار دیتے تھے۔ اس لئے وہ عبادات میں اللہ تعالیٰ و تبارک کے ساتھ مخلوق کو بھی شریک کرتے تھے جس کی وجہ سے توحید خالص سے محروم ہو کر دنیا اور آخرت کی تباہی و بربادی کا کر لگتے۔

دین اسلام نے توحید فی الذات، توحید فی الصفات، توحید فی العبادات، الغرض توحید کو ایسے مکمل، واضح اور صاف ترین انداز میں پیش کیا ہے کہ عقول انسانی کو ہر قسم کی خرافات اور اوہام کے زنگ سے محفوظ اور پاک رکھتا ہے۔ اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ شانہ کو کائنات کے ایک ایک ذرے کا علم ہے اسی طرح اس پر قدرت

بھی ہے اور کائنات کی کوئی چیز چھوٹی ہو یا بڑی، نہ اس کے علم سے باہر ہے اور نہ  
 اس کے علم، قضاء و قدر سے آزاد، اللہ جل شانہ کا علم اس کا ارادہ اس کی مشیت اس  
 کی قدرت اور اس کی تحوین آسمان و زمین کی ایک ایک چیز پر حاوی اور کائنات کے  
 ایک ایک ذرہ کو محیط ہے۔ ساری کائنات اس کے قید و بند میں ہیں اگر کہیں کبھی  
 ایک پتہ بھی ہل جاتا ہے تو وہ اس کے علم و ارادہ اور حکم کے بغیر نہ کر سکتا ہے اور نہ ہل  
 سکتا ہے۔ وہ کائنات کے چلانے میں کسی کی معاونت کا محتاج نہیں اور نہ اس کے نظام  
 و تدبیر میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ ہو سکتا ہے نہ اس نے کائنات میں تصرف  
 کا اختیار کسی کو دیا ہے اور نہ وہ کسی کو خدائی اختیارات دیتے ہیں اس لئے قرآن مجید  
 ہمیں بتاتا ہے کہ مخلوق چاہے زمینی ہو یا آسمانی، جامد ہو یا متاع الغرض جیسی بھی ہو کسی کو  
 بھی تصرف، عزت، ذلت، دیئے والا، مارنے اور چلانے والا، صحت و قوت دینے والا  
 نہ تسلیم کریں اور تمام صفات کمال سے صرف خدا سے واحد و لا شریک ہی منصف ہے  
 اس کی حکمرانی نہ صرف کائنات کے ذرے ذرے پر ہے بلکہ تمام مخلوقات اور انسانوں  
 کے دلوں، ان کے جذبات و احساسات، روح و شعور اور لطیف ترین عناصر سب اس کے  
 کامل و مکمل قبضہ قدرت میں ہیں۔ اور قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ان نسبتوں کا قطعی  
 انکار کریں جو توحید خالص کے منافی ہوں۔ نہ اللہ تعالیٰ کو کسی سے زوجیت کا رشتہ ہے  
 نہ جڑیت نہ ولدیت اور نہ ہی اخوت کا تعلق ہے۔ غرض جس طرح دین اسلام نے توحید  
 کے مسئلہ کو ہر قسم کی کمزوریوں اور نقائص سے پاک و صاف کر کے اللہ تعالیٰ کو جو ہم سے  
 وراہ الوراہ بتلا کر توحید کامل کی طرف دعوت دی ہے۔ اسی طرح اس نے توحید کے فلسفیانہ  
 عقیدے کو جو اس بحث میں حد سے بڑھ کر صفات الہی کا بھی منکر ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ  
 قادر ہے بغیر قدرت کے، خالق ہے بغیر خلق کے، بصیر ہے بغیر رؤیت کے، سمیع  
 ہے بغیر سمع وغیرہ وغیرہ کو بھی باطل ثابت کیا ہے۔ فلسفیانہ عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے  
 کہ خدا ایک ایسی ہستی ہے جس کے لئے تعطیل لازم و ضروری بن جاتا ہے۔ قرآن ہمیں  
 بتاتا ہے کہ وہ سمیع اور بصیر ہے۔ سنا ہے دیکھتا ہے۔ بلاشبہ وہ قدرت کاملہ کے

ساتھ قادر ہے اور صفات رحم و کرم کے ساتھ رحیم و کریم ہے البتہ اس کی صفات جیسے سمع و بصر کے ساتھ مخلوق کے دیکھنے اور سننے کا اور کائنات کا تعلق یا مشابہت بھی نہیں جس طرح وہ اپنی ذات میں ہوتا اور بیکتا ہے اسی طرح صفات میں بھی ہے۔  
لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ۔  
بھی ہے اور دیکھتا بھی۔

**مومن کا حال** | مومن کی نگاہ ہر حال میں ذات باری تعالیٰ پر ہوتی ہے تکلیف ہو یا راحت، اسی پر توکل کرتا ہے۔ یہ دنیا عالم اسباب ہے اور اللہ جل شانہ مسبب الاسباب ہیں انہوں نے ساری اشیاء میں اسباب و اثرات خود رکھ دیئے ہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ان اسباب پر تکیہ و اعتماد کر کے موثر حقیقی سے نگاہ ہرگز نہ ہٹائیں۔ کیونکہ ہر قسم کے حوادث اور مصائب میں کام نہانے والا وہی اللہ رب العزت ہے۔ پس ہر دکھ درد اور تکلیف میں اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے حدیث شریف میں آتا ہے۔

يَسْتَلِ أَحَدُكُمْ رِبْدَ حَاجَتِهِ حَتَّى يَشْعُرَ لَعْلَهُ إِذَا انْقَطَعَ فَانْدَلَعَتْ يَتَسَرَّعُ لِيَتَسَدَّ۔  
پاہیئے کہ تم میں سے ہر ایک اپنی حاجت خدا ہی سے مانگے یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ بھی جب وہ ٹوٹ جاتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر آسانی نہ فرمادیں تو جوتے کا تسمہ میسر نہیں آسکتا۔

اسی پر بس نہیں۔ دین اسلام میں معاملات میں بھی بنیادی طور پر اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ تمام انسانی اعمال و اقوال کا مقصد حکم الہی کی بجا آوری ہے۔ اگر ایک باپ اپنے بیٹے پر خرچ کرتا ہے یا ایک بیٹا اپنے باپ کی تعظیم و تکریم کرتا ہے تو نیت یہ ہونی چاہیئے کہ اللہ کا حکم پورا کرنے کے لئے یہ کام کیا جا رہا ہے۔ اور یہی نیت سب دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلق یا محبت اور تعظیم اور زندگی کے دوسرے معاملات میں جاری و ساری رکھنی چاہیئے۔ اگر کو ایسے اعمال سے اپنے نفس کو بھی کچھ حصہ ضرور ملے گا لیکن ذاتی حظ نفس کا حصول ہرگز مراد و مقصود نہیں ہونا چاہیئے۔

بلاشبہ ہمیں یہ حکم دیا گیا کہ اللہ کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگوں انبیاء علیہم السلام اصحاب رسول اور صلحاءِ اقدس سے محبت کیا کریں اور اللہ تعالیٰ کے سب شعائر کی تعظیم و تحکیم کریں اور ان کی ادنیٰ گستاخی اور بے ادبی سے بچیں، لیکن ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ کسی بھی مخلوق کی بندگی نہ کریں۔ اور نہ اللہ تعالیٰ و تبارک کی صفات میں کسی کو شریک کریں۔ اور نہ کسی بزرگ، عالم یہاں تک کہ پیغمبر کے ساتھ وہ رویہ اور معاملہ اختیار نہ کریں جو صرف اور صرف اللہ رب العزت کا حق ہے اور اسی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

**صحابہ کی توحید اور جذبہ جہاد** | یہی توحید دین اسلام کی اصل اور اساس ہے جس پر چارے دونوں جہانوں کی فلاح و نجات کا دارو مدار

ہے، یہی ہماری آخرت کی کامیابی کی ضامن ہے۔ اس کے بغیر انسان عذابِ جہنم سے نہیں بچ سکتا۔ اور نہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا مستحق ہو سکتا ہے۔ یہی وہ ایمان تھا جس نے صحابہؓ کے قلوب کو اللہ تعالیٰ کی محبت اور عظمت سے معمور کر رکھا تھا۔ مخلوق کا کمال و جمال دنیا کی ظاہری چمک دمک اور شان و شوکت ان کی نظروں میں ہیچ تھی۔ بادشاہوں کا جاہ و حشم اور ان کے درباروں کی زریب و زینت ان کی نگاہوں میں مٹی کے بے جان مجسموں اور ان کے رنگ و روغن سے زیادہ نہ تھے ایک صحابی کفار کے سامنے ہزار شکر کے ساتھ لڑنے کے لئے تیار ہوتا تھا اسے معلوم تھا کہ کفار کے دل محبت اور یادِ الہی سے خالی ہیں اور یہ یقین تھا کہ جس دل میں ذکرِ الہی نہ ہو وہ تو مردہ ہے۔ ان کی اولاد کفار کے مقابلے میں خون میں لت پت اتر پڑے ہوتے شہید ہوتے تو وہ غوش ہوتے اور اس پر فخر کرتے۔ اور جب کفار کے ساتھ لڑنے میں ان کی روح نکلتی تو چیخ مار کر پکارتے کہ ہم کامیاب ہو گئے۔

صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کے لئے آپس میں ایک دوسرے کی تعظیم و تحکیم اور محبت کرنے والے اپنے دوسرے بھائیوں کو اپنی ذات پر مقدم رکھنے والے، ایک بھائی کی تکلیف پر سب بے آرام ہونے والے تھے اس کے برعکس اللہ ہی کے لئے اس کے

دشمنوں کفار و مشرکین سے شدید بغض اور نفرت رکھنے والے تھے۔ ان کی تمام تر نفرت دشمنانِ دین اور اغیار کے خلاف استعمال ہوتی تھی جب کہ خود آپس میں شیر و شکر تھے۔ اللہ تعالیٰ و تبارک کی مالکیت اعلیٰ اور اقتدارِ مطلق کے تقاضے اور مطالبے نہ صرف بچے دل اور بچی زبان سے قبول کرنے والے تھے بلکہ عملی زندگی سے انہیں ثابت کرنے والے اور یقینِ کامل و صادق کا نمونہ پیش کرنے والے تھے۔

**توحید کے ثمرات** | بلاشبہ اگر کوئی توحیدِ اسلام کو بچے دل سے اپناتے اور اپنی تمام اغراض، نفع و نقصان کا مرکز صرف ایک ذات رب العالیٰ کو قرار دے اور علما بھی اپنے آپ کو صرف اللہ وحدہ لا شریک کے سپرد کر دے اور اللہ رسول کے احکام کے سوا کسی اور کے احکام پر اپنی زندگی کا دار و مدار نہ رکھے تو اس کے دل پر اخبات و خشوع، استقلال، توکل اور اخلاص کی وہ انتہائی قوت آجاتے گی اور وہ ہر مخلوق سے بے نیاز ایک نڈر مجاہد بن جائے گا۔ اور وہ کسی دجال و مکار اور غیر اللہ کے سامنے جھکنے اور اس کے سامنے ذلیل ہونے سے محفوظ رہے گا۔ اور دنیاوی مصائب و تکالیف سے اس پر گمراہٹ اور بے چینی طاری نہیں ہوگی۔ بلکہ اس سے وہ دل میں ایک سرور محسوس کرے گا۔ کیونکہ جس شخص کو اس بات پر یقین ہو کہ اس کا خالق و مالک ایک قادر مطلق ذات ہے جو انتہائی مہربان اور رحم کرنے والا ہے اور جس قسم کی خیر و رحمت بھی اس کو پہنچتی ہے محض اللہ جل شانہ کے فضل سے پہنچتی ہے۔ کوئی دوسرا نہ اس کے عطا کرنے پر قادر ہے اور نہ روک دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ اور اس کی قیمت کا ہونا اور بگڑنا سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں۔ اور وہی اسے ہر قسم کے ضرر سے بچانے والا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو غیر اللہ چاہے کوئی بھی ہو اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا اور مخلوق کیسے ہی کیوں نہ ہو اسے کوئی چین اور سکون نہیں دے سکتا ہے۔ اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی اسے راحت وطمینان دے سکتی ہے۔ اور یہ عقیدہ اس کے دل و دماغ پر چھپا کر اس کا مال بن جاتے تو وہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اسی کا محتاج رہے گا۔ اور در کی بھیجک مانگنے اور مخلوق کی عملی و فکری ہر قسم کی پرستش

سے بچ جائے گا۔ دنیا ہی میں اسے جنت کا مزہ ملے گا۔ اور وہ ساری دنیا سے بے نیاز خوف و خطر سے بالاتر زندگی گزارے گا۔ اس کا دل دنیا کی کسی قوت سے نہیں گھبراتے گا۔ یہی عقیدہ اس کو وطنیت، رنگ و نسل کی برتری، جسمانی طاقت اور دولت کے غرور، خود غرضی، نفس پرستی، تن پروری، حسد و بغض اور دیگر رذائل، خرافات و اوهام سے بالکل پاک و صاف کر دے گا۔ دنیاوی مال و متاع سے اگرچہ اس کا گھر خالی ہوگا، لیکن اس کی آنکھوں سے اطمینان و استغناء کا نور چھلکتا ہوگا۔ اور پیشانی میں قناعت اور سکون کی چمک ہوگی۔ یہ خدا کا ہوگا اور خدا اس کا ہوگا۔

افسوس کہ آج اغیار تو رہنے دیں، اپنے بھی اس توحید مطلوب سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک طرف تو بعض اہل توحید ہوتے ہوئے ادب و احترام کی حدود سے تجاوز کر کے مخلوق کی عبادت اور ان کو سجدہ رکوع کرنے لگے ہیں۔ دوسری طرف توحید کے دعوے دار اسلاف کی عظمت و شان گھٹانے اور ان کی بے ادبی اور گستاخی اور ان پر سے اعتماد ختم کرنے ہی کو توحید سمجھ کر امت میں نفاق اور افتراق کے تخم بو رہے ہیں۔

کاش ہر دو فریق افراط و تفریط سے ہٹ کر صحابہ کرامؓ اور اپنے اسلاف کی طرح ایک اللہ پر ہر حال میں دل کی نگاہ جمائے، قولی محبت اور قولی توحید کی بجائے محبت میں رنگی ہوئی عملی توحید کو اپناتے تو پھر دیکھتے کہ وہ کون سی طاقت ہے جو کسی ایک مسلمان کو بھی ترہیجی نگاہ سے دیکھے۔

ہیں جانا چاہیے کہ ہمارے اسلاف کی عظیم فتوحات اور کامیابیاں صرف توحید اور دین اسلام کو پوری طرح اپنانے میں مضمر تھیں۔ وہ ہماری طرح صرف محبت یا توحید کے نام پر شیریں اور دلچسپ تقریروں پر اکتفا کرنے والے نہیں تھے، اللہ نہ کرے

لہ قولی توحید اور قولی محبت سے غرض یہاں توحید اور محبت کا صرف زبانی جمع فروچ مراد ہے جو کہ صرف بلند دعوؤں کی حد سے متجاوز نہ ہو۔

کہ ہم کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی یفتح القول وتحبس العمل  
ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں تقریری اور باتیں تو کھل جائیں گی اور عمل بند ہو جائے  
گا، کہ مصداق بن جائیں،

اللَّهُمَّ ارِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهُ وَارِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا  
اجْتِنَابَهُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ  
وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى خَاتَمِ النَّبِيِّينَ  
وَعَلَى آلِهِ وَاصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ

مختار الدین  
کرپورہ شریف

شعبان ۱۴۰۶ھ  
۲۳ اپریل ۱۹۸۶ء  
پندرہ بوقت گیارہ بجے